پاکستان میں جمہوریت کے تضادات

www.kitabosunnat.com

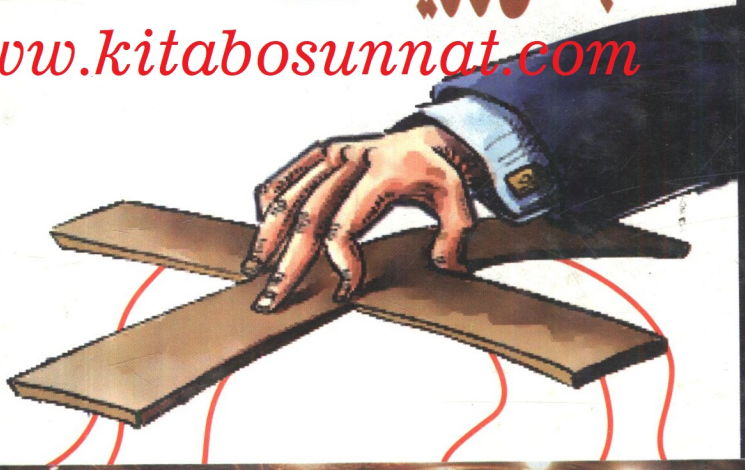

سلمان عابد

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں جمہوریت کے تضادات

سلمان عابد

www.KitaboSunnat.com

جُمہوری پبلیکیشنز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Independent & Progressive Books

JUMHOORI

● نام کتاب : پاکستان میں جمہوریت کے تضادات

● مصنف : سلمان عابد ● اشاعت : فروری 201[illegible]ء

● سرورق : مصباح سرفراز ● ناشر : جمہوری پبلیکیشنز لاہور

● جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

ISBN:978-969-9739-44-6

قیمت 490 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرون پاکستان

اہتمام : فرخ سہیل گوئندی

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی کسی بھی شکل میں دوبارہ اشاعت کی صورت میں پبلشر سے باقاعدہ قانونی معاہدے کے تحت جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

Jumhoori Publications facebook Fan Page

JUMHOORI PUBLICATIONS

2-Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan.
Tel: 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail: jumhoori@yahoo.com
www.jumhooripublications.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتساب

پیارے اور شفیق والد عبدالکریم عابد (مرحوم)

اور والدہ محترمہ ذکیہ عابد (مرحومہ)

کے نام جن کی شفقت، تربیت اور مدد سے میں نے بولنا،

پڑھنا اور لکھنا سیکھا اور ان کی دعائیں

آج بھی میرے ساتھ ہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

ابتدائیہ	سلمان عابد	7
جمہوریت کیسے قائم ہوسکتی ہے	فرخ سہیل گوئندی	11
دیباچہ	ڈاکٹر حسن عسکری رضوی	13
پاکستان کی ریاست کا بحران		17
فوجی حکمرانوں اور مارشل لاء کی تاریخ		25
فوج کی حکمرانی اور تضادات پر مبنی فکری مغالطہ		42
پاکستان اور جمہوریت کا فقدان		52
پاکستانی معاشرہ اور قیادت کا بحران		64
چھوٹے صوبوں کا احساسِ محرومی اور صوبائی خودمختاری کا معاملہ		71
فیصلہ سازی کے عمل میں لوگوں کی شمولیت کا فقدان		77
پاکستان میں سیاسی جماعتیں اور ان کے داخلی تضادات		83
عوام کا مزاج اور جمہوری نظام کی ناکامی		94
محاذ آرائی کی سیاست میں جمہوریت کا سفر		99
پاکستان میں انتخابات کی تاریخ کا مختصر جائزہ		104
مقامی طرزِ حکومت اور ہمارا جمہوری رویہ		111
پاکستان میں طلبہ سیاست... سیاسی ذہن کی تشکیل کیوں ضروری ہے؟		119
آزاد الیکشن کمیشن اور شفاف انتخابات کا بحران		133
پاکستان میں محروم طبقے کی سیاست اور اس کی ناکامی		139
دانشورانہ اور فکری کرپشن کا بخار		145

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول سوسائٹی کا بحران 151
مذہبی سیاست کی ناکامی 156
مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا بحران 162
عدلیہ کے نظریہ ضرورت کی کہانی 172
بھٹو صاحب کا عدالتی قتل 180
پاکستان کی سیاست اور خواتین کی تاریخ 189
پاکستانی سیاست میں اخلاقیات کا بحران اور قومی ذمہ داری 198
پاکستان کا سیاسی نظام جرائم پیشہ اور مافیا کے کنٹرول میں 206

ضمیمہ جات

- حکومتیں اور اسمبلیاں توڑنے کے اعلانات 213
- اسکندر مرزا کا اعلانِ مارشل لاء 215
- 5 جولائی کو ضیاالحق کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے خطاب 220
- غلام اسحاق خان کا قوم سے خطاب، 6 اگست 1990ء 226
- قومی اسمبلی کا خاتمہ، صدر غلام اسحاق خان کا خطاب، 19 اپریل 1993ء 241
- نواز شریف کا قوم سے خطاب، 18 جولائی 1993ء 248
- غلام اسحاق خان کا قوم سے خطاب، 18 جولائی 1993ء 260
- صدر فاروق لغاری کا اعلامیہ، 4 نومبر 1996ء 263
- فہرست گورنر جنرل، صدور مملکت، وزرائے اعظم پاکستان 267
- حوالہ جات 279
- اشاریہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابتدائیہ

جمہوریت کا مقدمہ

پاکستان کا جمہوری نظام سیاسی، آئینی اور سماجی تضادات کا آئینہ دار ہے۔ ان ہی تضادات کی وجہ سے اس ملک میں جمہوری نظام پنپ نہیں سکا۔ ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ فوجی حکمرانی اور مداخلتوں کے باعث یہ ملک جمہوری تقاضوں کے مطابق نہیں چل سکا۔ اس میں دو آراء نہیں ہوسکتیں کہ فوج کی سیاسی عمل میں شمولیت اور مداخلت کے باعث جمہوریت کا تسلسل قائم نہ رہ سکا۔ جہاں 35 برس سے زیادہ براہ راست فوجی حکومت رہی ہو اور جمہوری حکومتوں میں بھی فوجی بالادستی موجود ہو، وہاں جمہوریت یقیناً ایک بڑا سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔

فوجی مداخلتوں کو تقویت دینے میں ہماری عدلیہ کے ماضی کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فوج اور عدلیہ کے باہمی گٹھ جوڑ کی وجہ سے سیاسی محاذ کے ساتھ ساتھ قانونی محاذ پر بھی جمہوری قوتوں کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن کیا جمہوریت کی ناکامی محض فوجی مداخلتوں ہی کے باعث ہوئی ہے یا اس میں ہماری سیاسی و سماجی اشرافیہ کی دیگر اداروں نے بھی شامل ہیں؟ کیا ہم اپنی اندرونی کمزوری کو قبول کرنے کی بجائے سارا ملبہ دوسرے اداروں پر ڈال کر بری الزمہ ہونے کی کوشش کررہے ہیں؟ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ فوج کے کردار کے باعث جمہوریت کا سفر کئی طرح کی مشکلات کا شکار رہا۔ لیکن جمہوریت کو کامیاب اور مستحکم بنانے میں سیاسی جماعتوں، قیادتوں اور کارکنوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ وہ غیر جمہوری قوتوں کے مقابلے میں ایک مضبوط اور فعال کردار ادا کرکے ایک بڑے سیاسی دباؤ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوتیں لوگوں کو سیاسی جدوجہد کا حصہ بنا کر جمہوریت کو مستحکم کرتی ہیں۔

لیکن اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایک طرف فوجی مداخلتوں کی لمبی فہرست ہے تو دوسری طرف ہم سیاسی قوتوں کی جانب سے بھی غیر جمہوری رویوں اور آمرانہ طرز عمل پر مبنی اقدامات کی طویل فہرست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھتے ہیں۔اس ملک میں جب بھی فوج نے سیاسی نظام پر اپنی بالادستی قائم کی تو مفاہمت اور تعاون کے دروازے بھی سیاسی قوتوں ہی نے وا کیے۔ملک میں بیشتر سیاسی جماعتوں کی کہانی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ تعلقات پر مشتمل ہے اور ہر سیاسی جماعت نے کسی نہ کسی دور میں ان غیر جمہوری قوتوں کے ساتھ مل کر جمہوریت اور قانون کی بالادستی کمزور کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ سیاسی قوتیں غلطیوں سے سبق سیکھ کر آگے کی طرف بڑھتی ہیں،لیکن ہمارا سفر آگے بڑھنے کی بجائے مسلسل گمراہی کا شکار ہے۔

عوام اور جمہوری قوتوں کے درمیان نہ صرف واضح خلا پایا جاتا ہے بلکہ ان میں اعتماد کا فقدان ہمارے سیاسی المیہ کا نمایاں ترین پہلو ہے۔ سیاسی قیادتیں جمہوریت کے حوالے سے دعوے تو کرتی ہیں لیکن ان کی اپنی جماعتوں میں جمہوری قدروں کے فقدان کے حوالے سے کئی طرح کے سنجیدہ سوالات موجود ہیں۔یہ طرز عمل جمہوریت کو مضبوط بنانے کی بجائے فرد واحد کی حکمرانی کو تقویت دیتا ہے۔تمام دنیا میں سیاسی جماعتوں اور قیادتوں کے پاس کوئی آئیڈیل صورتحال نہیں ہوتی بلکہ ان کے اردگرد مسائل کا ایک بڑا انبار ہوتا ہے اور غیر جمہوری قوتیں ان جمہوری قوتوں کو ناکام بنانے کی کوششیں بھی کرتی رہتی ہیں۔لیکن سیاسی جماعتوں اور قیادتوں کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کارکنوں کے ساتھ مل کر، سیاسی جدوجہد کو بنیاد بنا کر، جمہوریت کو مستحکم بنانے کے نئے راستے تلاش کرتی ہیں۔لیکن اس کے برعکس ہماری جمہوری سیاست کا المیہ یہ ہے کہ اس میں اور غیر جمہوری سیاست میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی اور لوگ آمریت سے جمہوریت کے سفر میں بھی مایوس اور نالاں نظر آتے ہیں۔دراصل جمہوریت اور غیر جمہوری نظاموں میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت میں نظام اور اداروں کی بالادستی یا حکمرانی ہوتی ہے،جبکہ آمریت میں ادارے اور سسٹم فرد واحد کے زیر اثر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب جمہوری نظام میں ادارے منظم اور فعال و مستحکم نہیں ہوتے تو لوگوں کو جمہوریت کی افادیت سے محرومی کا احساس ہوتا ہے۔اس لیے پاکستان کے تناظر میں اداروں کے کردار اور اس کے طریقہ کار میں تبدیلی کے بغیر جمہوریت اور آمریت کے درمیان موازنہ اور جمہوری نظام کی مضبوطی کا نعرہ بے معنی ہوگا۔

دراصل ہمارے ملک میں عملاً صورتحال یہ ہے کہ عام لوگوں بالخصوص محروم طبقات کو جمہوری نظام میں برائے نام شامل کر کے ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی راستے کمزور کیے جا رہے ہیں۔ہمیں فوج کی حکمرانی اور مداخلت کے خلاف یقیناً ایک منظم جدوجہد کی ضرورت ہے لیکن ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ جمہوری قوتیں خود کو ایک مثبت سیاسی مثال کے طور پر پیش کر کے ملک میں جمہوریت کے مقدمے کو مضبوط بنائیں۔ وگرنہ اگر صورتحال اسی انداز میں جاری رہی تو جمہوری عمل جو پہلے ہی کافی کمزور ہے مزید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمزور ہو کر لوگوں میں اپنی اہمیت کھو بیٹھے گا، کیونکہ جمہوریت کی کامیابی براہ راست لوگوں کی ترقی اور خوشحالی کے ساتھ منسلک ہوتی ہے اور یہ عمل پاکستان کی جمہوریت کے تناظر میں سب سے اہم اور بڑا سوال ہے جس میں ہماری جمہوریت کئی حوالوں سے ناکامیوں سے دوچار ہے۔

ہمارے جیسے کمزور ملکوں اور ان کی خراب معاشی صورتحال کے باعث لوگوں کی جمہوری قوتوں کے ساتھ تعلق میں جو کمزوری سامنے آئی ہے اس پر جمہوری قوتوں اور اہل دانش کو سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ابھی تک اس ملک میں ایک مضبوط سیاسی نظام کی بنیاد ہی نہیں رکھ سکے ہیں اور جمہوری قوتوں کے پاس کوئی ایسا واضح منشور کیوں نہیں جو لوگوں کو قائل کر سکے کہ ہمیں ان پر ماضی کے مقابلے میں زیادہ اعتماد کرنا چاہئے؟ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جب ہم فوج کے ساتھ ساتھ جمہوری قوتوں پر تنقید کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم جمہوری نظام کے خلاف ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جب بھی جمہوری قوتوں اور جمہوریت کے دعوے داروں پر تنقید کی جاتی ہے تو فوراً یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس طرز کے لوگ جمہوریت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ملک کا مستقبل صرف جمہوریت سے وابستہ ہے۔

اہل دانش میں یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ ہم یہاں کس طرز کی جمہوریت کو تقویت دینا چاہتے ہیں؟ دنیا بھر میں جمہوریت کے استحکام کے تناظر میں جو سوالات علمی بنیادوں پر اٹھائے جاتے ہیں ان پر تو بحث و مباحثہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہماری جمہوری قوتیں اپنی جماعتوں میں جمہوری عمل کو کیوں مضبوط نہیں کر سکیں؟ کیونکہ جب ہمیں جمہوریت اور جمہوری نظام ہی سے توقعات وابستہ ہیں تو سوالات بھی ان ہی قوتوں سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری جمہوری قوتیں مقامی سطح پر جمہوری نظام کو مضبوط بنانے میں کیوں ناکام رہی ہیں؟ اور ان کے پاس ابھی سیاسی ماڈل ہیں وہ سب کے سب اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کی بجائے مرکزیت پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ موجودہ جمہوری عمل میں کمزور طبقات مزدور، کسان، عورتیں، اقلیتیں سمیت دیگر طبقات کی حالت میں بہتری آنے کی بجائے تسلسل کے ساتھ بدحالی کے قصے عام ہیں۔ سول سوسائٹی مضبوط ہونے کی بجائے کمزور کیوں ہوئی ہے؟ طلبہ و مزدور سیاست اور دیگر ایسوسی ایشنوں کی سیاست کہاں گئی؟ لوگوں سے ان کے جمہوری حقوق چھین کر ان کے ذہنوں کو غیر سیاسی بنانے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہیں؟

زیر نظر کتاب ''جمہوریت کا مقدمہ'' میں مندرجہ بالا سوالات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کی مضبوطی کے حوالے سے کیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیلنجز ہیں۔ جمہوریت کی کامیابی کے تناظر میں اس کے داخلی اور خارجی بحران کیا ہیں اور اگر ہم جمہوریت کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں تمام فریقوں کا کیا کردار بنتا ہے۔

جمہوریت کے تناظر میں جو بڑے بڑے چیلنجز موجود ہیں ان میں فوج کی سیاسی نظام پر بالادستی، سیاسی جماعتوں کا کمزور ہونا، سیاسی قیادتوں کے آمرانہ طرز عمل، بری طرز حکمرانی، ووٹ کی بنیاد پر سیاسی نظام کی تشکیل، مضبوط بیوروکریسی، ریاست کے بحران، قانون کی حکمرانی کے تصورات، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، احتساب کے فقدان، مسائل کی بنیاد پر سیاست کی مضبوطی، عام لوگوں کی سیاسی عمل اور فیصلہ سازی میں اہمیت، سیاست میں بڑھتی ہوئی دولت اور کاروبار کی شکلیں، نظریاتی اور اصولی سیاست کے مسائل، طاقت کے حصول کی جنگ، الزام تراشیوں کی سیاست، ووٹر کے سیاسی ذہن کی تشکیل، صاف اور منصفانہ انتخابی نظام، بیرونی مداخلتیں اور اہم سیاسی فیصلوں میں ان کی بڑھتی ہوئی شمولیت، سیاسی جماعتوں میں خود احتسابی کے نظام، ریاست اور لوگوں کے درمیان باہمی تعلق کی کمزوری، سیاست میں اسلحہ اور تشدد کا اضافہ، سیاسی جماعتوں کے اپنے اندر جمہوریت کے فقدان اور موروثی سیاست جیسے مسائل سرفہرست ہیں۔ اب یہ مسائل کسی ایک فرد، گروہ یا ادارہ کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ ہم سب ہی اس خراب صورتحال کے ذمہ دار ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو تسلیم نہ کرنے کی روش سے باہر نکلیں اور تسلیم کریں کہ جو صورتحال کے مخدوش ہونے میں، کم یا زیادہ، ہمارا بھی حصہ ہے۔ جب تک فریقین میں اپنی غلطیوں کا احساس نہیں ہوگا، وہ جمہوریت کی جنگ بھی نہیں جیت سکیں گے اور غیر جمہوری قوتوں کے خلاف واضح سیاسی حکمت عملی بھی نہیں بن سکے گی۔ ہمیں جمہوریت کے استحکام کے لیے موجودہ نظام کی تطہیر اور تنظیم کرتے ہوئے ایک بڑا سیاسی و سماجی چارٹر ترتیب دینا ہوگا جس میں فریقین کا کردار بھی واضح ہو اور لوگوں میں اس کی قبولیت بھی ہو۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ موضوعات کو دیانت داری کے ساتھ احاطہ کرتے ہوئے سوال کے تناظر میں کچھ اہم خیالات اور نکات کو سامنے لایا جائے۔ کتاب کی تیاری میں بہت سے اہم کتابوں اور دانشوروں کے خیالات سے بھی مدد لی گئی ہے کہ وہ صورتحال کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں اور ان کے حوالہ جات بھی آپ کی معلومات میں اضافہ کا سبب بنیں گے۔ ضروری نہیں کہ کتاب میں جو تجزیہ کیا ہو وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو اور یقیناً ان سوالات پر مختلف نقطہ نظر ہو سکتا ہے۔ اس طرز کی بحث ایک مکالمہ کی صورت میں آگے بڑھنی چاہیے۔ فیصلے اگر اتفاق رائے سے ہوں اور تمام لوگوں کو اس میں شامل کیا جائے تو ہم بہتری کی طرف آگے بڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہوگا جب ہم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خواہشات اور تضادات کی سیاست سے باہر نکل کر زمینی حقائق کو سمجھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کہ جمہوریت کی کامیابی کسی سیاسی تنہائی میں نہیں ہوگی بلکہ اس میں تمام فریقوں کو مل کر ہی سیاسی جدوجہد کی طرف بڑھنا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں جمہوریت کو مضبوط بنانے کی بحث کا حصہ بنے گی اور مزید لوگ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے نئے خیالات کو سامنے لائیں گے اور ملک میں حقیقی جمہوریت کو مستحکم بنانے میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔

میں اپنے دانشور دوست اور پبلیشر فرخ سہیل گوئندی، سینئر صحافی تاثیر مصطفیٰ، سجاد کریم، ماجد نظامی، محمد تنویر اور عابد علی کا مشکور ہوں جنھوں نے کتاب کی تیاری میں میری بھرپور معاونت کی۔

سلمان عابد

181-14-B1

ٹاؤن شپ، لاہور

s.salmanabidpk@gmail.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت کیسے قائم ہو سکتی ہے

سلمان عابد تحریر و تحقیق کے ذریعے تسلسل کے ساتھ پاکستان کے ایک اہم موضوعات ، جمہوریت، گورننس اور سیاسی اداروں کے حوالے سے لکھ کر سیاسی ادب میں شان دار شرکت کر رہے ہیں اس سلسلے میں ان کی کتابیں ''پاکستان کا نیا سیاسی نظام'' اور ''مقامی حکومتوں کا نظام اور بلدیاتی ادار ۔ ''اب اس حوالے سے مستند تحقیق کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ سلمان عابد اپنے ان خصوصی موضوعات پر یہ متعصبانہ گہرائی تک مطالعے کے بعد قلم اٹھاتے ہیں، یہی وجہ کہ ان کی تحریریں پاکستان کے سیاسی حلقوں میں بڑی مستند تحقیق کے طور پر اپنی ساکھ بناتی جا رہی ہیں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جس کا پاکستان کی سیاست اور جمہوریت سے گہرا تعلق ہے۔ وہ اپنی ان تحریروں میں جمہوریت، سیاست اور بلدیاتی نظام میں موجو خامیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ متبادل تجاویز بھی دیتے ہیں کہ اگر ان تجاویز کو متعلقہ ادارے پالیسی کے طور پر اپنائیں تو ہمارے جمہوری اور بلدیاتی نظام کو اپنے تقاضوں کے مطابق استوا کرنے میں مدد حاصل ہو سکتی ہے۔

سلمان عابد کی زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے اسی بحث کے مختلف پہلوؤں کا چنا ہے اور جمہوریت اور سیاست کے ان تضادات کو بھی بحث میں شامل کیا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کیوں کر اپنی جڑیں نہیں پکڑ سکی۔ ان کا انداز بڑا Rational ہے، وہ جمہوریت کے قیام میں ایک طرف ان رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہیں جو بار بار جمہوریت کو ملیامیٹ کرتی ہیں تو دوسری طرف ان خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سیاسی جماعتیں کس طرح اپنے آپ کو منظم انداز میں جمہوری بنیادوں پر کھڑا کرنے میں شعوری طور پر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ جمہوریت کی ترقی، سیاسی جماعتوں کی ترقی سے ممکن ہے جب کہ پاکستان کی بڑی اور چھوٹی تمام سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتیں اپنے آپ کی حقیقی ادارہ سازی (Institutionalize) نہیں کر پائی ہیں اور یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا ہے کہ اس طرح سیاست میں خاندانی موروثی، غیر جمہوری جماعتوں کے اندر لیڈروں کی آمریت، جاگیردارانہ ثقافت مضبوط ہوتی ہے۔ اس لیے ایک تو جمہوریت مضبوط نہیں ہو پاتی اور دوسری طرف وہ ریاست کے ان اداروں کا سیاسی کردار پیدا ہو گیا جن کا ایک آئینی جمہوریت میں کوئی سیاسی کردار ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح پاکستان میں جمہوریت کے جڑیں نہ پکڑنے کی وجہ خود سیاسی جماعتیں بھی ہیں اور وہ اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہتی ہیں کہ اس طرح خاندانی اور موروثی سیاست کے ذریعے اقتدار پر خاندانی اور موروثی حق قائم رہ سکے۔ یہ وہ تضادات ہیں جو پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے اہم ہیں۔ پاکستان میں ایک حقیقی جمہوریت اس وقت قائم ہوگی جب سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو جمہوری بنیادوں پر ایک متبادل گورننس کے قابل بنائیں گی جب کہ ہمارے ہاں سیاسی جماعتوں کے اکثر قائدین فوج کے سیاست میں کردار کے مخالف تو نظر آتے ہیں اور ان کا رویہ ملامتی سیاست کا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ اپنی جماعتوں کو اس قدر جمہوری کروایا جائے کہ آمرانہ کردار ادا کرنے والے اداروں کی سیاسی طاقت، ایسی Democratization کے سامنے تحلیل ہونا شروع ہو جائے اور اس کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں، جن کا Democratize ہونا لازمی ہے، مضبوط اداروں کی بنیاد پر سامنے آجائیں۔ ہماری تمام سیاسی جماعتیں اپنی اپنی ہیئت میں سیاسی گروہ ہیں، ادارے نہیں۔ یہ ایسے گمبھیر تضادات ہیں جن کو اس کتاب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ بحث ایک دن عملی صورت اختیار کر جائے گی اور ایسی کتابیں پاکستان کی سٹیٹ اور سوسائٹی کو حقیقی جمہوریت میں بدل دیں گی۔

فرخ سہیل گوئندی

14 جنوری 2013ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں جمہوریت کے تضادات

پاکستان میں جمہوری نظام کے قیام کی خواہش کافی مستحکم نظر آتی ہے لیکن سیاسی اور معاشرتی عمل میں اتنے تضادات موجود ہیں کہ جمہوریت میں ابھی تک تسلسل پیدا نہ ہو سکا اور نہ پائیداری۔

اگرچہ 2008ء کے انتخابات کے بعد پاکستان میں وفاق اور صوبوں میں منتخب اسمبلیاں اور حکومتیں قائم ہوئیں اور کچھ مثبت سیاسی رجحانات نمودار ہوئے لیکن اس پیش رفت کے باوجود یہ کہنا ممکن نہیں کہ پاکستان میں جمہوری عمل اور منتخب ادارے پائیدار ہو گئے ہیں۔

جمہوریت کی خواہش اور کوشش کے باوجود جمہوریت کا پروان نہ چڑھنا جمہوری عمل کے نازک اور مشکل ہونے کا ثبوت ہے۔ جب تک جمہوریت اور سیاسی و معاشرتی حقیقتوں میں موجود تضادات کو سمجھا نہ جائے اُس وقت تک نہ صرف پاکستان کی سیاست کو سمجھنا مشکل ہوگا بلکہ ہم وہ اقدامات نہ کر سکیں گے جن سے پاکستان کی معاشرت اور سیاست پر جمہوری نظریہ اور عمل کی چھاپ گہری ہو۔

سلمان عابد نے اپنی کتاب ''پاکستان میں جمہوریت کے تضادات'' میں ایک عام فہم مگر منفرد انداز میں اُن مشکلات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف پاکستان کی سیاسی تاریخ اور حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے کی بات کی ہے بلکہ ان عناصر اور رجحانات کا جائزہ لیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں جمہوریت گہری جڑیں نہ پکڑ سکی۔

انہوں نے اپنے تجزیے کو جامع کرنے کے لیے بہت سے ایسے مصنفین اور سیاست دانوں کی تحریروں کا سہارا لیا ہے جنہوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں پاکستان کی سیاست اور معاشرت کے تضادات کا تجزیہ کرتے ہوئے اُن امور کی نشان دہی کی جس کی وجہ سے جمہوری ادارے بنتے اور ٹوٹتے رہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلمان عابد نے تجزیاتی انداز اپناتے ہوئے پاکستان کی سیاست کا تجزیہ پیش کیا ہے جس کی بنیاد تاریخی حقائق اور اداروں، سیاسی تنظیمات اور شخصیات کے رویے ہیں۔

جمہوری عمل میں پیدا ہونے والے تضادات کا تفصیلی جائزہ اس کتاب میں موجود ہے۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں: سیاسی عمل میں تسلسل کا نہ ہونا، فوجی حکومتوں کا قیام جنہوں نے سیاسی عمل میں رکاوٹ جوڑ کر کے فوجی حاکم کے اقتدار کو طول دیا اور اپنی پسند کی سیاست چلانے کے لیے ایسا سیاسی نظام بنایا جس میں جمہوریت کم اور نظم وضبط اور ذاتی مفادات زیادہ۔ اس کے علاوہ سیاسی قیادت کے فقدان اور سیاسی جماعتوں کی کمزوریوں کی وجہ سے ایک مستحکم سیاسی عمل قائم نہ ہو سکا۔ دیگر وجوہات میں قائدین کا غیر دانشمندانہ سیاسی انداز، شخصیت پسندی، عدم رواداری اور تشدد کا استعمال قابل ذکر ہیں۔

پاکستان میں جمہوریت کا ایک بڑا تضاد یہ ہے کہ عام زندگی کے رویوں میں غیر جمہوری رجحانات کافی نمایاں ہیں۔ فوڈل ازم، اقتصادی ناہمواریاں اور مذہبی قدامت پسندی کا جمہوری قدروں سے تصادم ہے۔ لہٰذا اکثر افراد، جماعتوں اور تنظیموں کی عادت ہے کہ اگر جمہوری عمل سے ان کی مرضی کے مطابق نتائج برآمد نہ ہوں تو وہ جمہوریت کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں یا پھر اپنی تاریخی اور قبائلی روایات اور مذہبی قدروں کی بنیاد پر رد کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جمہوری نظام کی 'جائزیت'' کا سوال بھی اٹھا دیتے ہیں۔ اگر اس طرح کے اعتراضات بار بار اٹھائے جائیں تو جمہوریت پروان نہیں چڑھتی۔

جمہوریت کی بنیادی شرائط یہ ہیں: لبرل ریاستی اور سیاسی دستور، قانون کی یکساں عمل داری، بنیادی انسانی حقوق اور باقاعدہ انتخاب عمل جو بیشتر سیاسی عناصر کو قبول ہو۔

تمام شہریوں کے لیے یکساں شہریت بھی اہم شرط ہے۔ اگر ریاست کسی مذہبی نظام کو زبردستی رائج کرنا شروع کر دے تو جمہوریت کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

ان مشکلات کے باوجود مصنف کو پاکستان میں جمہوریت اور سیاسی عمل کی ضرورت پر مکمل یقین ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا: ''ہمیں حالات سے مایوس ہونے کی بجائے جدوجہد اور سیاسی عمل پر زیادہ پختہ یقین کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان جمہوریت کی بنیاد پر آگے بڑھ سکتا ہے اور اسی کو ہمیں اپنی بنیاد بنانا ہوگا۔'' (صفحہ 51)

ڈاکٹر حسن عسکری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کی ریاست کا بحران

پاکستان کو درپیش بحرانوں کی صحیح تشخیص کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان معاملات کو سمجھا جائے جن کی وجہ سے یہ بحران پیدا ہوئے اور پھر بڑھے۔ اس کے لیے ریاست کے پچھلے 63 برسوں کا مجموعی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم حکومت اور حکومتی بالا دست طبقوں کی ناکامی کا تجزیہ تو بڑے زور دار انداز میں کرتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ لوگ، حکومت اور ریاست کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ دونوں ادارے ایک ہی ہیں حالاں کہ ریاست اور اس کے ادارے ایک مستقل چیز ہیں، جب کہ حکومت ایک خاص مینڈیٹ کے تحت ایک خاص وقت کے لیے برسر اقتدار آتی ہے۔ جب معاشروں میں ریاست کا بنیادی فلسفہ اور طریقہ کار شفافیت پر مبنی ہوگا تو اس کا اثر حکومتوں پر بھی ہوتا ہے لیکن یہاں سب کچھ بگاڑ کا شکار ہے۔ اس میں ریاست بھی ایک مرکزی کردار کے طور پر موجود ہے۔

پاکستان کے بارے میں یہ تصور عام ہوتا جارہا ہے کہ ہم ایک ناکام ریاست ہیں۔ مثلاً 2006ء میں امریکہ میں خارجہ پالیسی کے جریدے ''فارن پالیسی'' اور تنظیم ''فنڈ فار پیس'' نے دنیا کی ناکام ریاستوں کی دوسری فہرست جاری کرتے ہوئے پاکستان کو دنیا کی نویں ناکام ترین ریاست کا درجہ دیا تھا جب کہ اس فہرست میں اوّل نمبر پر سوڈان تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ 2005ء میں اسی ادارے کی رپورٹ میں ہم 34ویں نمبر پر تھے اور اب ہمارا نمبر نو ہو گیا ہے۔ اس ادارے نے اپنے تجزیے میں 146 ممالک میں ریاستوں کی ناکامی کا اندازہ ان عوامل کی بنیاد پر کیا: ''ریاست اور حکومت دونوں مل کر شہریوں کی ضرورتوں کو پورا نہ کرتی ہوں، جہاں حکومت میں کئی مسلح گروہ موجود ہوں، مختلف نسلی اور لسانی گروہوں کا بڑھتا ہوا دباؤ، پناہ گزینوں اور اندرون ملک بے گھر ہو جانے والے افراد کی بڑے پیمانے پر نقل و حرکت کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا، مختلف گروہوں کے حوالے سے ناہموار معاشی ترقی، معیشت کی تیزی سے تنزلی، ریاست کی طرف سے جرائم کا ارتکاب، قانونی جواز کھو بیٹھنا، عوامی خدمت کی فراہمی میں تیزی سے انحطاط، وسیع پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، ریاست کے اندر ریاست کا فروغ، گروہوں سے وابستگیاں رکھنے والی اشرافیہ کا مضبوط ہونا اور دیگر ریاستی عوامل کی مداخلت۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضروری نہیں کہ ہم ان بین الاقوامی رپورٹس کی بنیاد پر یہ کہہ دیں کہ ہم ایک ناکام ریاست ہیں۔ لیکن جن بنیادوں پر اس سارے معاملے کا جائزہ لیا گیا ہے، وہ قابل غور ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ہمیں لوگوں کے سامنے حقیقت پسندی والا تجزیہ اور سچ اور تلخ حقائق پیش کرنا ہوں گے تاکہ ہم ان کو بنیاد بنا کر کوئی آگے کی طرف مثبت انداز میں پیش قدمی کر سکیں۔ دراصل پاکستان کا بنیادی بحران ہی یہ ہے کہ یہاں کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس نظام کے تحت زندہ ہے۔ آپ کو یہاں صدارتی، پارلیمانی، ڈکٹیٹرشپ، جمہوری اور غیر جمہوری نظام سمیت اسلامی نظام کی عجیب وغریب بحث سننے کو ملے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں ہر شخص کو اس کی مرضی کے مطابق نظام بھی ملے گا اور آپ اس نظام میں اپنی پسند کے نظاموں کو بھی بڑی آسانی کے ساتھ تلاش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر پارلیمانی جمہوری نظام کے حامی عناصر کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو نظام ہے اس میں پارلیمنٹ اور وزیراعظم کی بالادستی ہے۔ اس کے برعکس صدارتی نظام کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ ملک میں پارلیمانی نظام ہے لیکن اصل طاقت تو صدر کے پاس ہوتی ہے اور ملک عملاً صدارتی نظام کے تحت ہی چلتا ہے اور وزیراعظم، صدر کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔ اسلام سے محبت اور اسلامی عناصر کے حامی کہہ سکتے ہیں کہ 1973ء کے دستور میں یہ لکھا ہے کہ اس ملک میں کوئی بھی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں ہوگا، اس ملک کا نام ہی اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور اس کو سیکولر کہنا یا اس کو سیکولر بنانے کی باتیں کرنا دستور کے خلاف ہیں۔ فوجی حکمران کے حمایتی کہہ سکتے ہیں اس ملک میں جمہوریت محض ایک نمائشی عہدہ ہے اور اصل طاقت تو فوج کی ہے اور وہی فیصلہ کن طاقت رکھتی ہے اور سیاسی قوتوں کو ان ہی کے تابع رہ کر سیاست کرنا ہوتی ہے۔ اسی طرح سیکولر عناصر کے پاس بھی دلیل ہے کہ قائداعظمؒ ملک کو ایک سیکولر پاکستان کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے اور اس کی دلیل میں وہ 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان سارے تضادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ملک جمہوری ہے اور نہ آمرانہ، اسلامی ہے اور نہ پارلیمانی ہے اور نہ ہی یہ صدارتی نظام کے تحت چل رہا ہے بلکہ یہ ملک مختلف نظاموں کا چربہ ہے اور ہم اس کھیل میں کسی بھی ایک مثبت نظام کو واضح نہیں کر سکے۔

یہ پاکستان ہی کی ریاست کا بحران ہے، جہاں سیاسی عمل میں ایک مضبوط مداخلت کو سیاسی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ فوج سمجھتی ہے کہ سیاست کرنا اور حکمرانی کرنا اس کا ہی حق ہے۔ یہاں سیاسی جماعتوں کی تشکیل، اتحادوں کی سیاست، حکومت بنانا اور گرانا، انتخابی معاملات میں مداخلت جیسے معاملات میں بھی ریاست کے ادارے میں فوج کا ایک کلیدی کردار نظر آتا ہے۔ یہاں جو اس ملک میں اتحادی کلچر متعارف کروایا گیا ہے اور مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ تنظیموں کی تشکیل اور سرپرستی سمیت، لسانی سیاست کے بیج بونے سب ریاست اور اس کے اداروں کا ہی کیا دھرا ہے۔ ریاست حکومتوں پر اور حکومت عوام پر اپنے فیصلے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھوپتی رہی ہے۔ اور جن مواقع پر فوج کی براہِ راست حکمرانی تھی تو اس نے خود ہی ایسے فیصلے کیے جس میں کسی سطح پر مشاورت کا عمل موجود نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی اصل طاقت فوج ہے اور اس کی وجہ سے ہمارا دفاع کافی مضبوط ہے۔ معلوم نہیں کہ ہم کس دفاع کی بات کر رہے ہیں کیوں کہ ہم اس وقت عالمی برادری کے سامنے ایک کمزور وکٹ پر کھڑے ہیں۔ عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف ہم ریاست کی عملی رٹ کی مضبوطی کی بات کرتے ہیں حالاں کہ ریاست کی رٹ اب کئی حوالوں سے کمزور نظر آتی ہے۔ ریاست اور اس کے اداروں کے مقابلے میں اب مافیا کا کنٹرول مضبوط ہو گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ میں ہم ریاست کی اپنی رٹ کی اصل صورت حال سے بخوبی آگاہ ہیں، جہاں اسے ریاست کے مقابلے میں نان سٹیٹ ایکٹرز زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان نان سٹیٹ ایکٹرز کو ہمارے بعض ادارے اپنا سٹریٹیجک اثاثہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری ریاست ہی کے تضادات ہیں۔ لوگوں میں کئی سوالوں کے حوالے سے ابہام اب تک موجود ہیں، جن میں بھارت، امریکہ کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ اس ملک میں ابتدا ہی سے بھارت اور امریکہ کو اپنا دشمن بنا کر لوگوں کے ذہنوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ اسلام کو بھی اس ریاست نے عملاً ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ اسی ریاست کے تضادات کا نتیجہ ہے کہ کسی وقت اس ملک میں جہاد کو جائز اور کسی وقت اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ کبھی ہمیں سمجھایا جاتا ہے کہ بھارت اور امریکہ ہمارے دشمن ہیں اور کبھی ہمیں انہیں دوست بنانا پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی جہادی ہمارے ہیروز ہوتے ہیں، کبھی ان کے سروں کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ کبھی ریاست قانون کی حکمرانی کی بات کرتی ہے تو کبھی قانون کی حکمرانی کو پامال کر کے اس پر قابض ہو جاتی ہے۔ یہ طرزِ عمل ملک میں ریاست کی جانب سے لوگوں کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔ یہاں ریاست نے ''نظریہ ضرورت'' کے تحت ایسے سیاسی عسکری اور عدالتی فیصلے کیے جو براہِ راست ہماری قومی سلامتی کے زمرے میں آتے تھے۔ نظریہ ضرورت کی سیاست کا یہ کھیل اب بدستور اس ملک میں جاری ہے اور لوگوں کو نظریہ ضرورت اور قومی مفاد کے نام پر خاموش رہنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ لوگوں کو سچ کہنے اور اپنے سیاسی و جمہوری حق کا استعمال، ایسوسی ایشن بنانے کا حق، معلومات کے حصول کا حق، سیاسی جدوجہد کا حق، فیصلہ سازی کا حق جیسے امور میں جہاں حکومتوں کی جانب سے بحران رہا، وہیں ریاست نے بھی لوگوں کے بنیادی حقوق کو تسلیم نہیں کیا۔ ہر جگہ لوگوں کو یہ کہا گیا کہ وہ قومی مفاد اور قومی سلامتی کے برعکس کچھ نہ کریں۔ قومی سلامتی اور قومی مفاد کا تعین کرتے وقت سیاسی اداروں کو اس کا حصہ بنایا گیا اور نہ ہی لوگوں کو اس بارے میں اعتماد میں لیا گیا۔ مثال کے طور پر، جنرل پرویز مشرف 9/11 سے قبل پوری دنیا کو جہاد اور دہشت گردی میں فریق سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جب ہماری فوج نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے اتحادی بننے کا فیصلہ کیا تو جہاد اور دہشت گردی کا فرق ختم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیا۔ جنرل ضیا الحق نے بھی افغان جہاد امریکہ کی ضرورت کے تحت کیا اور ایسے گروپوں کی سرکاری سرپرستی کی جو بعد میں جا کر تحریک کا حصہ بنیں۔ جنرل پرویز مشرف نے سیاسی حکومت کی موجودگی میں بوکھلاہٹ کارگل کی صورت میں کیا اس نے دونوں اطراف کی سیاسی حکومتوں یعنی نواز شریف اور واجپائی کے درمیان ہونے والے اعلانِ لاہور کو بری طرح سبوتاژ کیا۔ اس سارے تناظر میں ریاست کے مقابلے میں سیاست کیسے مضبوط ہو سکتی تھی۔ اس پر ضرور غور کیا جانا چاہیے۔

دراصل ریاست ایک جدید عمرانی اور سیاسی تصور ہے اور قومی ریاست کا ارتقا سیاسی عمل ہی کے نتیجے میں آگے بڑھتا ہے۔ کسی بھی سماج میں سیاسی عمل کی بنیاد جمہوریت، سیاسی مکالمہ، رواداری اور افہام و تفہیم کی سیاست سمیت معاشی و معاشرتی مفادات کے بارے میں رکھی جاتی ہے جو ہر سطح پر قابل قبول ہو۔ پاکستان کی ریاست کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اس مؤقف کی تائید میں معروف دانشور وجاہت مسعود اپنے ایک تفصیلی مضمون ''پاکستانی ریاست کو درپیش بحران'' میں اس خیال کی نفی کرتے ہیں اور ان کے بقول اس کی تشکیل اسلامی ریاست کے اصول کے تحت نہیں ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک سیاسی جماعت کے طور پر مسلم لیگ کا جمہوری تشخص کمزور تھا۔ اس کی قیادت کا بڑا حصہ جاگیردار اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مسلمان عوام سیاسی طور پر پس ماندہ تھے اور ان میں تعلیم کی کمی تھی اور وہ تجارت و صنعت جیسے شعبوں میں کمزور تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ بنیادی طور پر ایک سیاسی و معاشی نقطۂ نظر تھا۔ مسلمان عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش میں اس تحریک کو مذہبی رنگ دیا گیا۔ اسی طرح 1940ء کی جس قرارداد کی رُو سے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا، اس میں مسلمانوں کا ذکر تو موجود ہے لیکن کہیں بھی اسلام، شریعت یا قرآن و سنت کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ پاکستان کی تحریک، مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کی تحریک تھی اور مسلمان مذہبی پیشواؤں کی بڑی تعداد اس کی مخالف تھی۔''

اسی طرح 16 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کو تقسیم کر کے دو آزاد مملکتیں قائم کرنے کے لیے جس قانون کی منظوری دی گئی، اس کے متن میں کسی بھی مذہب کا کوئی ذکر نہیں۔ وجاہت مسعود خود تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کی تحریک کو مذہبی رنگ دیا گیا تھا اور اب سوال یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار صرف عوام تو نہیں تھے بلکہ مسلم لیگ کی قیادت بشمول قائداعظم بھی تو سارے معاملات سے کیسے تعلق ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی سطح پر بھی یہ اسلام رنگ غالب آیا اور لوگوں نے پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے نعرے بھی لگائے اور مسلم لیگ کی کسی قیادت نے انہیں ان نعروں کے لگانے سے منع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کیا۔ معروف مصنف آئین ٹالبوٹ نے اپنی کتاب ''تاریخ پاکستان'' میں صفحہ 18 میں لکھا ہے:

''سماجی علوم کے ماہرین نے پاکستان پر مختلف لیبل لگائے ہیں جیسے over developed state، نوکر شاہی سے مغلوب سیاسی اکائی یا پھر فوجی غلبے کی حامل ریاست وغیرہ۔ ان نظری زاویہ ہائے نظر کے پیچھے پاکستان ریاست کی سیاسی ترقی میں کردار کی اہمیت ہے جس پر بظاہر اس ملک کے جغرافیائی و سیاسی پس منظر کی وجہ سے غیر معمولی زور دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمال اظفر بھی پاکستان کو فوجی ریاست کا ہی نام دیتے ہیں جو دنیا کی چار سب سے بڑی فوجی ریاستوں میں سے تین میں گھری ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس ملک کی تاریخ میں ہندوستان سے لڑی گئیں جنگوں کے باعث خوف اور اندیشوں کی فضا مسلسل قائم ہے۔ علاوہ ازیں تحکمانیت کے حوالے سے بیشتر مصنفین کا خیال ہے کہ یہ پاکستانی ریاستی ڈھانچے کے خودمختارانہ کردار کا نتیجہ ہے۔ حمزہ علوی نے ریاست اور معاشرے کے درمیان پیدا ہو جانے والے فاصلے اور فرق کو مارکسی تصور بونا پارٹزم کے پیمانے سے جانچا ہے۔ حمزہ علوی اس صورت حال کو اطرافی کیپیٹل ازم کے دائرہ کار میں قومی بورژوائی ڈھانچے کے بالمقابل کمزوری کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ یہاں ریاستی ڈھانچے پر مسلط سویلین اور فوجی عالمین نے پہلے پہل تو ایک دوسرے سے کشمکش میں مبتلا سماجی طبقوں میں ثالثی کے فرائض سنبھال لیے اور چوں کہ ان طبقوں میں سے کوئی بھی بالادست یا غالب پوزیشن حاصل نہیں کر سکا، لہٰذا سول و فوجی نوکر شاہوں نے کھلم کھلا ریاست پر کنٹرول حاصل کر لیا۔''

ریاست کی ایک بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ ایک تو خود ہر طرح کے تعصب اور گروہ بندی سے لاتعلق ہو کر سب کے ساتھ صرف یکساں سلوک کرتی ہے تو دوسری طرف سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک ایسے سماج میں، جو مختلف مذاہب رنگ و نسل، کلچر اور برادریوں پر مشتمل ہوتا ہے، سب کو ساتھ لے کر چلنا ریاست کے لیے اور بھی بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا۔ کا بلکہ ریاستی اداروں نے اپنے تضادات کے باعث لوگوں کو ساتھ رکھنے کی بجائے ان میں تقسیم کرنے کی پالیسی پر عمل کیا۔ تین صوبے اب بھی سمجھتے ہیں کہ ان پر اسٹیبلشمنٹ اور ریاست نے پنجاب کی بالادستی کو ان پر مسلط کیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کا مؤقف ہے کہ اصل فیصلے کی طاقت پنجاب کے پاس ہے اور وہ جو چاہیں گے، وہی کچھ یہاں ہوتا ہے۔ اس طرز عمل نے تین صوبوں میں عملاً مرکز اور پنجاب کے خلاف ایک نفرت کا سماں بھی پیدا کیا ہوا ہے۔ بلوچستان کا بحران، خیبر پختونخوا میں دہشت گردی کے خلاف جاری مہم اور اس تناظر میں ڈرون حملے اور مقامی لوگوں کی وسیع پیمانے پر نقل مکانی، پنجاب میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرائیکی صوبے اور بہاولپور ریاست کا مطالبہ، پوٹھوہار صوبہ اور ہزارہ صوبے کے مطالبے، عملاً ریاست اور اس کے ڈھانچے پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ نواب اکبر بگٹی کا قتل ہوا اور جس انداز میں بھنو صاحب کو پھانسی دی گئی، اس نے بلوچستان اور اندرون سندھ میں یہ پیغام دیا کہ ان کے رہنما ریاست کے لیے اہم نہیں۔ دراصل ریاست اسی صورت میں اپنی اہمیت یا رٹ لوگوں پر قائم کرتی ہے، جب وہ منصفانہ بنیادوں پر فیصلہ کرتے ہوئے لوگوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ضروریات کو نہ صرف تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کے حصول میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن جب ریاست اپنی بنیادی ذمہ داری اور لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دینے میں ناکام ہو جائے اور خود سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی تفریق کے پہلوؤں کا اظہار کرے تو لوگ کیوں ریاست کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کریں گے۔ ریاست اور عوام کے ساتھ جو لاتعلقی کا احساس غالب ہوتا ہے، اس کی وجہ لوگوں سے زیادہ ریاست ذمہ دار ہوتی ہے، کیوں کہ وہ لوگوں میں اس احساس کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے کہ سب کے لیے اس کے لیے برابر ہیں۔

پاکستان کا 1973ء کا دستور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سب کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے، عملاً وہ ایسا نہیں کر سکا اور بار بار اس آئین کو معطل کر کے اور اس میں اپنی مرضی اور منشا کے مطابق ترمیم کر کے ہم نے اس آئین کو بھی متنازع بنا دیا ہے۔ بلوچستان میں ایک بڑا گروپ ایسا ہے، جو اس موجودہ آئین کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور ان کے بقول ہم اس آئین کے پابند نہیں اور ہماری جدوجہد اس سے آگے بڑھ کر ہے۔ صوبائی خودمختاری ایک ایسا معاملہ ہے جو اب تک حل ہونے کو نہیں۔ حکومت نے 2009ء میں این ایف سی ایوارڈ کی تقسیم کے موقع پر یہ کہا کہ اب صوبائی خودمختاری کا معاملہ حل ہو گیا ہے لیکن یہ بحران اسی طرح جاری ہے۔ چھوٹے صوبوں میں اب بھی اس این ایف سی ایوارڈ پر تحفظات ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان پر اب بھی اسلام آباد کی بالادستی ہے۔ اگرچہ ہمارے دستور میں صوبوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہونے کے برابر ہے۔ این ایف سی ایوارڈ کے باوجود مالی وسائل اور پانی کی تقسیم پر صوبوں میں شدید اختلافات موجود ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ریاست کے بحران کا حل کیا ہے؟ اگرچہ مسئلہ کا حل تو صوبائی خودمختاری اور آئین کی پاسداری ہی میں ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر ہم چھوٹے صوبوں میں موجود تحفظات کو ختم کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اگر ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت اور غیر جمہوریت یعنی آئین کو بار بار معطل کرنا ہے تو پھر ریاست کا یہ بحران نہ صرف جوں کا توں رہے گا بلکہ اس سے اور زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ہمیں پاکستان میں موجود تمام لوگوں اور اکائیوں کو اعتماد میں لینا ہوگا اور انہیں یہ باور کروانا ہوگا کہ ریاست ان کے بارے میں کسی بھی طرح کے تعصب کا شکار نہیں۔ یہ کام یقیناً کسی بڑے سیاسی اتفاق رائے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور بدقسمتی سے ہم اس وقت جس بحران اور محاذ آرائی کا شکار ہیں، اس میں قومی اتفاق

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائے کا ماحول ممکن نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ ہمیں ریاست اور ملک کو بحران سے نکالنے کے لیے کچھ ایسے فیصلے کرنے پڑیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ مگر ہمیں کڑوی گولی ہضم کرنا ہوگی۔ جب تک ریاست اور اس کے ادارے بنیادی طور پر یہ طے نہیں کریں گے کہ ہمیں سیاسی نظام ہی کو بنیاد بنا کر نظام کو مضبوط کرنا ہوگا اور کسی بھی طرح سیاسی نظام میں تعطل پیدا نہیں کرنا، ہم ایک حد تک بہتری کی طرف پیش قدمی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہاں پاکستان بننے کے فوراً بعد یعنی ابتدا ہی میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ ہم نے سیاسی نظام کو کمزور اور اسٹیبلشمنٹ اور بیوروکریسی پر مبنی نظام کو مضبوط کرنا ہے اور اس کا نتیجہ اب ہم ایک کمزور ملک کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم ایک جمہوری اور ویلفیئر سٹیٹ میں تبدیل ہونے کی بجائے اب ایک سکیورٹی سٹیٹ بن گئے ہیں۔ یقیناً یہ سفر اچانک نہیں ہوا بلکہ اس میں ماضی میں کیے گئے وہ تمام فیصلے ہیں جو ہمیں ایک ایسی دلدل میں دھکیل رہے ہیں جس نے بالآخر ایک سکیورٹی سٹیٹ میں تبدیل ہونا تھا۔ ویلفیئر سٹیٹ تو ہمارا کبھی بھی ماڈل نہیں رہا اور نہ ہی اس کی طرف کوئی خاص پیش رفت کسی بھی دور میں دیکھنے کو ملی۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان ایک قومی سلامتی کے نام پر سکیورٹی سٹیٹ میں تبدیل ہو گیا ہے اور اب اس کو جمہوری اور فلاحی سٹیٹ میں تبدیل کرنا ہے۔ یہ نعرہ اور خواہش تو بہت اچھی ہے لیکن اب یہ کام کوئی آسان نہیں رہا کیونکہ اس کے لیے معاشرے میں موجود طاقت کے مراکز میں کوئی ایسا اتفاق رائے موجود نہیں جو اس بات کی ضمانت دے سکے کہ ہمیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس ملک میں نان سٹیٹ ایکٹرز میں اضافہ ہوا ہے تو اس کی وجہ بھی سٹیٹ ایکٹرز کی ناکامی ہے اور انہوں نے جو بویا آج اس کا نتیجہ وہ بھی اور قوم بھی بھگت رہی ہے۔ جب ریاست سیاسی اور سماجی طور پر انتہا پسند ہو جائے اور عام لوگوں کے بنیادی حقوق کو غصب کر کے ان سے زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جائے تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ وہ ریاست کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے اپنی سیاسی و سماجی جدوجہد کو جمہوری رنگ دینے کی بجائے بندوق اور طاقت کے استعمال کا راستہ اختیار کر لیں۔ یہ ریاست ہی کی ناکامی ہے کہ اس کے مقابلے میں تواتر کے ساتھ ایسے گروہ یا انفرادی طور پر لوگ سامنے آ رہے ہیں جو ریاست کے اندر اپنی ریاست قائم کر کے جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کو اپنی بہتر حکمت عملی تصور کرتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں ہمارا بنیادی بحران جمہوریت اور اس کے اداروں کے ساتھ انتظام کے ساتھ پنہاں ہے تو پھر ہمیں اس پر بنیادی توجہ دینا ہوگی۔ ہمارا ایک تضاد کیوں کہ نظریاتی ریاست کا بھی ہے اور اس کی تعریف ہر کوئی اپنی اپنی سطح پر اپنے انداز میں کرتا ہے کہ اس طرح بحران کم نہیں بلکہ مزید وہ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ سیکولر ریاست کا بھی سیاسی طور پر اب اس نہج پر پہنچ گیا ہے جس کے خلاف ایک شدید مزاحمت ہے اور یہاں بدقسمتی سے اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انداز میں سیکولرازم کی تعریف کی گئی ہے اور سیکولر دوستوں نے جس غلط انداز میں اس کی تعبیر کی، اس نے لفظ سیکولرازم کو عملاً متنازع بنا دیا ہے۔ دوسرا، کیوں کہ یہاں لیفٹ کی سیاست اور اس کی سیاسی جماعتیں نہ صرف کمزور ہیں بلکہ کوئی بڑا وجود بھی نہیں رکھتیں، اس لیے ان کا آگے بڑھنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر ہم پاکستان میں جمہوری اور فلاحی ریاست کے نعرے کو بلند کریں تو اس کے نتیجے میں بہت سے دلوں کو مطمئن کیا جا سکتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں فوجی حکمرانوں اور مارشل لاء کی تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو اس میں آپ کو سب سے زیادہ عرصہ حکومت سول حکمرانوں کا نہیں بلکہ فوجی حکمرانی کا نظر آتا ہے۔ اس ملک میں اب تک چار بار براہ راست فوج نے سیاسی نظام کے اندر مداخلت کر کے اقتدار پر قبضہ کیا اور ہر بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کی مداخلت کی وجہ محض اقتدار پر قبضہ کرنا یا حکومت کرنے کی خواہش نہیں بلکہ حالات و واقعات نے ان کو مجبور کیا کہ وہ ملک کا نظم و نسق سنبھال لیں۔ ہر فوجی حکمران نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد یہی کہا کہ ان کا یہ دور حکمرانی عبوری ہوگا اور وہ بہت جلد اس ملک میں عام انتخابات کروا کے عوام کے منتخب نمائندوں اور سیاسی حکومت کو اقتدار سونپ دیں گے۔ لیکن فوجی حکمرانی کے اس تجربے نے ثابت کیا کہ ان فوجی آمروں نے جان بوجھ کر اقتدار پر قبضہ کیا اور اقتدار پر رہنے کی ان کی فطری خواہش نے ان کو ایک لمبے عرصے تک اس ملک میں حکومت کرنے کا سامان فراہم کیا۔ پاکستان کی مختصر تاریخ پر نظر دوڑائیں تو جنرل ایوب خان کا دور اقتدار 1958ء سے لے کر 1969ء تک رہا جب کہ جنرل یحییٰ خان 1969ء سے 1971ء تک اقتدار پر قابض رہے۔ اسی طرح جنرل ضیاالحق کا دور 1977ء سے 1988ء تک اور جنرل پرویز مشرف کا دور 1999ء سے 2008ء تک نظر آتا ہے۔ یعنی اسلامی جمہوریہ پاکستان جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ملک جمہوریت کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا تھا، بدقسمتی سے ایک طویل عرصے تک براہ راست فوجی حکمرانی کے ماتحت چلایا جاتا رہا۔ یہ طے ہے کہ جو ملک اپنی تاریخ کا نصف حصہ آمریت کے سائے میں اور سیاسی نظام کے بغیر چلا ہو، اس میں سیاسی اداروں اور نظام کی کامیابی ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ اس وقت ہم ایک ناکام سیاسی نظام کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک اور دلچسپ تجزیہ ہوگا کہ جو نظام فوجی حکمرانی کے بغیر اور سیاسی حکمرانوں یا سول حکمرانی کی مدد سے چلائے گئے، ان میں جو فوج کی مداخلت تھی، اس کو بھی کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ملک مجموعی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ فوج کی حکمرانی ہی کے ماتحت پلا ہے اور اس کے کنٹرول میں رکھ کر جو نظام چلایا گیا، اس میں جمہوریت اور جمہوری عمل دونوں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس لیے پاکستان میں جب بھی فوج کی حکمرانی کا سوال اٹھایا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ائے گا تو اس میں بالادستی ہمیں انہی قوتوں کی نظر آئے گی جو عملاً اس ملک کو چلاتی رہی ہیں۔

یہ سوال بھی اپنی جگہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان ایک جمہوری ملک کے طور پر اپنی شناخت برقرار نہیں رکھ سکا اور جو فوجی حکومتیں آئیں یا جو مارشل لاء لگائے گئے، ان کی سیاسی نوعیت کیا تھی؟ ہمارے بہت سے اہل دانش اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ پاکستان میں جو صورتِ حال بار بار پیدا ہوتی رہی، اس کی ایک وجہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ریاست اور اس کے اداروں کے درمیان ایک تضاد اور تصادم کی کیفیت تھی، جس کی بنیادی وجہ ریاستی اداروں کی داخلی ساخت، عدم توازن، ملک میں موجودہ دستوری صورتِ حال اور مسلم لیگ کا کمزور ہونا جیسے عوامل شامل تھے۔ ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا ہوگا کہ فوجی حکمرانی کو سیاسی جواز فراہم کرنے والی سیاسی جماعتیں اور ان کے بڑے بڑے رہنماؤں کا اپنا کیا کردار تھا۔ اگر ملک میں فوجی حکمرانی مضبوط رہی، تو اس کی وجہ جہاں فوج کی قیادت تھی وہیں اہل سیاست بھی اس کے براہِ راست ذمہ دار ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر اس ملک کی تاریخ میں ایوب خان فوجی مداخلت کا سہارا نہ لیتے تو آج اس ملک کی جمہوری تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایوب خان مارشل لاء لگانے کے بارے میں کافی فکرمند تھے اور انہیں یہ فیصلہ کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس تذبذب میں مبتلا رہے کہ آیا انہیں یہ اقدام کرنا بھی چاہیے کہ نہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں امریکہ سے بھی مشورہ مانگا۔ اس پر ایک امریکی عہدے دار نے تو تنبیہ کی تھی کہ ایسا کیا گیا تو اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ایوب خان کے مارشل لاء کو امریکی تائید بھی حاصل تھی۔ ایوب خان سمیت ہمارا فوجی حکمران اس زعم میں مبتلا رہا یا اس نے اس کی شعوری کوشش کی کہ وہ اپنے آپ کو ناگزیر رہنما کے طور پیش کرے۔ ان تمام فوجی حکمرانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں محض فوجی طاقت پر ہی بھروسا نہیں کیا بلکہ کچھ سیاسی ضرورتوں کے تحت ایسے اقدامات بھی کیے جن سے ان کا کچھ جمہوری تشخص بھی قائم ہو جائے۔ مثلاً ایوب خان نے 1962ء میں بنیادی جمہوریت کا نظام متعارف کرایا جس کے تحت 80,000 افراد مقامی سطح پر بی ڈی ممبر منتخب کیے گئے۔ بعد ازاں ان 80,000 منتخب افراد کو ایوب خان نے اپنے صدارتی انتخاب کے لیے انتخابی ادارے کے طور پر بھی استعمال کیا۔ ان انتخابات یا ایک طرح کے ریفرنڈم میں ایوب خان کو محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں 95 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ سب جانتے ہیں کہ دوٹ کے حصول کے لیے فوجی حکمرانوں نے جو ہتھکنڈے اختیار کیے وہ کسی بھی طور جمہوری نہیں تھے۔ اس وقت کے سیاسی پنڈتوں اور اہل دانش کا خیال تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں ایک بڑی اور واضح سیاسی حمایت حاصل تھی اور اس وقت کی تمام سیاسی جماعتیں ان کی حمایت میں پیش پیش تھیں۔ اس حمایت نے وقتی طور پر ایوب خان کو خاصا پریشان بھی کیا لیکن وہ اپنے تمام تر ریاستی اختیارات کی مدد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے محترمہ فاطمہ جناح کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ لوگوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی شکست کو قبول نہیں کیا اور سب نے ایوب خان پر الزام لگایا کہ ان کی جیت میں دھاندلی کا عمل دخل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انتخابی نتیجے کے بعد ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کے حامیوں میں ایک بڑا تصادم ہوا اور اس تصادم نے ایک پُرتشدد صورت اختیار کر لی جس پر بڑی مشکل سے قابو پایا گیا۔

ایوب خان صدارتی انتخاب تو جیت گئے لیکن اس تجربے سے انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کو اپنی سیاسی ساکھ اور سیاسی بقا کے لیے ایک بڑی سیاسی حمایت کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بنیادی جمہوریت کے تحت منتخب افراد ایوب خان کو سیاسی طاقت فراہم کر سکیں گے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہو سکا اور 1962ء میں مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد جب سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو ایوب خان کو ایک سیاسی جماعت کی ضرورت پیش آئی۔ اسی سیاسی ضرورت کے تحت انہوں نے کنونشن مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور اس کی صدارت بھی اپنے ہی کنٹرول میں رکھی۔ بہت سے سرکردہ مسلم لیگی رہنماؤں نے ایوب خان کا ساتھ دیا جن میں چوہدری خلیق الزماں اور محمد علی بوگرہ جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ ایوب خان نے ان انتخابات کے بعد چند برس تک ملک کے اقتدار کو سنبھالے رکھا لیکن وہ کئی طرح کے سیاسی بحرانوں کا شکار رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو، جو ایوب خان کی حکومت میں اہم عہدے دار تھے، نے بعد ازاں اپنی ذاتی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور ایوب خان کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت میں عوامی لیگ نے ایوب خان کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ اس سارے بحران کی وجہ سے ایوب خان کافی دباؤ کا شکار ہو گئے اور اسی دباؤ کے تحت انہوں نے مارچ 1969ء میں اقتدار ایک اور فوجی جرنیل کے حوالے کر دیا۔ نئے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے فوج کے ساتھ ساتھ ملک کی باگ ڈور بھی سنبھال لی اور اس کے نتیجے میں ایوب خان کا وضع کردہ پورا نظام اور بنایا ہوا آئین بھی عملاً ختم ہو کر رہ گیا۔ ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے بعد تمام لیگی رہنماؤں نے ان کو ان کی اپنی بنائی ہوئی کنونشن مسلم لیگ کی صدارت سے باہر کر دیا اور ان کی جگہ سابق سپیکر فضل چوہدری کو پارٹی کا عبوری صدر نامزد کر دیا گیا۔ ایوب خان نے بنیادی جمہوریت کا جو نظام متعارف کرایا تھا، وہ بھی اپنی سیاسی ساکھ برقرار نہیں رکھ سکا اور ایوب خان کے ساتھ ہی ان کا دیا ہوا یہ سیاسی نظام بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

معروف دانشور ڈاکٹر جعفر احمد نے اپنے ایک مضمون بعنوان The Martial Law and the Administrative State of General Ayub Khan میں لکھا ہے:

> ''ایوب خان کے اپنے وضع کردہ دستور کے ذریعے متعارف کردہ سیاسی ادارے بھی ایک حقیقی جمہوری نظام کا کوئی قابل عمل متبادل پیش کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر جعفر احمد نے اپنے اسی مضمون میں کنونشن مسلم لیگ کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ ادارہ بھی افسر شاہی کے کنٹرول میں تھا جیسا کہ ایوب کی ترجیح تھی کہ اسے سول ملازمین کے ذریعے ہی چلایا جائے جب کہ وزرا اور دوسرے پارٹی رہنما پالیسیوں کو آگے بڑھانے یا فیصلے کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض نظام کو سطحی اعتبار سے سیاسی دکھانے کے لیے رکھے گئے تھے۔ ایوب خان کی مسلم لیگ زمینداروں، صنعت کاروں ور مراعات یافتہ طبقوں، جیسے مفاد پرست گروہوں، کے بے تحاشا اختیارات کی مالک حکومتی مشینری کے ساتھ قریبی تعلقات جوڑے رکھنے اور سرکاری سرپرستی حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ضرور تھی لیکن اس نظام کا یہ رخ بھی ایوب خان کے اقتدار کو سہارا نہیں دے سکا اور عوامی احتجاج کے شروع ہوتے ہی ایوب کے بھرتی کیے ہوئے سیاسی کارندے انہیں چھوڑ کر جانے لگے۔ یہی نہیں بلکہ ایوب خان کی حکومت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے لوگ بھی حزبِ اختلاف کے ساتھ مل رہے تھے۔''

ایوب خان کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد کنونشن مسلم لیگ کا 1970ء کے انتخاب کے بعد جو عبرت ناک منظرنامہ بنا، اس کا تجزیہ معروف دانشور محمد عابد عباسی نے اپنے ایک مضمون ''پاکستان میں مارشل لاء حکومتوں کا سویلین بہروپ: ایک تقابلی جائزہ'' میں کیا ہے۔ یہ مضمون ممتاز مؤرخ ڈاکٹر مبارک علی کی زیرادارت شائع ہونے والے سہ ماہی مجلّہ ''تاریخ'' کے شمارہ 39 میں شائع ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مایوس کن صورتِ حال میں، جس میں ایوب بھی سیاست سے علیحدہ ہو چکے تھے، کنونشن مسلم لیگ کو اس کے نئے صدر سمیت مختلف سیاسی لوگوں نے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ مثلاً 1970ء کے انتخابات میں اس جماعت نے بھرپور انداز میں شرکت کی اور قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے پورے ملک سے 124 نمائندے کھڑے کیے، جن میں مشرقی پاکستان سے 93، پنجاب سے 24، سندھ سے 06 اور صوبہ سرحد سے صرف ایک نمائندہ کھڑا کیا گیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ کنونشن مسلم لیگ کے 124 میں سے دو امیدوار ہی کامیاب ہو سکے تھے۔ اس سے زیادہ عبرت ناک بات یہ تھی کہ اس کے 124 میں سے 102 امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئی تھیں۔ دوسری طرف صوبائی اسمبلیوں کے نتائج بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھے۔ صوبائی اسمبلیوں میں کنونشن مسلم لیگ نے مشرقی اور مغربی پاکستان سے کل 274 امیدوار کھڑے کیے جن میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد محض سات تھی جب کہ 224 امیدوار اپنی ضمانتیں ضبط کروا چکے تھے۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بلاشبہ 1970ء کے انتخابات کے نتائج کنونشن مسلم لیگ کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ درج بالا اعداد و شمار سے واضح ہے کہ کنونشن مسلم لیگ نام کی جماعت ملک کی سیاست سے تقریباً کٹ چکی تھی۔ اسی طرح 1962ء سے 1968ء تک مسلسل مرکز اور صوبوں میں اکثریت اور اقتدار میں رہنے والی جماعت ایوب خان کے ساتھ ہی گمنامیوں کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔''

یہ اس کنونشن مسلم لیگ اور فوجی سربراہ ایوب خان کے دورِ اقتدار کا زوال تھا جس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بہت سے لوگ اس دور کو سبز انقلاب کا زمانہ اور تمام حکومتوں کے مقابلے میں بہتر دور قرار دیتے ہیں لیکن تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ان کی اچھی حکومت ان کی اقتدار سے علیحدگی کے فوراً بعد ہی ماضی کا حصہ بن گئی۔

جسٹس دراب پٹیل اپنی کتاب ''پاکستان میں آمریت اور ججوں کا کردار'' میں لکھتے ہیں:

''صدر سکندر مرزا اور جنرل ایوب، دونوں 1956ء کے دستور کو منسوخ کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں میں ایک ہی قدر مشترک تھی اور وہ تھی اقتدار کی ہوس۔ چنانچہ جنرل ایوب خان کو اطمینان ہو گیا کہ عوام نے مارشل لاء کو قبول کر لیا ہے تو انہوں نے 27 اکتوبر کو ایک محلاتی انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے صدر سکندر مرزا کو استعفیٰ دینے اور ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور خود کو صدر مقرر کیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور فوجی عدالتیں قائم کر دی گئیں۔ یوں مارشل لاء کو حقیقت کا روپ دے دیا گیا۔''

(صفحہ 40)

ملک میں مارشل لاء کا ایک اور دور ہم نے جنرل ضیاالحق کا دیکھا ہے جو اس ملک میں 1977ء سے 1988ء تک مطلق العنان حکمران رہے۔ جنرل ضیاالحق، پاکستان پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ ملک میں بھٹو حکومت کے خلاف پی این اے کی ایک بڑی تحریک سڑکوں پر تھی اور اس تحریک میں تمام بڑے اور سرکردہ سیاست دان بھٹو حکومت کو ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان میں نواب زادہ نصراللہ خان، مولانا مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالستار نیازی اور رفیق باجوہ نمایاں تھے۔ ان رہنماؤں کے بقول بھٹو صاحب نے 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کی اور پی این اے کے امیدواروں کو ریاستی طاقت سے شکست دی تھی۔ ان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ وہ ان نتائج کو قبول نہیں کریں گے۔ بھٹو صاحب کے خلاف اس ایجی ٹیشن نے ملک کے اندر ایک بڑی محاذ آرائی پیدا کر دی اور بھٹو صاحب کو ماننا پڑا کہ کچھ نشستوں پر دھاندلی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ ان حلقوں میں دوبارہ انتخابات کروانے کے لیے تیار ہیں۔ بھٹو صاحب اور پی این اے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میان اس سلسلے میں مذاکرات ہوئے اور کہتے ہیں مذاکرات کے عمل میں ذوالفقار علی بھٹو اور پی این اے کے رہنماؤں کے مابین بہت کچھ طے ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود جنرل ضیاالحق نے بھٹو صاحب کی منتخب حکومت کو ختم کر کے ملک میں مارشل لاء لگا دیا اور بھٹو صاحب سمیت پیپلز پارٹی کے سرکردہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔

جماعت اسلامی اور پی این اے کے معروف رہنما پروفیسر غفور احمد، جو نیک نامی اور اچھی شہرت کے حامل رکھتے ہیں، نے اپنی کتاب ''پھر مارشل لاء آ گیا'' کے صفحہ 256 پر لکھا ہے:

''4 جولائی کی رات کو سردار قیوم نے قومی اسمبلی کے رہنماؤں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا اور کھانے کے بعد مرکزی کونسل کا جو اجلاس ہوا، اس میں مفاہمت کی باتیں بھی تھیں اور زیادہ سخت رویہ اختیار کرنے کی بھی۔ یہ اجلاس رات ایک بجے کے بعد انتشار، بدمزگی لیکن اس تاثر کے ساتھ ختم ہوا کہ مذاکرات کے سلسلے کو نہ توڑا جائے بلکہ اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے۔ ٹھیک یہی وقت تھا جب فوجی دستوں نے پرائم منسٹر ہاؤس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور شب خون کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ بنیادی امور میں متفق ہو جانے کے بعد بھی غیر اہم تفصیلات طے کرنے میں وقت ضائع ہوتا رہا، یہاں تک کہ مارشل لاء آ گیا۔ اس رات اگر یہ قدم نہ اٹھایا جاتا تو غالب امکان تھا کہ 5 جولائی کو معاہدہ کی تکمیل ہو جاتی لیکن اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بعض نادانوں کی نادانی کے باعث 4 اور 5 جولائی کی درمیانی شب ایک ایسی طویل اور اندھیری رات ہوگی جس کی صبح کے لیے قوم برسوں ترستی رہے گی۔''

پروفیسر غفور نے ٹھیک لکھا ہے کہ بعض نادان دوستوں کی نادانی کی وجہ سے یہ مارشل لاء ہم پر مسلط ہوا کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ پی این اے کے بعض رہنماؤں نے جنرل ضیاء الحق کو پیغام دیا کہ معاملات بھٹو اور پی این اے کے درمیان بات چیت کے ذریعے طے ہو چکے ہیں اور محض اعلان باقی ہے۔ اسی بات کی ایک اور گواہی معروف صحافی علی حسن کی کتاب ''پاکستان، جرنیل اور سیاست'' میں جنرل جہاں زیب کی شہادت ہے اور وہ کہتے ہیں:

''ہم نے بھٹو کو تین ماہ کا وقت دیا تھا کہ وہ ملک میں انتخابات کروا دیں۔ اس دن تمام کور کمانڈروں، چیف آف جنرل سٹاف وغیرہ کو ایوان وزیر اعظم طلب کیا گیا تھا، جہاں پوری کابینہ بھی موجود تھی۔ جب ہم واپس آنے لگے تو مسٹر بھٹو ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے، آگے جنرل ضیا، ان کے بعد ایک اور آدمی اور پیچھے میں تھا۔ میں نے اسی جگہ اعلان کر دیا کہ یہاں سے تمام صاحبان سیدھے چیف کے گھر چلیں گے، ہمیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملاقات کرنی ہے۔ یہ سن کر مسٹر بھٹو کا رنگ فق ہو گیا، ہم وہاں سے نکل کر سیدھے چیف کے گھر آئے، وہاں رات 11:30 pm سے صبح 5 بجے تک میٹنگ ہوئی۔ صبح کے وقت ہم نے آپریشن کا نام "فیئر پلے" طے کر لیا اور فیصلہ کر لیا کہ اگر معاہدہ نہیں ہوتا تو ٹیک اوور کر لیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ان کے درمیان اپنے آدمی چھوڑ دیئے تھے۔"

کہا جاتا ہے کہ پروفیسر غفور احمد اور مولانا مفتی محمود سمیت بعض رہنما مارشل لاء کے حامی نہیں تھے لیکن اصغر خان، سردار شیر باز مزاری اور بیگم نسیم ولی خان مارشل لاء کی حمایت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ فوج کی خواہش کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد کے رہنماؤں کے باہمی تضادات اور فوج سے پس پردہ معاملات بھی مارشل لاء کے نفاذ کا باعث بنے۔

جنرل ضیاالحق نے بھی وہی کچھ کیا جو ان کے پیش رو ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان نے کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنرل ضیاالحق کو بھٹو صاحب نے اپنا سب سے زیادہ حمایت یافتہ سمجھ کر فوج کا سربراہ بنایا تھا مگر ان کے اقتدار کا خاتمہ ان کے اپنے نامزد کردہ جنرل ضیاالحق کے ہاتھوں ہوا۔ جنرل ضیاالحق نے دعویٰ کیا کہ وہ ملک میں 90 روز کے اندر عام انتخابات کروا دیں گے اور ملک ایک بار پھر جمہوری سفر پر گامزن ہو جائے گا مگر عملاً ایسا نہیں ہو سکا اور جنرل ضیاالحق ملک میں 11 برسوں تک اقتدار پر قابض رہے۔ وہ تو کچھ عرصہ مزید اقتدار پر قابض رہنا چاہتے تھے مگر قدرت کو ان کے بارے میں کچھ اور منظور تھا۔ وہ 17 اگست 1988ء کو ایک فضائی حادثے کی سازش کا حصہ بن کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جنرل ضیاالحق کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بہت نرم خو آدمی ہیں اور باتیں کرنے سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے ہیں، ان کو ایک ذہین جنرل کا خطاب بھی دیا گیا۔ جنرل ضیاالحق کا خیال تھا کہ وہ ایسی تمام غلطیوں سے گریز کریں گے جو ایوب خان اور یحییٰ خان نے کیں اور ان کے مقابلے میں وہ اقتدار میں رہنے کے لیے بہتر حکمت عملی اختیار کریں گے۔

جنرل ضیا کی آمد کو پی این اے کی مجموعی حمایت حاصل تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس تحریک کا بنیادی نعرہ اسلامی نظام حکومت یا نظام مصطفیٰ لانے کا تھا۔ اس لیے جب جنرل ضیاالحق نے اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھٹو مخالفین کی سیاسی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ملک میں اسلامی نظام لانے اور اسلامائزیشن کا نعرہ لگا دیا۔ ملک میں اسلامی نظام کے حامیوں اور پی این اے میں شامل جماعتوں نے بھٹو صاحب کے مقابلے میں جنرل ضیاالحق کو نجات دہندہ سمجھا اور ایک فوجی حکمران سے اسلامی نظام لانے کے حوالے سے توقعات وابستہ کر لیں۔ جنرل ضیاالحق نے اپنے پیش رو ایوب خان کے مقابلے میں اس غلطی سے گریز کیا جس میں ایوب خان نے دورانِ اقتدار فوجی سربراہ کی حیثیت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور اپنے آپ کو بطور سویلین صدر کے متعارف کروایا۔ جنرل ضیاالحق اپنی زندگی کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آخری سانس تک ملک کے صدر کے ساتھ ساتھ فوجی سربراہ بھی رہے۔ جنرل ضیاالحق 90 روز میں منصفانہ اور شفاف انتخابات کروانے کا نعرہ لے کر آئے تھے لیکن جلد ہی ان کی سوچ میں تبدیلی آ گئی اور وہ بھی لمبی حکمرانی کے بخار میں مبتلا ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے حالات کو جواز بنا کر فوری انتخابات کروانے سے انکار کر دیا اور 1979ء میں ایوب خان کی طرز پر مقامی نظام میں بلدیاتی انتخابات کروائے اور بعد ازاں ایسے ہی انتخابات 1983ء میں بھی کرائے گئے۔ جنرل ضیاالحق عملاً ملک میں سیاسی نظام کے خلاف تھے اور انہوں نے ابتدا میں جو دو مقامی انتخابات کروائے وہ بھی غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے۔ جنرل ضیاالحق، پیپلز پارٹی کو ایک بڑی جماعت سمجھتے تھے اور ان کو خوف تھا کہ جماعتی بنیادوں پر انتخاب ہوا تو اس میں پیپلز پارٹی کامیابی حاصل کر کے ان کی سیاسی مشکلات میں اضافہ کر دے گی۔ مارشل لاء کے فوری بعد انہوں نے 90 دن میں انتخابات کروانے سے گریز کیا۔ اس میں بھی وہ پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کے خوف میں مبتلا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے پہلی بار 1985ء میں عام انتخابات کروانے کا فیصلہ کیا تو وہ بھی غیر جماعتی تھے۔ اس وقت ملک میں جنرل ضیاالحق کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک زوروں پر تھی جس میں پیپلز پارٹی کے علاوہ نواب زادہ نصراللہ خان، مولانا فضل الرحمان، مولانا علامہ احسان الٰہی ظہیر جیسے لوگ شامل تھے۔ جنرل ضیاالحق کا خیال تھا کہ اگر وہ غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کروائیں گے تو اس کو ایم آر ڈی کی قیادت قبول نہیں کرے گی اور وہ انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ جنرل ضیاالحق کو معلوم تھا کہ ایم آر ڈی میں تمام جماعتیں اس بات پر تقسیم ہیں کہ انہیں غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینا بھی چاہیے کہ نہیں۔

جنرل ضیاالحق کی خواہش تھی کہ ایم آر ڈی بالخصوص پیپلز پارٹی ان غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کر دے تاکہ وہ سیاسی طور پر محفوظ رہ سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاالحق پس پردہ ایم آر ڈی میں شامل بعض رہنماؤں کے ذریعے بھی مسلسل رابطہ میں تھے تاکہ ایم آر ڈی کی قیادت بائیکاٹ کے فیصلے پر قائم رہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب ایم آر ڈی نے 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بائیکاٹ کا حتمی اعلان کیا تو جنرل ضیاالحق سجدے میں گر گئے اور انہیں تسلی ہو گئی کہ وہ ایک بڑے بحران سے بچ گئے ہیں۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر اس وقت ایم آر ڈی کی قیادت ان انتخابات کا بائیکاٹ نہ کرتی تو شاید جنرل ضیاالحق آگے جا کر ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ انتخابات کا انعقاد مشکل ہو جاتا۔ جنرل ضیاالحق نے اپنے اقتدار کو محفوظ کرنے کے لیے 1985ء کے عام انتخابات سے قبل ریفرنڈم کے ذریعے اپنے آپ کو ملک کا پانچ برس تک صدر منتخب کرا لیا۔ اقتدار کے لیے ان کی ہوس کا یہ عالم تھا کہ ریفرنڈم میں عوام کے سامنے جو سوال رکھا گیا وہ یہ نہیں تھا کہ آپ اگلے پانچ برس کے لیے جنرل ضیاالحق کو ملک کا صدر تسلیم کرتے ہیں یا نہیں بلکہ سوال یہ رکھا گیا کہ کیا آپ اس ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں یا نہیں۔ اب کون کہتا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ اس ملک میں اسلامی نظام کا خواہش مند نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ سب کو معلوم تھا کہ وہ جعلی ریفرنڈم کرا رہے ہیں اور اس کا اسلامی نظام سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے خوف میں مبتلا جنرل ضیا الحق نے انتظامی طاقت کی بنا پر اس ریفرنڈم میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کروائی اور سب لوگوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ بھی ووٹ ڈال سکتے ہیں۔ حالات پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس روز ہر فرد نے تقریباً 10 سے 15 بار ووٹ کا استعمال کیا اور انتظامی مشینری خود لوگوں کو مجبور کرتی رہی کہ وہ بار بار ووٹ ڈالنے کے عمل میں حصہ لیں۔ اس طرح جنرل ضیا الحق عام انتخابات سے قبل ہی اس ملک کے اگلے پانچ برس کے لیے باوردی صدر منتخب ہو گئے۔

جنرل ضیا الحق کی جانب سے 1985ء میں کروائے گئے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں جو اسمبلی بنی، اس میں فوجی سربراہ کو دوبارہ ایک بڑی سیاسی حمایت کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے پیش رو ایوب خان کا راستہ اختیار کیا اور پارلیمنٹ کے اندر سے ایک نئی مسلم لیگ پیدا کی۔ 1985ء کے انتخابات میں منتخب ہونے والے بیشتر ارکان اسمبلی اس نئی مسلم لیگ کا حصہ بن گئے۔ اس طرح مسلم لیگ سے وابستہ افراد نے ایک بار پھر اپنا ماضی کا کردار دہرایا اور خود کو فوجی حکمرانوں کا بغل بچہ ثابت کرتے ہوئے فوجی اقتدار کو تقویت دی۔ البتہ جنرل ضیا الحق نے ایوب خان والی غلطی کو نہیں دہرایا اور اس نئی مسلم لیگ کا خود صدر بننے کی بجائے کسی اور کو یہ ذمہ داری سونپی تاکہ وہ اس عمل میں خود کو متنازع ہونے سے بچا سکیں۔ انتخابات سے قبل جنرل ضیا الحق نے کمال خوب صورتی سے آئین میں ایک ایسی ترمیم کی جس کی رو سے تمام تر اختیارات وزیر اعظم کے مقابلے میں صدر کو منتقل کر دیے گئے۔ چوں کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے تھے، اس لیے کسی جماعت کو اکثریت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ غیر جماعتی اسمبلی میں زیادہ تر لوگ اپنی ذاتی حیثیت میں منتخب ہو کر آئے تھے اور جب صدر نے سندھ کے ایک غیر اہم رہنما محمد خان جونیجو، جن کا نام انہوں نے روحانی پیشوا پیر صاحب پگاڑا سے لیا تھا، کو وزیر اعظم نامزد کیا تو اس غیر جماعتی اسمبلی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انہیں وزیر اعظم منتخب کریں۔ کہا جاتا ہے کہ پیر پگاڑا نے پہلے سندھ سے الٰہی بخش سومرو کا نام وزیر اعظم کے لیے پیش کیا مگر جنرل ضیا الحق نے جب ان سے ملاقات کی تو ان کو اندازہ ہوا کہ سومرو صاحب خاصے سیاسی آدمی ہیں جب کہ ان کو ایک مکمل طور پر غیر سیاسی آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بعد ازاں محمد خان جونیجو کے نام پر اتفاق ہوا۔ جنرل ضیا الحق نے غیر جماعتی انتخابات کرا کے محمد خان جونیجو کو وزیر اعظم تو بنا دیا لیکن ریاستی معاملات چلانے کے لیے انہیں بھی ایک مسلم لیگ کی ضرورت محسوس ہوئی اور محمد خان جونیجو ہی کو اس مسلم لیگ کا نیا سربراہ بنا دیا گیا تاکہ وہ پارٹی اور پارلیمنٹ کے ارکان سب پر اپنی گرفت قائم کر سکیں۔ جنرل ضیا الحق کو اپنی اس اسمبلی پر بہت زیادہ بھروسا نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے اس اسمبلی سے اہم کام یہ کروا لیا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

197ء سے لے کر اس وقت تک کیے گئے تمام اقدامات کو اس غیر جماعتی اسمبلی سے انڈیمنٹی (Indemnity) دلوادی، یعنی اس وقت کے اقدامات کے بارے میں تعزیر سے استثنا حاصل کر لیا تا کہ ان کے اقدامات کو قانونی اور سیاسی تحفظ مل سکے۔ اس حوالے سے انہوں نے ارکان اسمبلی کو رام کرنے یا راضی کرنے کے لیے اپنی پوری ریاستی مشینری کو استعمال کیا اور آئین میں ترمیم کی مدد سے 1985ء میں ملک سے مارشل لاء اٹھالیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ غیر جماعتی اسمبلی کے منتخب وزیراعظم محمد خان جونیجو کی ایک بڑی سیاسی کامیابی تھی۔

محمد خان جونیجو، جنرل ضیاالحق کی مدد سے ایوان وزیراعظم میں داخل ہوئے تھے اور فوجی سربراہ کو یقین تھا کہ وہ ان کے لیے کسی قسم کی مشکلات پیدا نہیں کریں گے مگر جیسے جیسے حالات بدلتے گئے صدر اور وزیراعظم کے درمیان اختیارات کی سرد جنگ کا آغاز ہو گیا کیوں کہ صدر ملک میں عملاً صدارتی نظام کی جانب بڑھنا چاہتے تھے جب کہ وزیراعظم پارلیمانی جمہوری نظام کے حامی تھے۔ بے نظیر بھٹو کی طویل جلاوطنی کے بعد جب 10 اپریل 1986ء کو پاکستان تشریف لائیں تو ان کے آنے میں جہاں جنرل ضیاالحق کی رضامندی اور کچھ معاملات کو طے کرنے کے عوامل کارفرما تھے، وہاں محمد خان جونیجو بھی بے نظیر بھٹو کی پاکستان واپسی کے بڑے حامی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنرل ضیاالحق کو محسوس ہونے لگا تھا کہ وزیراعظم اپنی حد سے باہر نکلتے جا رہے ہیں یا یہ کہہ لیں کہ صدر کی مقرر کردہ یا سوچی گئی حد سے باہر نکلتے جا رہے ہیں اور اپنے آپ کو سیاسی وزیراعظم کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ صدر اور وزیراعظم کے ان اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ وزیراعظم کو صدر کے ہاتھوں اپنی حکومت سمیت پارلیمنٹ کی قربانی دینا پڑی اور سب کا بوریا بستر گول کر دیا گیا۔

ملک میں پھر ایک بار نئے انتخابات کا نعرہ لگایا گیا لیکن انتخابات سے قبل ہی جنرل ضیاالحق طیارہ فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور سینٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان نے قائم مقام صدر اور جنرل اسلم بیگ نے بطور آرمی چیف کے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ فضائی حادثے میں جنرل ضیاالحق کی موت کے فوری بعد انتخابات کا عمل ممکن نہیں ہوگا لیکن اس سوچ کو رد کر دیا گیا اور اسی برس یعنی 1988ء ہی میں عام انتخابات کروائے گئے جس کے نتیجے میں پہلی بار محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ جنرل ضیاالحق کے دور کو دنیا میں اس لحاظ سے اہمیت ملی کہ امریکہ اور روس کے تناظر میں ہونے والی افغان جنگ میں وہ امریکہ کے ایک بڑے اتحادی کے طور پر سامنے آئے۔ امریکہ نے جنرل ضیاالحق کی مکمل سیاسی، انتظامی اور مالی سرپرستی کرتا رہا اور ملک پہلی بار اس افغان جنگ کے تناظر میں جہادی پاکستان کے طور پر دنیا بھر میں متعارف ہوا۔ اسی دور میں جنرل ضیاالحق نے اپنے سیاسی مخالفین بالخصوص پیپلز پارٹی کے لوگوں کو سخت سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا۔ ہزاروں کارکن جیلوں میں ڈالے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے، بہت سوں کو شاہی قلعے کے عقوبت خانوں میں ڈالا گیا اور اس سے زیادہ کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ کئی سو کارکن ریاستی اداروں کے ظلم و تشدد کے ذریعے موت کی نیند سلا دیئے گئے۔ سب سے بڑھ کر جنرل ضیاالحق کے دور میں ہماری سیاسی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا دینا تھا۔ آج جو ہماری سیاست میں تلخیاں اور عدم استحکام کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں بھٹو صاحب کی پھانسی کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت یا مارشل لاء کا چوتھا تجربہ جنرل پرویز مشرف کی صورت میں سامنے آیا، جنہوں نے 12 اکتوبر 1999ء کو اس وقت کی سول منتخب حکومت، جس کے سربراہ نواز شریف تھے، کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنرل پرویز مشرف کا دورِ اقتدار 1999ء سے 2008ء تک برقرار رہا اور انہیں 2008ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کے باعث ایک قومی اور بین الاقوامی سمجھوتے کے بعد اقتدار یا صدارت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ جنرل پرویز مشرف کی رخصتی کی ایک بڑی وجہ نواز شریف اور پرویز مشرف کے مابین پائے جانے والے اختلافات تھے۔ نواز شریف کا پیپلز پارٹی کی حکومت سے تقاضا تھا کہ وہ پرویز مشرف کو رخصت کرے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کرے۔ ان اختلافات میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما تھے، وہیں کارگل کا واقعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے بطور آرمی چیف کارگل کے تناظر میں جو بھی اقدامات کیے، ان میں وزیراعظم نواز شریف کو نہ صرف اعتماد میں نہیں لیا گیا بلکہ ان سے بہت سے معاملات کو چھپایا بھی گیا۔ نواز شریف ان دنوں بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھے جن کے نتیجے میں بھارتی وزیراعظم، پاکستان تشریف لائے تھے اور لاہور میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کے درمیان تعاون اور تعلقات بڑھانے کا معاہدہ بھی ہوا تھا۔ کارگل کے ایڈونچر سے دونوں ملکوں کے مابین تعلقات بڑھانے کا موقع ضائع ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نواز شریف نے بطور وزیراعظم آرمی چیف جنرل پرویز مشرف، جو ان دنوں غیر ملکی دورے پر تھے، کو ان کی عدم موجودگی میں معزول کر کے ان کی جگہ ضیاالدین بٹ کو آرمی چیف تعینات کر دیا تھا۔ اگرچہ نواز شریف کو بطور وزیراعظم، آرمی چیف کو تبدیل کرنے کا قانونی اور آئینی حق حاصل تھا لیکن فوج میں اعلیٰ قیادت نے جنرل پرویز مشرف کی تبدیلی کو قبول نہیں کیا تھا اور نواز شریف کے اس عمل کو فوج کے خلاف بغاوت سمجھا گیا۔ اس کا نتیجہ ایک اور مارشل لاء کی صورت میں قوم کو دیکھنا پڑا۔

نواب زادہ نصراللہ خان، بے نظیر بھٹو، عمران خان سمیت متعدد رہنماؤں نے نواز شریف کی حکومت کے خاتمے کے اس فوجی قدم کو جائز تصور کیا۔ بے نظیر بھٹو نے فوری طور پر جنرل پرویز مشرف کو اپنی سیاسی حمایت کا یقین بھی دلایا، ان کا خیال تھا کہ فوجی سربراہ کے پاس ان سے سیاسی سمجھوتہ کرنے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاوہ اور کوئی انتخاب نہیں ہو گا لیکن جنرل پرویز مشرف کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ انہوں نے نواز شریف اور بے نظیر بھٹو سمیت سب سے دُور رہنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی اس ملک میں اپنے سات نکاتی ایجنڈے کا اعلان کیا جو ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایک لمبی اننگز کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آئے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف ایک سیاسی طاقت ہیں اور وہ فوجی مداخلت پر زوردار انداز میں مزاحمت کریں گے۔ نواز شریف کو یقین تھا کہ وہ دو تہائی اکثریت سے اقتدار پر آئے تھے اور لوگ ان کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئیں گے لیکن عملاً ایسا نہیں ہو سکا۔ نواز شریف نے ایک خاص حد تک ضرور مزاحمت کی لیکن عوام اور جماعتی سطح پر کمزور ردعمل نے بہت جلد ان کو مجبور کر دیا کہ وہ جنرل پرویز مشرف کے ساتھ ایک سیاسی سمجھوتے کے تحت کچھ عرصے کے لیے جلاوطن ہو جائیں۔ جن دنوں نواز شریف جیل میں تھے، ان کی غیر موجودگی میں ان کی اہلیہ کلثوم نواز شریف میدان میں آئیں اور جس طرح سے انہیں پذیرائی ملی اس نے بھی فوجی سربراہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ نواز شریف سے کسی سمجھوتے کی سیاست کریں۔ بین الاقوامی قوتیں، جن میں امریکہ، برطانیہ، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں اور ان کے علاوہ کئی لوگ چاہتے تھے کہ نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ بالآخر ایسا معاہدہ طے پا گیا اور نواز شریف اپنے خاندان سمیت 10 سال کے لیے اپنا ملک چھوڑ کر سعودی عرب منتقل ہو گئے اور وہ وہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے گئے تھے۔ معاہدے میں طے پایا تھا کہ نواز شریف اور ان کے خاندان کے افراد اگلے دس برس تک ملک کی سیاست میں براہ راست حصہ نہیں لیں گے۔ فوجی سربراہ نے کچھ عرصہ بعد مسلم لیگ (ن) کے حمایت یافتہ صدر رفیق تارڑ کی جگہ صدارت کا منصب بھی خود سنبھال لیا اور عدلیہ نے انہیں تین سال تک ملک میں قانون سازی کا بھی اختیار دے دیا۔

جنرل پرویز مشرف نے خود کو مارشل لاء سربراہ کہلوانے کی بجائے ملک کے چیف ایگزیکٹو کے طور پر اپنے آپ کو متعارف کروایا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انہیں بھی ایک جمہوری حکمران کے طور پر دیکھا جائے کیوں کہ وہ ملک میں حقیقی جمہوریت کی مضبوطی کے لیے سامنے آئے ہیں۔ فوجی سربراہ نے نواز شریف اور بے نظیر بھٹو دونوں کی کرپشن کے قصوں کو عام کیا اور ثابت کیا کہ یہ کرپٹ لیڈر مزید سیاست کرنے کے حق دار نہیں اور وہ انہیں دوبارہ موقع نہیں دیں گے کہ وہ اس ملک میں آ کر سیاست کریں۔ ابتدا میں پرویز مشرف کی فوجی مداخلت کو بین الاقوامی سطح پر زیادہ قبولیت نہیں ملی۔ فوجی سربراہ زور دیتے رہتے کہ عالمی برادری، دہشت گردی اور جہاد میں فرق کو سمجھے اور یہ کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں بلکہ جہاد کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن 9/11 کے بعد کا جو عالمی منظر نامہ بنا اور دہشت گردی کے خلاف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالمی سطح پر جو مہم شروع کی گئی، اس نے ساری دنیا کے حالات بدل دیئے اور اس میں پاکستان کو بھی فرنٹ لائن سٹیٹ کے طور پر کردار ادا کرنا پڑا۔ ان حالات میں جنرل پرویز مشرف، سابق فوجی سربراہ جنرل ضیاالحق کی طرح عالمی ضرورت بن گئے تھے اور شاید اسی وجہ سے بعد ازاں انہیں قبول کر لیا گیا تھا۔ بقول جنرل پرویز مشرف، امریکی صدر نے ان کو اس جنگ کا حصہ بننے کے سوا کوئی اور چوائس ہی نہیں دی، ہمیں کہا گیا کہ آپ فوری فیصلہ کریں کہ آپ ہمارے ساتھ ہیں یا نہیں اور نہیں کی صورت میں ہمیں امریکہ کی جانب سے تورا بورا میں تبدیل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔

قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ نے اکثر فوجی سربراہوں اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کی اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ جنرل پرویز مشرف نے مسلم لیگ (ن) کے ارکان توڑ کر مسلم لیگ قائداعظم تشکیل دی جو مسلم لیگ ق کے نام سے معروف ہے۔ چوں کہ نواز شریف ایک معاہدے کے تحت طویل عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے تھے، اس لیے ان کے ساتھ شامل بہت سے مسلم لیگیوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ سرکاری مسلم لیگ کا حصہ بن کر جنرل پرویز مشرف کی سیاست کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ غالباً ایسا کرنے والوں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اقتدار میں تو رہیں گے۔ اس توڑ پھوڑ اور نواز شریف کی غیر موجودگی کے باوجود مسلم لیگ (ن) نے اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھا اور شریف برادران کی واپسی کے بعد انہیں سیاست میں اچھی خاصی کامیابی ملی۔ چوہدری برادران، جو نواز شریف کی پارٹی میں ایک اہم کردار تھے اور جن کا پنجاب کی دیہی سیاست میں بہت مضبوط کنٹرول تھا، جنرل مشرف کے اہم اتحادی بن گئے اور پانچ سال سے زیادہ عرصے تک برسر اقتدار رہے۔

جنرل پرویز مشرف نے اپنے پیش رو ایوب خان اور جنرل ضیاالحق کی طرح مقامی سیاست سے ہی اپنے پتے کھیلنے کا آغاز کیا اور ملک میں مقامی حکومتوں کا نیا نظام متعارف کرایا۔ یوں ملک میں پہلی بار کسی فوجی سربراہ کی جانب سے اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی اور مقامی کونسلوں کے مقابلے میں مقامی حکومتوں کے نظام کی تشکیل تھیں۔ اسی نظام کے تحت مقامی سطح پر عوامی نمائندوں کی تعداد میں ماضی کے مقابلے میں کافی اضافہ کیا گیا جن میں خواتین، کسانوں، مزدوروں اور اقلیتوں کی نشستیں بھی شامل تھیں۔ اس نظام نے مقامی سطح پر ایک نئی سیاسی ہلچل پیدا کر دی اور کافی لوگ فوجی سربراہ کی مقامی سیاست کا حصہ بن گئے۔ وہ جماعتیں جو جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت کی مخالف تھیں، جن میں پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، جماعت اسلامی سرفہرست ہیں، وہ بھی ان مقامی انتخابات سے خود کو علیحدہ نہ رکھ سکیں اور انہوں نے کسی نہ کسی حد تک اس بنیادی سطح کی سیاست میں حصہ لیا۔ 01-2000ء میں اس نئے نظام کے تحت ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں پورے ملک میں ضلع، تحصیل، ٹاؤن کونسلوں اور یونین کونسلوں کی سطح پر ایک نئی سیاسی قیادت سامنے آئی اور جنرل پرویز مشرف نے اسے اپنی نئی سیاسی طاقت قرار دیا۔ ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقامی حکومتوں کی مدد سے جنرل پرویز مشرف نے 2002ء میں اپنے حق میں ایک عوامی ریفرنڈم بھی کرایا اور یہ مقامی حکومتیں ان کی حمایت میں پیش پیش تھیں۔

جنرل پرویز مشرف نے 2002 ہی میں پہلی بار عام انتخابات کرانے کا بھی فیصلہ کیا۔ ان انتخابات میں فوجی حکومت کی تشکیل کردہ مسلم لیگ (ق) نے عددی طور پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف، پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ق دونوں جماعتوں کی مدد سے حکومت سازی کرنا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم کے لیے اپنی جانب سے مخدوم امین فہیم کو نامزد کر دیں تاکہ مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت بن جائے لیکن بے نظیر بھٹو اس کے لیے تیار نہیں تھیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی جگہ کسی اور کو وزیراعظم نامزد کرنا ہی نہیں تھا۔ مخدوم امین فہیم بھی بے نظیر بھٹو کی رضامندی کے بغیر فوجی حکومت کا حصہ بننے کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے انکار کر دیا۔ اس بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی سربراہ نے پیپلز پارٹی میں سے پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کی تشکیل دی جس میں مخدوم فیصل صالح حیات، ڈاکٹر شیر افگن، آفتاب شیر پاؤ جیسے لوگ شامل تھے۔ مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کی مدد سے مرکزی حکومت تشکیل دی گئی اور میر ظفر اللہ جمالی ملک کے نئے وزیراعظم منتخب ہوئے۔ پیپلز پارٹی نے حزب اختلاف میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور مخدوم امین فہیم حزب اختلاف کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ (ن)، جو 1997ء کے انتخابات میں دو تہائی اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی نواز شریف کی عدم موجودگی میں محض 14 نشستوں پر کامیاب ہو سکی۔ جنرل پرویز مشرف کا وضع کردہ سیاسی نظام شروع ہی سے ناکام رہا اور سیاسی نظام میں موجود تضادات کے باعث تین بار وزیراعظم کو تبدیل کرنا پڑا۔ ظفر اللہ جمالی کے بعد 45 دنوں کے لیے چودھری شجاعت حسین وزیراعظم بنائے گئے اور بعد میں شوکت عزیز، جو قبل ازیں اسی حکومت میں وزیر خزانہ کے طور پر کام کر رہے تھے، کو وزیراعظم منتخب کر لیا گیا۔ مسلم لیگ (ق) کے سربراہ اگرچہ چودھری شجاعت حسین تھے لیکن عملاً پارٹی پرویز مشرف کے کنٹرول میں رہی۔ اسی دوران پرویز مشرف نے سردار فاروق لغاری اور پیٹریاٹ کو مسلم لیگ (ق) میں ضم کر دیا تاکہ پارٹی کو مضبوط بنایا جا سکے۔

نواز شریف اور بے نظیر بھٹو، جو جنرل پرویز مشرف کے سیاسی عتاب کا شکار تھے، نے ان کے خلاف ایک بڑی سیاسی چال چلی جو میثاقِ جمہوریت کے معاہدے کی صورت میں سامنے آئی۔ یہ معاہدہ دراصل بے نظیر بھٹو کے ذہن کی کاوش تھی اور اس میں نواز شریف کو شامل کر کے وہ پرویز مشرف پر اپنا سیاسی دباؤ بڑھانا چاہتی تھیں، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔ ان دونوں بڑے سیاسی رہنماؤں کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد ملک کی سیاست میں دوبارہ سرگرم حصہ لیں لیکن جنرل پرویز مشرف اس میں رکاوٹ بنے رہے۔ اسی دوران میں پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان بعض بین الاقوامی قوتوں کی مدد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے این آر او کا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے تحت پہلے بے نظیر بھٹو اور بعد میں نواز شریف کی وطن واپسی کا راستہ ہموار ہوا۔ قبل ازیں نواز شریف اور شہباز شریف نے از خود وطن واپس آنے کا فیصلہ کیا لیکن ان کو زبردستی دوبارہ جلاوطن کر دیا گیا۔ نواز شریف اس بات پر مصر تھے کہ انہوں نے پرویز مشرف کے ساتھ دس سال کا کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اسی دوران میں سعودی عرب کے ملٹری ایجنسی کے سربراہ اور لبنان کے رفیق حریری نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کی اور وہ تمام تحریری ثبوت پیش کیے جن کے تحت نواز شریف، فوجی سربراہ سے ایک معاہدے کے تحت دس برس کے لیے سیاست اور ملک سے دربدر ہوئے۔ اس عمل نے نواز شریف کے سیاسی مقدمے کو کافی کمزور کیا اور نواز شریف کو کہنا پڑا کہ معاہدہ پانچ برس کا تھا جب کہ ان سے زبردستی دس برس پر دستخط کروائے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور بے نظیر بھٹو کے درمیان جو سیاسی ڈیل ہوئی تھی، اس کے تحت جنرل مشرف عام انتخابات میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ق) کی مخلوط حکومت بنانے کے حق میں تھے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ق) دونوں میں اس اشتراک پر تحفظات تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسی ڈیل کے تحت بے نظیر بھٹو نے عام انتخابات 08-2007ء کے بعد ملک آنا تھا لیکن وہ انتخابات سے قبل ہی وطن واپس آ گئیں اور اس کھیل میں نواز شریف کی ملک میں آمد بھی جنرل مشرف کی سیاسی مجبوری بن گئی تھی۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی وطن آمد سے قبل جنرل پرویز مشرف کے لیے ایک بڑا بحران عدالتی تناظر میں آیا جب چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس افتخار محمد چودھری نے ان کے دباؤ میں نہ آتے ہوئے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ صدر پرویز مشرف نے انہیں معطل کیا لیکن عدلیہ نے انہیں بحال کر دیا جس کے چار ماہ بعد پرویز مشرف نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے متعدد ججوں کو معزول کر دیا۔ چیف جسٹس اور دیگر ججوں کی برطرفی کو سیاسی طور پر قبول کرنے کی بجائے وکلا نے اس کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کر دی۔ اسی دوران حکومت اور میڈیا کے تعلقات بھی خراب ہوئے جب کہ لال مسجد کے سانحے، نواب اکبر بگٹی کے قتل اور بعض دیگر اقدامات نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا جس سے فوجی سربراہ کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ دوسری جانب جنرل مشرف، جو ایک وقت میں بین الاقوامی اور بالخصوص امریکی سیاسی ضرورت تھے، ان کے بارے میں عالمی سطح پر یہ تاثر قائم ہو گیا کہ وہ امریکہ کے ساتھ دوہری پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں اور جہادی تنظیموں کو فوج اور آئی ایس آئی کی طرح اپنا سٹریٹجک اثاثہ سمجھتے ہیں۔ ان سارے معاملات نے پرویز مشرف کی ساکھ کو کافی متاثر کیا اور انہیں آرمی چیف کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں عام انتخابات کا وقت قریب آ گیا اور جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ پرویز مشرف سے کیے گئے وعدے کے برخلاف بے نظیر بھٹو وطن واپس آ گئیں لیکن انتخابات سے قبل انہیں قتل کر دیا گیا۔ یوں ملک کا سارا سیاسی منظر ہی بدل گیا۔ اس سے پہلے جب محترمہ وطن واپس تشریف لائیں تو اسی روز ان سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتخابی جلوس میں بھی بم دھماکا ہوا جس کا مقصد انہیں قتل کرنا تھا۔ بے نظیر بھٹو نے کراچی واپسی پر اپنے اوپر ہونے والے اس قاتلانہ حملے کے بعد نشاندہی کی تھی کہ گران کو ختم کیا گیا تو اس میں جنرل پرویز مشرف اور چوہدری پرویز الٰہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس سانحے کے بعد عام خیال یہ تھا کہ عام انتخابات لمبے عرصے کے لیے ملتوی ہو جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اور ڈیڑھ ماہ کی تاخیر سے فروری 2008ء میں ملک بھر میں قومی اور صوبائی نشستوں کے لیے عام انتخابات کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان انتخابات سے قبل نواز شریف، جنرل مشرف کی نگرانی میں کوئی انتخاب قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن بے نظیر بھٹو کے اصرار پر وہ راضی ہو گئے لیکن جب بے نظیر بھٹو کو ایک سازش کے تحت قتل کر دیا گیا تو انہوں نے ایک بار پھر انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیا لیکن پیپلز پارٹی کے شریک چیئرپرسن آصف علی زرداری اور کچھ بین الاقوامی قوتوں کے اصرار پر وہ ایک بار پھر انتخابات میں حصہ لینے پر راضی ہو گئے۔ ان کے اس فیصلے پر ان کے اے پی ڈی ایم کے اتحادی ان سے ناراض ہو گئے اور وہ انتخابات کے بائیکاٹ کے اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ جنرل مشرف نے عام انتخابات 2008ء سے قبل خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے 2002ء میں بننے والی اسمبلی سے ہی دوبارہ پانچ برس کے لیے اپنے آپ کو صدر منتخب کرا لیا اور فوجی وردی اتار کر سویلین صدر بن گئے۔

فروری 2008 میں ہونے والے انتخابات کے نتائج جنرل پرویز مشرف کے لیے ایک بڑا چیلنج بن کر سامنے آئے۔ ان کی مسلم لیگ ق کی ناکامی اور پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کی کامیابی نے نہیں کافی مایوس کیا، خاص طور پر نواز شریف کی شان دار کامیابی نے ان کی سیاسی مشکلات میں بے پناہ اضافہ کر دیا کیوں کہ نواز شریف انتخابات کے وقت سے وکلا تحریک میں پیش پیش تھے اور ججوں کی بحالی کے حق میں تھے۔ انتخابات کے بعد پہلے وہ مرکزی حکومت کا حصہ بنے لیکن چیف جسٹس کی بحالی کے حوالے سے اپنی بات نہ منوا سکنے پر مسلم لیگ ن نے مرکزی وزارتوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک میں پیش پیش رہے اور صدر زرداری کی مشکلات میں بھی اضافہ کرتے رہے۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں جنرل (ر) پرویز مشرف کو صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری ملک کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔ اس طرح جنرل پرویز مشرف کا دور اختتام پذیر ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک میں فوجی مارشل لاء کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ تو اس کا ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ اس ملک میں اگر گزشتہ چونسٹھ برسوں میں جمہوریت پنپ نہیں سکی تو اس کی وجہ یہ فوجی حکومتیں ہی تھیں۔ جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء نے اس ملک کے اندر فرقہ واریت، لسانی سیاست سمیت اسلحہ کی سیاست کو عام کیا۔ افغان جنگ نے ملک میں سیاسی قوتوں کے مقابلے میں جہادی قوتوں کو مضبوط کیا۔ معاشرہ فکری لحاظ سے انحطاط پذیر ہوا اور سیاسی، سماجی اداروں سمیت طلبہ، مزدوروں اور خواتین کی تنظیموں پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ کوشش کی گئی کہ اس ملک میں سیاسی جماعتوں کے مقابلے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ایسے لوگوں کو سامنے لایا جائے جو ریاست اور فوج کی سیاست کے علمبردار ہوں۔ جمہوری ادارے عوام کو جواب دہ ہونے کی بجائے ریاستی اداروں کو جواب دہ بن گئے جس سے ملک کا جمہوری تشخص بھی طرح متاثر ہوا۔

معروف تاریخ دان اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے ایک مضمون ''مارشل لاء کے سماج پر اثرات'' جو انہی کی زیر ادارت شائع ہونے والے سہ ماہی ''تاریخ'' کے شمارہ 39 میں شائع ہوا، کے صفحہ 128-127 میں لکھا ہے:

> ''ہر آمر اپنے سیاسی استحکام کے لیے ایک نیا سیاسی نظام تشکیل دیتا ہے، جیسے ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کو متعارف کروایا تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنے اقتدار کو مستحکم کر سکیں، ضیاالحق نے معاشرے کو اسلامی بنانے کی کوشش کی جب کہ پرویز مشرف نے اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا نعرہ لگایا لیکن آمرانہ حکومتوں میں تبدیلی کا عمل اوپر سے ہوتا ہے جس میں لوگوں کی شمولیت نہیں ہوتی اور نہ ہی لوگوں کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آمر کے ساتھ ہی اس کا وژن بھی رخصت ہو جاتا ہے اور اس کو بروئے کار لانے میں جو وسائل خرچ ہوتے ہیں، وہ سب ضائع جاتے ہیں۔ آمرانہ حکومت کی یہی خرابی ہوتی ہے کہ اس میں ریاست اور اس کے ادارے عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے آمر کی شخصیت کو ابھارنے اور اس کی حفاظت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ آمر کی ذات میں تمام اختیارات مرتکز ہو جاتے ہیں، اس لیے لوگوں کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ وہی ملک کے حالات کو سنبھال سکتا ہے اور اسے بحرانوں سے نکال سکتا ہے۔ اس کا اثر لوگوں کی نفسیات پر یہ ہوتا ہے کہ وہ جمہوری اداروں اور ان کی کارکردگی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور آمر کی شخصیت میں انہیں مسیحا نظر آنے لگتا ہے۔''

ڈاکٹر مبارک علی کا تجزیہ سو فیصد درست ہے کیوں کہ ان مارشل لاؤں نے اس ملک میں ہر اس فکر کو کچلنے کی کوشش کی ہے جو ان کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ انہی مارشل لاء اور فوجی حکمرانوں نے اہل دانش میں ایک ایسا قصیدہ گو طبقہ پیدا کیا، جو ان کے ہر اقدامات کا سیاسی جواز اپنی نام نہاد دانشوری میں قوم کے سامنے پیش کرتا رہا۔ فوجی قیادت اس کے بدلے میں ان نام نہاد دانش وروں کو خصوصی مراعات دیتی رہی جب کہ یہ سارا عمل ملک اور قوم کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوج کی حکمرانی اور تضادات پر مبنی فکری مغالطہ

پاکستان میں فوج کے سیاسی کردار کے تناظر میں ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ فوج کی جانب سے اپنے کردار کو اپنی پیشہ ورانہ مہارتوں تک محدود رکھنے کی بجائے سول معاملات میں مسلسل مداخلت اور براہِ راست سول حکومتوں کو برخاست کر کے اقتدار پر کنٹرول کرنے کی روش نے ملکی سیاسیات پر اچھے اثرات مرتب نہیں کیے۔ فوج کے اس طرزِ عمل نے ملک میں سیاسی اور جمہوری کلچر کو پنپنے نہیں دیا اور نہ ہی یہاں سیاسی و انتظامی اداروں کی مضبوطی کی کوئی صورتِ حال پیدا ہو سکی۔ یہ عمل محض سیاست تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے براہ راست سماجی، معاشرتی اور معاشی معاملات میں زوال پذیری کے اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ آج پاکستان کی عالمی برادری میں جو صورت حال ہے، اس میں فوجی حکمرانی کے کردار کو کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ماضی میں فوج کے سیاسی کردار پر تنقید کے معاملات خاصے محدود تھے اور جو لوگ فوج کے کردار پر تنقید کرتے تھے انہیں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا، یہاں تک کہ ان تنقید کرنے والے لوگوں کی حب الوطنی کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان میں سے بہت سے لوگوں پر وطن دشمنی کے مقدمے بھی بنائے گئے۔ حالاں کہ بہت سے لوگوں کی تنقید فوج کے مجموعی کردار پر نہیں بلکہ اس کے سیاسی کردار تک محدود ہوتی تھی، جس کے باعث ہماری سیاست عملاً یرغمالی کا منظر پیش کرتی رہی لیکن اس پر لب کشائی کی اجازت نہیں تھی اور ملک میں اس زمانے میں سچ بات کرنا بھی دشوار تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ سوچ میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور ماضی میں جو تنقید محدود تھی، اب اس کا کینوس خاصا وسیع ہوتا گیا۔ اس کی ایک وجہ جہاں لوگوں میں کچھ سیاسی شعور کا پیدا ہونا اور بڑھنا ہے، وہیں فوجی حکومتوں کا بار بار ناکام ہونا بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ اسی طرح نئی صدی کے آغاز میں میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے آنے کے بعد یہ سوال زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ ہمیں فوجی حکمرانی اور سول حکمرانی میں سے کس کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ایک زمانے میں جب ہم سکولوں میں پڑھتے تھے تو ہمیں اپنے اساتذہ سے یہی سبق ملتا تھا کہ اس ملک میں اگر کوئی سب سے منظم اور محبِ وطن ادارہ ہے تو وہ فوج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوجوان بھی فوج کو دیکھ کر سلیوٹ کرنا پسند کرتے تھے اور فوج کا ایک مجموعی تاثر مثبت انداز میں سامنے آیا۔

تاہم قومی سطح پر سیاسی شعور بڑھنے کے بعد یہ احساس زیادہ مضبوط ہوا کہ اگر اس ملک کا سب سے بڑا اور منظم و محب وطن ادارہ خود ہی غیر آئینی اقدامات کرے یا سیاسی معاملات میں مداخلت کرے تو اسے کیا نام دیا جائے۔ ہر فوجی سربراہ اپنا حلف اٹھاتے ہوئے اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کے دوران کسی بھی طرح سیاسی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ کھیل محض دستور تک ہی محدود رہا اور ہمارا آئین جس طرح سیاست دانوں کے ہاتھوں پامال ہوتا رہا، اسی طرح ہماری آمروں نے بھی اسے موم کی ناک بنائے رکھا۔

معروف مصنف سٹیفن پی کوہن اپنی کتاب ''پاکستان آرمی---- تاریخ و تنظیم'' میں شامل باب ''آرمی، سیاست اور جنگ کی بلند تر جہت'' میں لکھتے ہیں:

> ''کچھ بری افواج اپنی قوم کی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں اور کچھ معاشرے میں اپنے مقام کا تحفظ کرتی ہیں اور بعض کسی مقصد یا تصور کا دفاع کرتی ہیں۔ پاکستان کی بری فوج تینوں کام کرتی ہے۔ جس روز سے پاکستان وجود میں آیا ہے، یہ داخلی امن وامان کے قیام میں مدد دینے اور پاکستان کی قابل نفوذ اور اکثر غیر واضح سرحدوں کے تحفظ میں مصروف رہی ہیں۔ اس عرصے میں اس نے پاکستان میں اپنی طاقت اور خاص مقام حاصل کر کے اپنے لیے کافی ہتھیاروں، وسائل اور افرادی قوت کی فراہمی یقینی بنالی ہے۔ مزید براں اس نے خود کو ہمیشہ تصور پاکستان کا خاص اظہار تصور کیا ہے اور چند افسران اس نقطہ نظر کے بھی حامی ہیں کہ معاشرہ جہاں فوج کے مقررہ معیار سے نیچے گرے، اس کی اصلاح یا درستی میں بھی یہ فعال کردار ادا کرے۔''

پاکستان کی سیاست میں جہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہاں ایک تبدیلی فوج کے سیاسی کردار کے بارے میں بھی ہے۔ اب آپ کو ایسے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد ملے گی جو سمجھتے ہیں کہ فوج کا یہ کردار ہر صورت میں ختم ہونا چاہیے۔ پاکستان میں جن لوگوں نے فوج کے کندھوں پر بیٹھ کر سیاست کی اور ہر دور میں فوجی حکمرانی کے سیاسی جواز پیش کرتے رہے، اب وہ بھی فوجی حکمرانی کے خلاف نظر آتے ہیں۔ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے ماضی کے قائدین بے نظیر بھٹو اور نواز شریف، جو کئی بار فوجی حمایت کے ساتھ اقتدار میں آئے، انہوں نے بھی فوج کے برسر اقتدار آنے یا سیاسی معاملات میں غلبہ اختیار کرنے کی مخالفت کی۔ یہ ردعمل پاکستان کی سیاست میں اس لحاظ سے ضرور خوش آئند ہے کہ اب سیاسی معاملات میں ناکامی کی اصل وجوہات کو سامنے رکھ کر بات کی جانے لگی ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران سیاست میں موجود ایجنڈے میں اس نقطے، یعنی فوج کی حکمرانی کو قبول نہ کرنے کے رجحان کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصی اہمیت ملی ہے اور اس پر سیاسی دھڑے بندیاں منظم ہوئی ہیں۔ اس مضبوط آواز نے اس خیال کو پیش کیا ہے کہ فوج کے سیاسی کردار کا خاتمہ ایک حقیقی جمہوریت کی تشکیل کے لیے بنیادی شرط ہے۔ اگرچہ اس ایجنڈے میں اب بھی بہت سے تضادات موجود ہیں لیکن اس نعرے نے ایک پاپولر سیاست کا رخ بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً مرحومہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان ہونے والا میثاق جمہوریت اور اس میں اس بات کا عہد کہ وہ آئندہ فوجی حکمرانی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے، ایک خوش آئند پیش رفت تھی۔ اگرچہ اس معاہدے کی کسی حد تک پاسداری کے باوجود ہمیں ان دونوں رہنماؤں کے طرزِ عمل پر کئی طرح کے تضادات نظر آئے لیکن ان باتوں کے باوجود ان کا تحریری معاہدہ کرنا اور فوج کے کردار کے خاتمے کی بات کرنا اہم تھا۔

فوج کے سیاسی کردار پر ایک بڑی اور واضح تنقید یہ بھی ہے کہ فوج نے جب بھی سیاسی معاملات میں مداخلت کی تو اسے یہاں کی سیاسی اشرافیہ نے محض ایک وقتی ضرورت کے تحت لیا۔ اس طبقہ کا خیال تھا کہ فوج کا ردِعمل وقتی ضرورت کے تحت ہے اور فوج جلد انتخابات کے عمل کو یقینی بنا کر اقتدار سول حکومت یعنی عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کر کے بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ مگر حالات کے تجزیے سے ثابت کیا کہ ہمیشہ فوج کی آمد محض حادثاتی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ اس میں اس کا شعوری اقدام شامل ہوتا ہے بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرنے کا باعث بھی بنتی ہے کہ اسے اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے کا جواز مل جائے۔ یہ بات بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ فوجی حکمرانی ایک طویل ترین اقتدار کا حصہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایوب خان، ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف کے ادوار کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو کئی کئی برسوں تک برسر اقتدار رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 2002ء میں قائم ہونے والی قومی اسمبلی میں مسلم لیگ (ن) کے ایک رکن اسمبلی، جو خود جنرل ضیاالحق کی سیاست کے حامی رہے، نے ایک زوردار تقریر میں کہا کہ وہ برملا ماضی میں کی جانے والی غلطیوں اور فوج کی حمایت پر سب سے معافی مانگتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ملک میں فوجی جرنیلوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور اگر جرنیل یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فیوڈل لارڈز ہیں اور سیاسی و سویلین لوگ ان کے مزارعے ہیں، تو وہ ان فیوڈل لارڈز کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتے ہیں تاکہ ان سے اپنے حقوق حاصل کر سکیں۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان پر فوج کی حکومت برقرار رہنا ہماری پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے اور یہ ملک صرف مسلح افواج کے لیے ویلفیئر سٹیٹ ہے جب کہ عام لوگوں کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح مسلم لیگ (ن) کے اہم رہنما مخدوم جاوید ہاشمی، جو جنرل ضیاالحق کے دور میں قومی سیاست کا حصہ بنے، نے بھی جنرل پرویز مشرف کی فوجی آمریت کے خلاف قید و بند کی صعوبتوں سمیت بے پناہ ریاستی تشدد برداشت کیا اور وہ کئی سال تک نظر بند رہے۔ یہی حال پیپلز پارٹی کے رہنما اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا بھی ہوا،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنہوں نے جیل بھی کاٹی۔ ان دونوں رہنماؤں نے فوجی حکمرانی سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے جیل اور مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ انفرادی سطح بہت سی سیاسی جماعتوں میں ایسے لوگ شامل ہیں جو فوج کی حکمرانی کے بالکل خلاف ہیں اور اس کا اظہار بھی وہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

لیکن یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ ہمارا یہ پاپولر ایجنڈا، یعنی سیاست میں فوج کا کردار ختم ہونا چاہیے، محض انفرادی سطح تک ہی محدود رہا اور یہ سوچ ہماری سیاسی جماعتوں کا ایک مجموعی ایجنڈا نہیں بن سکی۔ مثلاً مسلم لیگ (ن)، جو خود ایک فوجی حکمران جنرل ضیاالحق کی پیداوار تھی لیکن اس نے بعد میں جمہوری کردار بھی ادا کیا اور جنرل پرویز مشرف کے خلاف اس کی مزاحمت کو ضرور اہمیت دی جانی چاہیے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ بدقسمتی سے مسلم لیگ (ن) کی فوجی حکمرانی کے خلاف مزاحمت کا مجموعی انداز محض جنرل پرویز مشرف تک محدود رہا اور مسلم لیگ (ن) کے بیشتر لوگ جس شدت کے ساتھ جنرل مشرف کے دور میں فوجی حکمرانی کے خلاف بولتے تھے، ان کے جانے کے بعد اس میں کمی آئی ہے۔ یہ باتیں بھی ریکارڈ پر ہیں کہ میاں نواز شریف کے بھائی شہباز شریف اور مسلم لیگ (ن) کے اہم رہنما چودھری نثار علی رات کی تاریکی میں فوج کی قیادت یعنی جنرل اشفاق پرویز کیانی سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ میں ہمیشہ یہ بات کہتا رہا ہوں کہ نواز شریف نے بڑی جرأت کے ساتھ جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت کے خلاف مزاحمت کی لیکن فوجی حکمرانی کے خلاف ان کا اصل امتحان جنرل پرویز مشرف کی رخصتی کے بعد شروع ہوگا کیوں کہ بعض اوقات ہماری فوجی جرنیلوں سے مخالفت فوج کی حکمرانی کے خلاف ہونے کے مقابلے میں افراد کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی جس شدت کے ساتھ نواز شریف، جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکمرانی کے خلاف رہے ہیں اس کا اظہار وہ جنرل ضیاالحق کے بارے میں نہیں کرتے اور آج بھی ان کے اندر ان کے بارے میں ایک نرم گوشہ موجود ہے۔

فوج کی حکمرانی کے بارے میں تضاد کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سیاست دان جانتے ہیں کہ ان کی خواہش کے باوجود فوج پاکستانی سیاست کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور ان کا کردار اب بھی اتنا کمزور نہیں کہ ہم اپنی سیاست کی الگ بساط بچھا سکیں۔ معروف امریکی دانشور سٹیفن کوہن نے اپنی کتاب "Army and Idea of Pakistan" میں اس خیال کو زور دے کر پیش کیا ہے کہ پاکستان میں فوج ایک بڑی سیاسی طاقت ہے۔ اگلے بیس برسوں میں بھی اس کے کردار کو محدود کرنے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ جنرل پرویز مشرف کی رخصتی کے بعد لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ملک میں ایک نئی جمہوریت سامنے آئی ہے اور لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ جو جمہوریت انہیں 2008ء میں ہونے والے انتخابات کے تناظر میں ملی ہے وہ فوجی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کا نتیجہ ہے لیکن سب نے دیکھا کہ یہ جمہوریت ہمیں 2008ء کے انتخابات کے نتیجے میں ملی، وہ بھی فوج ہی کی مرہون منت تھی اور جو بھی اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وقت ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی سیاست ہوئی اس میں فوجی قیادت بھی شامل تھی۔ آج جب ملک میں جمہوریت ہے تو یہ فوجی سائے کے تلے ہے اور خود ہمارا آج کا موجودہ جمہوری حکمران طبقہ یہ بات بار بار کہتا ہے کہ ہمیں جو جمہوریت ملی ہے، وہ جنرل اشفاق پرویز کیانی اور فوج کی بدولت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سارے عمل میں عوام کہاں ہیں اور کیوں ان کو نظر انداز کر کے ہم جمہوریت کی کامیابی کو مخالف طبقوں سے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔

دراصل تضاد سیاست دانوں میں نہیں بلکہ عام لوگوں میں ہے جو حکمرانوں کے خوب صورت نعروں کی سیاست کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو جمہوریت انہیں ملی ہے، وہ انہی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ امریکی دانشور سٹیفن کوہن نے اپنی کتاب "Army and Idea of Pakistan" میں صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ پاکستان ایک مشکل ملک ہے اور فوجی جرنیل اس کو چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے بقول اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی فوج اور اس کی بیوروکریسی عبوری طور پر ملک کا انتظام تو سنبھال سکتی ہے مگر ملک کو چلانا ان کے لیے ممکن نہیں کیوں کہ ملٹری اکیڈمی اور سٹاف کالج یا دیگر فوجی سکولوں میں جو نیلوں کو ملک چلانے کی کوئی عملی تربیت نہیں دی جاتی۔ ان کالجوں اور فوجی اداروں کی تربیت سے وہ اچھے منیجر تو ثابت ہو سکتے ہیں مگر ملکی معاملات چلانے کے اہل نہیں۔ ان کے بقول، حالات میں بہتری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اہل سیاست کو سیاست کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ دلچسپ بات یہ ہے سٹیفن کوہن، فوج کے محدود سیاسی کردار کے حامی ہیں اور نیشنل سکیورٹی کونسل کو اس کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ سٹیفن کوہن کا یہ تضاد سمجھ سے بالاتر ہے کیوں کہ وہ ہمارے اندرونی حالات کا ادراک نہیں رکھتے۔ وہ یہ بھول رہے ہیں کہ فوج کا یہ محدود کردار دراصل لامحدود اختیارات اور فردِ واحد کی حکمرانی کو تقویت دینے کا باعث بنتا ہے۔

جنرل پرویز مشرف نے بھی اپنے دورِ اقتدار میں نیشنل سکیورٹی کونسل بنائی تھی اور اس میں یہی دلیل پیش کی گئی کہ سول اور ملٹری تعلقات میں جو کشیدگی ہے اس کو کم کیا جائے لیکن یہ تجربہ بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو سیاسی اشرافیہ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں اور یہ رائے دیتے ہیں کہ ہمارے معروضی حالات میں فوج کو باہر نکال کر ہم کوئی سیاسی نظام نہیں چلا سکیں گے۔ اس لیے وہ بھی سٹیفن کوہن کی طرح فوج کے محدود سیاسی اختیارات کے حامی ہیں لیکن اس کی شکل جو وہ نیشنل سکیورٹی کونسل کی دیتے ہیں، وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قومی اسمبلی میں دفاعی امور کی سٹینڈنگ کمیٹی ہے اور اس میں دفاع سے متعلق تمام امور زیرِ بحث آ سکتے ہیں اور یہ کمیٹی پارلیمنٹ کی بالادستی کے پہلو کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ اس کی موجودگی میں نیشنل سکیورٹی کونسل کی باتیں فوج ہی کو مضبوط بنانے کی طرف جاتی ہیں جس سے گریز کیا جانا چاہیے۔ ممتاز دانشور اور سابق سیکریٹری داخلہ روئیداد خان کا مؤقف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی یہی ہے کہ فوج اور بیوروکریسی کو حکومت یا سیاست کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے اور ان کے بقول اس مسئلے کا حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فوج کو بیرکوں میں بھیج کر اس کے سیاسی کردار کو ختم نہیں کیا جاتا۔ یہ تجویز کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے کہ نیشنل سکیورٹی کونسل، جس کی ہیئت میں زیادہ تعداد عسکری حکام اور بیوروکریسی کی ہوگی، میں سیاسی قیادت بالخصوص وزیراعظم کو کلیدی حیثیت حاصل ہوگی۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ فوج کے سیاسی کردار کے بارے میں معاشرے کے اندر مکمل یکسوئی نہیں تو یہ غلط نہیں، ہمارے بعض اہل دانش نئی نئی باتیں کر کے اور تجاویز دے کر اس سلسلے میں کنفیوژن پھیلاتے ہیں، بالخصوص ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے بعض دانشور شعوری یا لاشعوری طور پر جو کچھ لکھتے یا کہتے ہیں، وہ جمہوریت کو کمزور کرنے کا سبب بنتا ہے۔ آج بھی ہمارے ٹی وی چینلز پر فوج کے کردار کو مضبوط بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فوج کی وجہ سے ہم ایک محفوظ ملک ہیں۔ یہ بات غلط نہیں ہے لیکن اس سے سیاسی نظام کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ آج بھی اگر فوجی حکمران دوبارہ اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیں تو آپ کو اشرافیہ ہی کے گروپوں میں سے ایسے لوگ ملیں گے جو ان کی حمایت میں پیش پیش ہوں گے۔ فوج کے بار بار برسر اقتدار آنے کی وجہ جہاں ان کا اپنا مربوط نظام ہے، وہیں ہماری سیاسی قیادتوں کی ناکامی بھی ہے جو ترپسٹھ چونسٹھ برس کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود کوئی ایسا مشترکہ لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکیں جس سے جمہوریت کو کامیاب بنایا جا سکے تاکہ فوج اقتدار سے دور رہے۔ فوجی حلقے یہ سوچ بھی رکھ سکتے ہیں کہ جب سیاسی قیادتیں اقتدار کے حصول کے لیے ان کی طرف دیکھتی ہیں اور ان کی مدد سے اقتدار میں آتی ہیں تو ان کی جانب سے مزاحمت کی باتیں محض لوگوں کو دکھانے کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے پس پردہ یہ ہمارے ہی لوگ ہیں اور ہماری سیاست کے تابع رہ کر سیاست کرنا ان کی مجبوری ہے۔

ممتاز دانشور اکمل خان، جو بائیں بازو کے حلقوں میں سیاست کے حوالے سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، نے اپنی کتاب ''پاکستان کی اصل کہانی'' میں فوج کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ درست بات لکھی ہے:

> ''پاکستان کے اندر فوجی مداخلتوں اور ان آمریتوں کی وحشت و بربریت کی تائید وحمایت کے لیے پیش کیے جانے والے دلائل صرف بے معنی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ایسی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں جو کہ مرحلہ وار انقلاب کے نظریے کے پنجرے میں قید ہے۔ یعنی یہ فوج کے لیے لازمی ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ حکمرانی کو یقینی بنائے۔ جب بھی کبھی مروجہ قانونی طریقوں سے یہ حکمرانی کرنا محال و مشکل ہو جائے تو پھر ایسی کیفیت میں فوج کو یہ فریضہ مختلف اور غیر معمولی انداز میں سرانجام دینے کی کوشش کرنا پڑتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔خواہ یہ انداز کتنا ہی وحشیانہ اور غیر انسانی کیوں نہ ہو اور ایک بورژوا سماج میں فوج اور ریاست کا یہ کردار ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک بحران زدہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر فوج کو اس کے آئینی کردار تک محدود رکھنے کا تصور ہی غلط اور احمقانہ ہے۔ قانون کی حکمرانی، عدلیہ کی آزادی، بہتر طرزِ حکمرانی، اداروں کی اصلاح اور جمہوریت کی دھیرے دھیرے ترقی و ترویج، یہ سب محض نیک خواہشات کا ایک ایسا پلندہ ہے جو کہ زندہ سماجی و معاشی حقائق سے قطعی طور پر بے بہرہ اور پاکستانی سماج کو درپیش موجودہ ہولناک بحران کے حقیقی ادارک سے محروم ہے۔''

جماعت اسلامی کے سابق امیر قاضی حسین احمد اپنی کتاب ''اسلام، مسلمان اور پاکستان'' میں شامل مضمون ''اقتدار پر فوجی قبضے اور اس کے خلاف جدوجہد کی کہانی'' میں لکھتے ہیں:

''فوجی مداخلت کا سب سے پہلا شکار عدلیہ ہوتی ہے کیوں کہ فوجی ڈکٹیٹر دستور کے خلاف اقتدار میں آتا ہے۔ وہ دستور معطل کرتا ہے جس کی سزا موت ہے۔ وہ بندوق کے زور پر مداخلت کرتا ہے اور سب سے پہلے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں سے کہتا ہے کہ تم نے جس دستور کی حفاظت کا حلف لیا ہے، اس سے منحرف ہو کر پی سی او کے تحت میری وفاداری کا حلف اٹھاؤ تبھی تم اپنی کرسیوں پر رہ سکتے ہو۔ جو انکار کرتے ہیں ان کو گھر بھیج دیا جاتا ہے اور عدلیہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہ جاتی ہے جنہوں نے اپنے حلف سے انحراف اور دستور کا خون کیا ہوتا ہے اور غیر دستوری اور غیر جمہوری مداخلت کی حمایت کی ہوتی ہے۔ اس عمل کے مسلسل جاری رہنے سے آج ہمارے ہاں عدلیہ کا ادارہ دم توڑ گیا ہے۔ میں نے سپریم کورٹ میں ایک کیس دائر کیا، اس پر سپریم کورٹ کے متفقہ فیصلے میں کہا گیا کہ ہم تو دستور کے تحت کام ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ پی سی او کے تحت کام کر رہے ہیں، اس لیے جب دستور بحال ہو جائے تو پھر آپ کیس داخل سماعت کیجیے گا۔ جب سپریم کورٹ یہ کہہ دے تو پھر عدلیہ کہاں باقی رہ جاتی ہے۔''

(صفحہ 155-156)

ہمارے ہاں فوجی حکمرانی کی مضبوطی کی وجہ جہاں ہمارے اندرونی سیاسی تضادات ہوتے ہیں، وہیں بین الاقوامی قوتوں کے مفادات بھی ہوتے ہیں۔ جنرل ضیاالحق مرحوم اور جنرل پرویز مشرف کی طویل فوجی حکمرانی کو امریکہ سمیت دیگر کئی بڑی طاقتیں بھی جواز فراہم کرتی رہی ہیں۔ ان بڑی طاقتوں نے بھی یہاں جمہوریت کو کمزور اور فوج کے سیاسی کردار کو مضبوط کیا ہے۔ جب جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار پر شب خون مارا تو عالمی برادری کو اس پر شدید تحفظات تھے۔ جنرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرویز مشرف دنیا کو سمجھاتے رہے کہ وہ جہاد اور دہشت گردی میں فرق کو سمجھے لیکن مناسب ردِّعمل نہ مل سکا تاہم 9/11 کے بعد کے منظر نامے نے امریکہ کے سامنے جنرل پرویز مشرف کی اقتدار میں موجودگی کو ایک بڑی سیاسی ضرورت بنا دیا۔ یہی معاملہ جنرل ضیاالحق مرحوم کے دور میں بھی ہوا اور وہ افغانستان کی جنگ کے باعث امریکہ کی ضرورت بن گئے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی کو بھی امریکہ اور عالمی دنیا میں خصوصی اہمیت حاصل ہے اور امریکی اہلکار کھلم کھلا ان کی تعریفیں کرتے نظر آتے ہیں، دہشت گردی کے خلاف ان کی کارکردگی قابل تحسین ہے۔ اس لیے اب معاملہ محض ہم تک محدود نہیں رہا بلکہ اس میں بین الاقوامی فریق بھی شامل ہو گئے ہیں اور جہد وجہد کا راستہ اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

پاکستان میں جب بھی سیاسی سیٹ اپ ناکام ہوتا ہے، اس کا نتیجہ لوگوں میں اس تضاد کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے کہ اس سے اچھے تو فوجی حکمران ہی تھے۔ ایک خاص وقفے کے بعد ہمارے ہاں عام لوگوں کے اندر سیاسی جماعتوں اور ان کے طرز حکومت یا کارکردگی سے بیزاری ظاہر ہونے لگتی ہے اور انہیں فوجی حکومتوں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ یوں وہ فوج سے امید لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے جس خوفناک انداز میں میڈیا کے اندر سیاسی جماعتوں اور حکمران طبقات کی کردارکشی کی جاتی ہے، اس طرح کا طرزِعمل فوجی حکومتوں اور فوجی قیادت یا ادارہ یا بیوروکریسی کے بارے میں اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں سیاست بُری اور فوج کا کردار اچھا بن کر سامنے آ جاتا ہے اور یہ عمل فوجی قوتوں کو تقویت دیتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہاں اہل سیاست کا بہتر امیج کبھی مضبوط بن کر سامنے نہ آئے۔

ممتاز دانشور محمود مرزا اپنی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے'' میں شامل مضمون ''آمریت اور کرپشن کی کلچرل بنیادیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ہمارے طرزِ حکومت کا بنیادی اصول رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ لاٹھی فوج کی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ جہاں جمہوری ادارے کمزور ہوں اور رائے عامہ جمہوریت کی حفاظت کا کردار ادا کرنے پر تیار نہ ہو، بالخصوص جہاں سیاست دان منتخب حکومت کے خاتمے کے لیے خفیہ سازشیں کریں، وہاں فوج کے اعلیٰ حاکم کے لیے اقتدار پر قبضہ کرنا آسان ہوتا ہے کیوں کہ 1985ء کے بعد ہم نے مشاہدہ کیا کہ بیشتر حکمرانوں نے ریاستی طاقت کی لاٹھی سے سب کو ہانکا ہے۔ حکمران اپنی لاٹھی صرف سیاستدانوں پر ہی نہیں چلاتا بلکہ وہ اس سے ملک کے تمام اداروں، جن میں قانون نافذ کرنے والے اور قانون کی تشریح کرنے والے ادارے بھی شامل ہیں، سبھی کو ہانکتا ہے۔ ریاستی طاقت کے غلط استعمال کا رویہ ہمارے کلچر کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کا چھوٹی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور عوامی سطح پر اظہار پولیس کا سپاہی کرتا ہے۔ اس کے جسم پر خاکی یونیفارم اسے قوت بخشتی ہے، ذمہ داری کا احساس نہیں۔'' (صفحہ 86)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوج کی سیاسی حکمرانی کے حوالے سے رائے عامہ کو کیسے زیادہ مضبوط کیا جائے تاکہ جب بھی کبھی فوجی مداخلت ہو تو لوگ اس پر مٹھائیاں بانٹنے کی بجائے مزاحمت کرتے ہوئے نظر آئیں۔ یہاں پر یہ سوال بھی سامنے آئے گا کہ رائے عامہ کو کون مضبوط کرے گا اور جب وہ مضبوط ہوگی تو وہ کس کی جانب دیکھے گی۔ میرے خیال میں اگر سیاسی، سماجی اشرافیہ کا طبقہ جمہوری اور اصولی قدروں کے تناظر میں مضبوط ہو اور ایک منظم شکل اختیار کر لے تو اس کا براہ راست اثر عوام پر بھی پڑے گا اور لوگ اس اشرافیہ کو امید کا پہلو سمجھیں گے کیوں کہ بڑی تبدیلی اشرافیہ کے ذریعے ہی عام لوگوں تک پہنچتی ہے۔ اس سوچ کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اشرافیہ کے طبقے میں باہمی اتفاق رائے اور ایک مشترکہ سوچ کی ضرورت ہے۔ اس سوچ کا دائرہ کار محض سیاسی جماعتوں اور ان کے کارکنوں تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے دائرہ کار کو زیادہ وسعت دینے کی ضرورت ہوگی۔ اس طبقہ میں مزدور، کسان، طلبہ و طالبات، صحافتی کارکن، اساتذہ، وکلا برادری سمیت دیگر تمام طبقات شامل ہوں تاکہ یہ قوم کی ایک مشترکہ آواز کے طور پر سامنے آسکیں۔ دوسرا یہ سمجھ لینا کہ یہ کام محض اکیلی سیاسی جماعتیں ہی کر سکتی ہیں، غلط تصور ہے۔ سیاسی جماعتوں کو بھی اس معاملے میں معاشرے کے دیگر طبقات کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی یہاں بدقسمتی سے سیاسی جماعتیں فوری طور پر نتائج اور اقتدار کا حصول چاہتی ہیں، اس لیے اگر اہل دانش طبقہ متحرک اور فعال ہوگا تو اس کا دباؤ سیاسی جماعتوں پر بھی ہوگا اور انہیں بھی اپنا قبلہ درست کرنا پڑے گا۔ یہ سارا کام ایک سیاسی جدوجہد کے ساتھ ممکن ہے اور اس میں فوج کو بھی یہ باور کرانا ہوگا کہ وہ حالات اور ماضی کے تجربات سے سبق سیکھتے ہوئے ملک میں سیاسی نظام کو مضبوط کرے۔ اب فوج کے اعلیٰ حکام، عسکری امور کے ماہرین کے صورت میں ٹی وی پر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ فوج کی سیاسی مداخلت کا راستہ رکنا چاہیے۔ یہ ایک مثبت تبدیلی ہے۔ فوجی قیادت کو یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ ان کے سیاسی ادوار میں ملک کا نظام مناسب طریقے سے نہیں چلایا جا سکا اور خرابیاں پیدا ہوئیں، ان کی تباہ کاریوں کو سیاسی حکومتوں کے سپرد کیا گیا کہ وہ حالات کو سنبھالیں۔ اگر واقعی یہاں فوج کے ادوار مثالی ہوتے تو آج لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہوتے مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔

معروف دانشور، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار مرحوم عبدالکریم عابد نے اپنی کتاب ''سیاسی و عسکری تجزیے'' میں شامل مضمون ''فوج، سیاست اور عوام---ایک تجزیہ'' میں لکھا ہے:

''پاکستانی فوج، پاکستان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اگر فوج نہ ہو اور صرف سیاسی جماعتیں یا گروہ ہوں، تو ان کی باہمی لڑائی عدود سے تجاوز بھی کر سکتی ہے اور ملک میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فوج کے کمزور یا غیر مؤثر ہونے کے نتیجے میں خانہ جنگی بھی ہو سکتی ہے۔ مسئلہ صرف ملک کی سرحدوں کے دفاع کا نہیں ہے بلکہ ملک کے اندر بھی تخریب اور شر و فساد کی تحریکیں موجود ہیں، جو اگر آج خاموش ہیں تو اس لیے کہ فوج مضبوط ہے لیکن کب تک؟ اگر طالع آزما عوام کی مرضی کے خلاف عوام کی گردنوں پر مسلط رہے تو فوج اور عوام کا رشتہ مخاصمت میں تبدیل ہو جائے گا اور اس سے، ہمارے اندرونی و بیرونی دشمنوں ہی کو فائدہ پہنچے گا، اس لیے آج وقت کی شدید ضرورت ہے کہ فوج کی حکمرانی کا خاتمہ ہو۔''

(صفحہ 153)

ان ساری باتوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں حالات سے مایوس ہونے کی بجائے جدوجہد اور سیاسی عمل پر اور زیادہ پختہ یقین کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں ایک ایسے سیاسی نظام درکار ہے جو حقیقی معنوں میں سیاسی نظام کی مکمل عکاسی کرتا ہو۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس وقت پاکستان کا جو مقدمہ عالمی دنیا میں ہے، وہ کافی کمزور ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ ملک اقتدار کے طلب گار لوگوں کا ہے۔ یہ تاثر غلط نہیں ہے، پاکستان جمہوریت ہی کی بنیاد پر آگے بڑھ سکتا ہے اور اسی ہمیں اپنی بنیاد بنانا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فوج اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہے تو اس کا جواب نفی میں ملے گا اور اس کا جو طریقہ ہے وہ ہماری سیاسی جدوجہد میں پنہاں ہے۔ کیا ہم ایسا کر سکیں گے، اس فی الحال کافی سوالیہ نشان موجود ہیں جن کے جواب تلاش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان اور جمہوریت کا بحران

ہمارے ہاں سیاسی، سماجی اور صحافتی دانشوروں میں اس بات پر مکمل اتفاق پایا جاتا ہے کہ ...رے بیشتر مسائل، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں، کا حل جمہوری نظام کی تشکیل نو اور تسلسل و استحکام ت وابستہ ہے۔ اس بارے میں دو آرا نہیں کہ جمہوریت اور جمہوری نظام ہی ہمارے مسائل کو حل کر سکتا ہے کیوں کہ جمہوریت محض ایک حکومتی نظام کا نام نہیں بلکہ جمہوری عمل لوگوں میں برداشت، رواداری، ب دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے اور بالخصوص قانون کی حکمرانی کو قبول کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وہ ...امل ہیں جن کے ذریعے ہم ایک پُرامن، انصاف پسند اور برابری کی بنیاد پر چلنے والا معاشرہ تشکیل دے ...تے ہیں۔ ایک پُرامن معاشرے کی ضرورت آج اس لیے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ ہم بدقسمتی سے گزشتہ ...چھ عرصے سے عملاً ایک پُرتشدد معاشرے میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مجموعی طور ...باڑ اور بربادی کی ایک مکمل کہانی پیش کر رہا ہے اور اس سے واپسی اور نجات کا راستہ جمہوریت کو اس کی ...مل روح کے مطابق قبول کر کے ہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں جمہوری عمل اور جمہوری روایات ...کے مقابلے میں ہمیں عملی طور پر ایک آمرانہ سوچ اور اس پر مبنی نظام کی جھلک واضح طور پر بالادست نظر آتی ...ہے کیوں کہ آزادی کے بعد کا ہمارا سیاسی تجربہ ثابت کرتا ہے کہ جمہوریت ہمیں محض ایک نمائشی عمل کے طور ...دی گئی ہے جب کہ اصل حکمرانی کسی اور کے پاس ہے۔

بدقسمتی سے اگر ہم اپنے ان 63 برسوں کا سیاسی حوالے سے جائزہ لیں تو یہاں اوّل تو ...جمہوریت کی جڑیں پھیلنے ہی نہیں دی گئیں اور جو کچھ جمہوریت کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے بھی تو اس ...سے جمہوریت سے وابستہ افراد اور حکمراں طبقات کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ جمہوریت کو فروغ دینے اور ...ان چڑھانے کے ذمہ دار افراد کی طرز حکمرانی اور دیگر طور طریقوں نے جمہوری نظام کی ناکامی کا وہ ...ام سامان پیدا کیا جو جمہوری عمل کو غیر مسلسل بنانے، اس کے غیر مستحکم رہنے اور اس کی ناکامی کا باعث ...ا۔ اسی طرز عمل کی وجہ سے ہمارے ملک میں سیاسی اور جمہوری عمل کے مقابلے میں 30 برس سے زیادہ ...عرصہ براہ راست فوجی حکمرانی رہی اور جن ادوار میں یہاں سول حکومتیں برسر اقتدار رہیں، ان میں بھی یہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوتیں پس پردہ رہ کر اپنی بالادستی منواتی رہیں۔

معروف دانشور اور تاریخ دان پروفیسر ڈاکٹر طاہر کامران اپنی تصنیف ''پاکستان میں جمہوریت اور گورنینس'' کے صفحہ 11-10 پر رقم طراز ہیں:

''پاکستان میں ابتدا ہی سے حکمران طبقہ کی خودغرضی اور اس کی عنانِ اقتدار پر قابض رہنے کی خواہش نے جمہوریت کی افزائش اور ارتقا کو ناممکن بنا دیا۔ مسلم لیگ کی اپنی قیادت جمہوریت کی ترویج و ترقی کے رستے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ مسلم لیگ کی زیادہ تر قیادت مغربی پاکستان کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھتی تھی، لہٰذا قدرتی طور پر عوام کی پہنچ سے دُور تھی۔ عام طور پر محمد علی جناحؒ (قائداعظمؒ) کے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد فوت ہو جانے کو جمہوریت کے پروان نہ چڑھ پانے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی حقائق اس نقطہ نظر کی تصدیق نہیں کر پائے۔ دیگر وجوہات کے علاوہ گورنر جنرل کے انتظامی اختیارات کا استعمال اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان کے جمہوری ڈھانچے کی بنیاد ہی میں غیر معمولی سقم تھا۔ انتظامی اختیارات کا مرکز و محور تو وزیراعظم ہی کو ہونا چاہیے تھا لیکن جناح صاحب کے گورنر جنرل ہوتے ہوئے وزیراعظم محض عضوِ معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ جناح صاحب اپنے سیاسی رفقائے کار سے زیادہ بیوروکریٹس پر انحصار کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے پاکستان میں غیر سیاسی عناصر ابتدا ہی سے مضبوط ہو گئے تھے۔''

ڈاکٹر طاہر کامران کا یہ تجزیہ کافی فکر انگیز ہے جو ابتدا ہی سے جمہوری ڈھانچے کی کمزوریوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس تجزیے کو مدنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں جمہوریت کی عمارت کی بنیادیں ہی کمزور رکھی گئی اور اس میں کئی خامیاں رہ گئی تھیں۔ ممتاز دانشور اور تاریخ دان ڈاکٹر جعفر احمد نے اسی بات کو ایک الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ عارف میاں کی کتاب ''برصغیر کیسے ٹوٹا'' میں دیئے گئے اپنے انٹرویو میں ڈاکٹر جعفر احمد نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

''پاکستان بننے کے فوراً بعد جس طرح سے بیوروکریسی نے ریاستی اقتدار کے اوپر تصرف حاصل کیا، وہیں سے اس کا آغاز ہو گیا تھا یعنی بالکل شروع میں اور 1947ء میں بیوروکریسی کو جو موقع ملا، کچھ حالات نے وہ موقع فراہم کیا، کچھ اس زمانے کا جو آئین تھا، 1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، اس نے اور پھر 51-1950ء میں فوج بیوروکریسی کی حلیف بن گئی اور پھر 54-1953ء میں امریکہ اس میں شامل ہو گیا، تو میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو جمہوریت کے راستے سے ہٹانے میں بیوروکریسی، فوج اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکہ ان تین کا کردار کلیدی ہے۔'' (صفحہ 145)

ڈاکٹر جعفر احمد نے آزادی کے بعد ابتدا ہی میں امریکی کردار کی جو نشاندہی کی ہے، وہ سو فیصد درست محسوس ہوتی ہے۔ یہ صورت حال آج پوری آب و تاب کے ساتھ پاکستان کی سیاست پر غالب نظر آتی ہے اور امریکہ کے کردار کو نظر انداز کر کے جمہوریت کی ناکامی کا تجزیہ مکمل نہیں ہوگا۔

جہاں تک فوجی حکمرانی کا تعلق ہے تو یہ بات بھی درست ہے کہ فوجی قیادتوں نے جمہوریت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی بجائے اس میں بے جا مداخلتوں کو ترجیح دے کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی پہلے سے موجود اپنی خواہشات کی تکمیل کی۔ اس کے باوجود جمہوری حکمرانوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنے طرز عمل سے جمہوری انداز اپنانے کی بجائے آمرانہ اور غیر جمہوری رویے اپنائے۔ اس طرز عمل سے نہ صرف لوگوں میں جمہوریت سے محبت کا عمل مضبوط نہیں ہو سکا بلکہ فوجی طبقوں کو بار بار سیاسی نظام میں کودنے اور مداخلتوں کا موقع بھی ملا۔ سیاسی حکمرانوں نے بھی وہ سب کچھ کیا جو غیر سیاسی طبقہ ان سے چاہتا تھا اور سیاست دانوں اور ان کی حکومتوں کی ناکامی میں جہاں فوجی قیادت ذمہ دار ہے، وہاں وہ خود بھی اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ پاکستان میں جو ایک مختصر سا عرصہ لوگوں کو جمہوریت کی صورت میں ملا۔ اس میں لوگوں اور سیاسی اشرافیہ کے گروپوں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ملک میں جمہوریت کی مضبوطی یا بحالی کسی ایک فرد کی یا جماعت کی تو ہو سکتی ہے مگر اس کا تعلق عوام کی آزادی یا خوش حالی سے جوڑنا کسی بھی طور پر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے سیاسی رہنما اور دانشور اس بات پر رنجیدہ نظر آتے ہیں کہ وہ سب بھی لوگوں کو جمہوریت کا سبق دے کر انہیں متحرک اور فعال کرنا چاہتے ہیں تو لوگ ان کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے الٹا جمہوریت اور اس کے تحت چلنے والے نظام کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرا المیہ یہ ہے کہ ہم نے جمہوریت کو کلی طور پر اور اس کی اصل روح کے مطابق قبول کرنے کی بجائے اس کے چند پہلوؤں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ یہاں مراد محض سیاسی جماعتیں یا ان کی قیادتیں نہیں ہیں بلکہ معاشرے کا مجموعی مزاج ہی جمہوری انداز میں تشکیل نہیں دیا جا سکا۔ یعنی ہمارے نزدیک محض انتخابات، ووٹ کا استعمال، اسمبلیوں کی تشکیل، حکومتوں کا قیام ہی جمہوریت ہے اور یہ کہ اگر ووٹ دینے کے عمل میں تسلسل ہو اور فوجی مداخلتیں نہ ہوں تو جمہوریت مضبوط اور قائم رہ سکتی ہے۔ دراصل یہ سب چیزیں جمہوریت کی مضبوطی کی طرف ایک قدم تو ہو سکتی ہیں لیکن جمہوریت کی مکمل مضبوطی اور بحالی محض ان باتوں سے ممکن نہیں۔ اگر جمہوریت محض ایک خلا میں موجود ہو اور اس کی جڑیں معاشرے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی بنیادوں پر پروان نہ چڑھیں تو پھر ایسی جمہوریت سے عوام کا بھلا ہو سکتا ہے نہ ہی معاشرے جمہوری انداز میں بدلے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں مضبوط جمہوریت ہے اور اس کے جمہوری تسلسل کی وجہ سے اسے جنوبی ایشیائی خطے میں ایک اعلیٰ جمہوریت سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بھارت کی جمہوریت کے گن گاتے ہیں اور اس کی اعلیٰ جمہوری قدروں کو نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے مقابلے میں بھارت کی جمہوری کہانی بہت شاندار ہے اور اس کو مثال بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنے اندرونی طرح کی خوبیاں رکھتی ہے اور دنیا میں تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کی جمہوریت کو آج شدید خطرات لاحق ہیں کیوں کہ وہاں کی یہ شاندار جمہوریت لوگوں کے زندہ رہنے کے تناظر میں بنیادی مسائل حل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ وہاں موجود سیاسی، سماجی اور معاشرتی محرومیاں اور بہت سے کمزور اور محروم طبقات کی زندگی کے کئی بُرے اور کرب ناک پہلو نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس لیے اگر جمہوریت عام اور کمزور طبقات کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو جائے تو عام لفظوں میں اسے جمہوریت کی ناکامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا معاملہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہے کیوں کہ یہاں جمہوری عمل میں کوئی تسلسل ہی نظر نہیں آتا۔ سیاسی رہنماؤں اور جماعتوں کی جمہوریت سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے بیشتر رہنما عوام کے مقابلے میں فوجی حکمرانوں اور پس پردہ قوتوں سے ملی بھگت کر کے اقتدار میں آتے ہیں۔ یہ تمام رہنما اس بات پر قائل نظر آتے ہیں کہ اقتدار کے حصول کی سیڑھی عوام نہیں بلکہ پس پردہ قوتیں ہیں۔ اس لیے ہماری نامنہاد جمہوریت میں عوام کے مقابلے میں فوجی قیادتوں اور اس کے ادارے کو بنیادی اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ فیصلوں کا اختیار سیاسی جماعتوں، سیاسی حکومتوں اور سیاسی اشرافیہ کے مقابلے میں اس مضبوط فوج کو حاصل ہے جو اب مکمل طور پر سیاسی نظام میں بالادست نظر آتی ہے۔

معروف دانشور اور تاریخ دان حمزہ علوی اسے متجاوز ریاستی ڈھانچے یعنی over developed state structure کا نام دیتے ہیں۔ نظری اعتبار سے گورننس کے نمایاں پہلوؤں میں تمام شراکت داروں کی شمولیت، نظام کا شفاف ہونا اور غیر جانبدار فیصلہ سازی، جواب دہی اور قانون کی حکمرانی شامل ہیں تاکہ کرپشن کو کم سے کم کیا جا سکے اور استحصال شدہ طبقات کو معاشی و سیاسی زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل کیا جا سکے۔ بدقسمتی سے پاکستان کے ٹوٹے پھوٹے سیاسی نظام میں یہ سب نہ ہو سکا۔ گورننس کے مسائل کا صحیح طور پر احاطہ کرنے کے لیے لازم ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کی تاریخ کا مکمل جائزہ لیا جائے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس پر غیر جمہوری سٹرکچر نے، جس میں عوامی نمائندگی کا تصور تک محال ہے، حکمرانی کی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب سیاست میں فوج ایک مضبوط ادارے کے طور پر موجود رہے گی اور سیاست کا محور اسی کے گرد گھومے گا تو سیاسی قوتیں بھی عوام کے مقابلے میں انہی کی طرف دیکھیں گی۔ یہ بات آدھے سچ کے طور پر ضرور مانی جا سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو تبدیل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے۔ اگر سیاسی حکومتیں پہلے سے موجود نظام کی طاقت کو قبول کر کے اس سے سمجھوتوں کی سیاست کریں گے تو پھر نئی اور حوصلہ افزا سیاسی و جمہوری تبدیلی کا عمل کیسے ممکن ہوگا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ سیاست میں فوج کی عمل داری بہت مضبوط ہے لیکن اگر سیاست دان، عوام کو ساتھ ملا کر مزاحمت کرنے کی بجائے ''کچھ لو اور کچھ دو'' کی سیاست کریں تو اس میں جمہوری اصول پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ملک میں جمہوریت کا بوریا بستر گول کیا گیا تو اہل سیاست کی اکثریت نے اس کے خلاف مزاحمت کرنے کی بجائے آنے والی فوجی اور غیر آئینی حکومتوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے فوجی مداخلتوں کی حمایت کی، اور اس کے عوض وہ خود اقتدار کی بندر بانٹ میں حصہ دار بن گئے۔

ممتاز دانشور اور سیاسی تجزیہ نگار ایاز امیر، جو براہ راست سیاست کا تجربہ بھی رکھتے ہیں، عملاً یہاں پر جمہوریت کے مستقبل سے خاصے مایوس یا نالاں نظر آتے ہیں۔ وہ اخبارات میں تواتر کے ساتھ لکھتے ہیں اور اپنے ایک مضمون، جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا، میں لکھتے ہیں: ''پاکستان میں جمہوریت کے نام پر جو ناٹک رچایا جا رہا ہے وہ عوام کے زخم زخم کر دینے کے مترادف ہے۔'' ان کے خیال میں فوج نہ صرف سیاسی بلندیوں کو فتح کر چکی ہے بلکہ وہ اس سے دست بردار ہونے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ان کے بقول، وہ اپنی زندگی میں صورت حال کو بہتر نہیں دیکھ سکیں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ''خرابی کی اصل جڑ جنرل ضیاالحق مرحوم کے دور کے اسلامائزیشن میں ہے، اس لیے اگر ان کے دور کے تمام کالے قوانین ختم یا منسوخ کر دیے جائیں تو پاکستانی حقیقی معنوں میں پاکستانی بن جائیں گے۔''

دراصل ایاز امیر کی یہ مایوسی محض ان کی اپنی ذات کی مایوسی تک محدود نہیں بلکہ معاشرے میں موجود بھی سنجیدہ طبقات کچھ ایسا ہی غم اور دکھ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ اصل خرابی کی جڑ محض جنرل ضیاالحق تھے تو یہ بھی مکمل سچ نہیں ہوگا بلکہ پاکستان میں جمہوری روایات کے فروغ پذیر نہ ہونے کی جڑ اس سے پرانی ہے۔ ضیاالحق سے پہلے کے فوجی اور سول حکمران طبقوں نے بھی وہی کچھ کیا جو جنرل ضیاالحق مرحوم نے کیا۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جنرل ضیاالحق کے دور میں ان خرابیوں میں زیادہ شدت پسندی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ مثلاً ایاز امیر نے جنرل ضیاالحق کی اسلامائزیشن کی پالیسی کا ذکر جن الفاظ میں کیا، وہ واقعی قابل غور ہیں۔ وہ معاشرے کو جس انداز میں اسلامی بنانا چاہتے تھے، وہ ایک خطرناک رجحان تھا، اور بلاشبہ ہم اب تک ان خرابیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مگر یہ کیوں بھلا دیا جاتا ہے کہ ریاست کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کا عمل تو ملک میں بہت پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ آپ کو لیاقت علی خان اور ایوب خان کے ادوار میں بھی اس کی جھلک ملے گی۔ پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو، جو لبرل اور پروگریسو رہنما تھے، نے بھی اپنے دور حکومت میں ایسے کئی اقدامات کیے جو اسلامائزیشن کی پالیسی کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ اس لیے یہ کہنا کہ صرف جنرل ضیاالحق نے اسلامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست کا سہارا لیا، ٹھیک نہیں بلکہ ہمارے بہت سے لبرل سیاست دانوں بشمول ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اسلامی سیاست کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنی سیاست کا محور بنایا۔

اس لیے اگر یہاں جمہوری عمل کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کی ذمہ داری محض کسی ایک فرد یا ایک فریق پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ تمام فریق کسی نہ کسی شکل میں آج کی غیر جمہوری صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں۔ بقول ایاز امیر ہم گزشتہ 64 برسوں میں ثابت کر چکے ہیں کہ ہم جمہوریت کے اہل اور مستحق نہیں، ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہمیں جمہوریت دینے سے صاف انکار کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے یہ ہم سے کب پوچھا گیا کہ ہمیں جمہوریت درکار ہے کہ نہیں، ہم تو وہ بدقسمت لوگ ہیں جن پر چیزیں اور نظام مسلط کیے جاتے ہیں اور ان کو کبھی جمہوریت اور کبھی آمریت کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ ہمیں تو محض کٹھ پتلی کا تماشا دکھایا جاتا ہے اور اس میں ہماری حیثیت محض ایک تماشائی کی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ نہ تو ہمیں کوئی حق دیا گیا اور نہ ہی کوئی دینے کے لیے تیار ہے۔ جو حقوق لوگوں نے اپنی جدوجہد اور سیاسی عمل سے حاصل کیے اس پر بھی آمرانہ قبضہ ہو چکا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہم جمہوریت کے قابل نہیں، ایک مکمل سچ نہیں، اصل مسئلہ جمہوری جدوجہد اور آزادی کا ہے جو کسی بھی طور پر قوم کو بطور تحفہ یا خیرات میں نہیں ملے گی۔

ممتاز دانشور اور صحافی و تجزیہ نگار مرحوم عبدالکریم عابد نے اپنی سوانح عمری ''سفر آدھی صدی کا'' میں شامل مضمون ''جمہوریت سوئے مقتل'' میں لکھا ہے:

> ''پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار جب عام انتخابات ہوئے تو وہ منحوس ثابت ہوئے۔ اس میں قصور جمہوریت کا ہے، جمہور کا ہے یا رہنماؤں کا؟ کیا ہمیں جمہوریت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیے؟ یہ کہنا بہت آسان ہے کہ جمہوریت فساد کی جڑ ہے لیکن جمہوریت کے متبادل کوئی دوسرا انتظام نہیں جو پاکستان کی طرح کے مختلف نسلوں، زبانوں اور علاقوں کے لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ ہمارے عوام اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اپنے اسفل اور ارزل جذبات پر قابو پانا سیکھیں اور سیاست کی بنیاد شریفانہ اقدار و احساسات پر رکھی جائے۔ اس سے جو جمہوریت پیدا ہوگی، وہ نہ سفلی ہوگی اور نہ سفلی نتائج کی حامل ہوگی، نہ اس سے ارزل اور اسفل حالات پیدا ہوں گے۔ دراصل ہمارے رہنماؤں نے جمہوریت کو مسائل کے حل کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے مسائل کے ابھارنے کا ذریعہ بنا لیا اور ایسا ابھارنا بنا دیا کہ بس اللہ کی پناہ۔'' (صفحہ 253-252)

جمہوریت کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارا معاشرہ مجموعی طور پر ایک جمہوری معاشرہ نہیں ہے کیوں کہ عملاً اس معاشرہ میں جاگیردارانہ ذہنیت، طبقاتی تقسیم، برادری کی مضبوط جکڑ بندی، قبائلی اور سرداری نظام موجود ہے۔ اس طرز کے معاشرے میں جو جمہوریت ہوتی ہے، وہ انہی سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ے طاقتور عناصر کے کنٹرول میں ہوتی ہے اور اس میں عام آدمی کی حیثیت ایک سیاسی، سماجی مزارعے
ی سی ہوتی ہے۔ اس طرز کے معاشرے میں فیصلہ کرنے کی طاقت بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں
و نے یا مشاورت کے ذریعے ہونے کی بجائے مخصوص طاقت ور عناصر کے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ یہ
ن صرجس حد تک جمہوریت کو اپنی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اتنی جمہوریت کو سامنے لانے اور اسے
دگوں میں دینے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن اگر آپ ان لوگوں کو جمہوریت کے اندر پابند کرنا یا
واب دہی کے نظام میں لانا چاہیں گے تو یہ لوگ غیر جمہوری روپ اختیار کر لیتے ہیں اور لوگوں کو مجبور
رتے ہیں کہ وہ انہی کے جمہوری ماڈل کو قبول کریں اور دھمکی دی جاتی ہے کہ دوسری صورت میں ان سے
یہ بچی کھچی جمہوریت بھی واپس لے لی جائے گی۔

معروف سیاسی تجزیہ نگار اطہر ندیم مرحوم اپنی کتاب ''پاکستان کے سیاسی حقائق'' میں شامل
مضمون ''پاکستان میں جمہوریت تصور سے حقیقت کیوں نہیں بن سکی'' میں صفحہ 119-118 پر لکھتے ہیں:

''پاکستانی سماج بدستور ایک جاگیردارانہ سماج ہے، نئی صدی کے اثر سے جو بڑے بڑے
شہروں میں تبدیلی نظر آتی ہے، یہ بھی بڑی سطحی قسم کی ہے۔ بنیادی رویے وہی ہیں، اس
لیے جمہوریت یہاں جڑ نہیں پکڑ سکی کہ یہ نظام جس کی بنیاد ہی عوامی حاکمیت پر ہوتی ہے،
جہاں فرد واحد کی مرضی نہیں چلتی بلکہ اجتماعی مرضی چلتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اکثریت
کی مرضی چلتی ہے وہ جاگیردارانہ مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسے بادشاہت چاہیے۔
ہر مرد اپنے گھر میں بادشاہ ہوتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ سبھی اہل خانہ اس کی غیر مشروط
اطاعت کریں، اس کی مرضی کے تابع کام کریں۔ سیاسی پارٹیوں میں نظریاتی وفاداری کی
جگہ شخصی وفاداری ملے گی۔ وابستگی، جو ہو سکتا ہے آغاز میں کسی سیاسی پروگرام یا نظریے کی
بنا پر ہو، بہت جلد سیاسی لیڈر اور اس کے خاندان سے وفاداری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔''

اطہر ندیم مرحوم کا یہ تجزیہ بجا ہے کیوں کہ جب معاشروں کے اندر جمہوریت افراد کے
سہارے کھڑی ہو اور ہم ادارہ سازی کے مقابلے میں افراد کی بالا دستی کو ذہنی طور پر قبول کر لیں تو معاشرے
جمہوری نہیں بلکہ شخصی جمہوریت اور شخصی آمریت کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بھی
جمہوری ماڈل آیا وہ افراد ہی کے گرد گھوما اور جب وہ افراد منظر نامہ سے غائب ہوئے یا ان کو غائب کر دیا
گیا تو جمہوری عمل بھی انہی کے ساتھ لپیٹ دیا گیا اور ملک وقفوں وقفوں سے جمہوری عمل سے دور ہوتا چلا
گیا۔ یہاں جمہوریت کو بطور ادارہ یا بطور نظریہ تسلیم ہی نہیں کیا گیا اور اسے جب سیاسی طاقت کے حصول کا
ہتھیار سمجھ لیا گیا تو اس میں خرابیوں کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ خاندان اور گھر کے نظام سے لے کر سیاسی،
سماجی اور انتظامی اداروں تک آپ کو غیر جمہوری رویوں کی جھلک نمایاں طور پر نظر آئے گی اور جب سماجی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سطح پر جمہوری رویے فائق نہیں ہوں گے تو پھر ملک کی سیاست میں جمہوریت کیسے آئے گی؟ اس پر سنجیدگی سے غور وفکر کی ضرورت ہے کیوں کہ اگر واقعی ہم ایک جمہوری معاشرہ بنانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں پورے سماج اور معاشرتی اداروں کا ایک نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوگا کہ آخر کیوں ہمارے ہاں ابھی تک جمہوریت نہ تو پنپ سکی اور نہ ہی ایک ایسے ٹریک پر چلنے میں کامیاب ہو سکی ہے، جو ہمیں جمہوریت کے قریب لے جائے۔ کیا ہم اپنے آپ میں جمہوریت کی مضبوطی اور خواہش کو پیدا کر کے خود غیر جمہوری رویوں ہی کا شکار رہیں تو یہ استاد جمہوریت کے بالکل برعکس ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہاں ہر طبقہ میں عدم برداشت اور عدم رواداری کا کلچر مضبوط ہو رہا ہے اور لوگ اجتماعی طاقت کے مقابلے میں انفرادی سوچ کے قریب ہیں اور اسی کو بنیاد بنا کر اپنی سیاست کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب معاشروں میں شخصیت پرستی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہو تو لوگ کیوں ادارہ سازی کی طرف جائیں گے۔ یہ المیہ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ پورے جنوبی ایشیائی خطے کی سیاست میں غالب نظر آتا ہے۔ اس طرز عمل نے معاشرے میں نچلی سطح پر جمہوری رویوں کو نایاب نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کے اندر ایک واضح خلا نظر آتا ہے، جو ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں موجود ہے اور جس نے قوم کے اندرونی نظم ونسق کو برباد کر کے قومی تصورات وخیالات کے تمام ڈھانچوں کو مسمار اور سوچ بچار کے تمام سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ اسی طرز عمل کی وجہ سے یہاں لوگوں کی جمہوریت کے ساتھ وابستگی ایک مضبوط شکل اختیار نہیں کر سکی اور جب بھی ملک میں جمہوریت پر برا وقت آیا تو لوگوں کی ایک بڑی اکثریت جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کے ساتھ منسلک رہی۔ اسی طرح وہ تمام قومی ادارے جو جمہوریت کی مضبوطی میں کلیدی کردار ادا کر سکتے تھے خاطر خواہ نتائج اس لیے نہیں دے سکے کہ وہ آمریت کے کنٹرول میں رہے۔ اس طرح قومی جمہوری مزاج فروغ نہیں پا سکا۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کے نئے زاویے'' میں شامل مضمون ''پاکستان میں جانشینی کا سوال'' میں صفحہ 133-132 پر لکھتے ہیں:

> ''اگر جانشینی کے مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے تو سیاسی نظام کی ناکامی کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ سیاست دان اپنی سیاسی جماعتوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں اور اپنی پارٹی ورکرز کو مزارع، جو ان کی رعایا ہوں، اور جن پر لازم ہے کہ وہ ان کے احکامات کی بلاچوں و چرا تعمیل کریں۔ اس لیے ان جماعتوں میں عہدے داروں کا نہ تو انتخاب ہوتا ہے اور نہ جانشینی کے بارے میں کوئی قاعدہ یا قانون ہی موجود ہوتا ہے۔ اس طرح سیاسی جماعتیں، سیاسی خاندانوں کی جاگیر ہوتی ہیں اور خاندان سے باہر کسی کو حق نہیں دیا جاتا کہ وہ پارٹی کی لیڈر شپ سنبھالے۔ پارٹی کی حیثیت ایک کارپوریشن کی ہو جاتی ہے جس پر ایک ہی خاندان کا قبضہ رہتا ہے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر مبارک علی اسی مضمون کے صفحہ 133 پر لکھتے ہیں:

> ''جب کوئی فرد اپنی طاقت اور قوت کی بنا پر اقتدار حاصل کرتا ہے تو اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ لوگ اسے جائز جانشین تسلیم کریں یا نہ کریں۔ اس موقع پر ہمارے ہاں اب تک الماوردی کی یہ تھیوری کام آتی ہے جو اس نے اپنی کتاب ''الاحکامتہ السلطانیہ'' میں بیان کی ہے۔ اس کے مطابق، اگر کوئی فوجی طاقت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو جائے تو غاصب ہونے کے باوجود اسے حکمران تسلیم کر لینا چاہیے کیوں کہ لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ ہم ابھی تک اس قرونِ وسطیٰ کی تھیوری کی بندش میں گرفتار ہیں اور بے بسی کے ساتھ ہر غاصب کو اپنا حکمران تسلیم کر لیتے ہیں۔''

ڈاکٹر مبارک علی کا یہ تجزیہ سو فیصد درست ہے کہ جب ہم خود ہی ہر غاصب کو نہ صرف حکمران تسلیم کر لیں گے بلکہ اس کے آنے کا جواز فراہم کرنا بھی اپنا سیاسی حق سمجھ لیں گے تو پھر غاصب کی حکمرانی کا یہ سلسلہ کبھی نہیں رک سکے گا اور ہم یونہی تماشا دیکھتے رہ جائیں گے۔ عوام کی حیثیت کٹھ پتلی کے اس کھیل میں تماشائی سے آگے نہیں بڑھ پائے گی۔

ہمارا ایک اور بحران جمہوری نظام میں ایک تسلسل سے نہ ہونے کا ہے، جس کی وجہ جہاں سیاستدانوں کی اپنی اندرونی کمزوریاں ہیں، وہاں اصل معاملہ سول اور ملٹری تعلقات کے بحران کا بھی ہے۔ یعنی سویلین ایک آزاد جمہوری حکومت کی خواہش رکھتے ہیں جب کہ اس کے برعکس فوجی قیادت جمہوری نظام میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کی خواہش مند ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جمہوری عمل میں ایک ایسا اشتراک کار ہو جو ان کی طاقت کے گرد گھومے۔ فوجی قیادت ایک مکمل جمہوری نظام کی حامی نہیں، وہ ایک کنٹرولڈ ڈیموکریسی چاہتی ہے اور یہی جمہوری تناظر میں بحران کے جاری رہنے کی اصل وجہ ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہمارے ہاں شدت کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے کہ یہاں فوجی اور آمرانہ حکومتیں دراصل سیاسی حکومتوں کی ناکامی کے باعث آتی ہیں۔ اس بات میں کسی حد تک سچائی ہے لیکن ان سیاسی قوتوں کو خراب کرنے اور انہیں اپنے ایجنڈے پر سیاست کرنے پر لانا یا ان کو مجبور کرنے کا عمل بھی فوجی حکمرانی کی خواہش کے گرد گھومتا ہے۔ جہاں تک سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کا تعلق ہے۔ ان کے تضادات بھی گہرے ہیں۔ آج بھی بہت سی سیاسی جماعتیں اور رہنما فوج کو ایک بڑی سیاسی طاقت سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں فوج کے ساتھ اقتدار کی شراکت کار میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اقتدار پرست حکمرانوں کی ایک بڑی تعداد فوج ہی کی مرہون منت اقتدار میں آتی رہی ہے۔ اس لیے جب فوج سیاست پر قبضہ کرتی ہے تو اسے محض اپنے ادارے یعنی فوج ہی کی حمایت حاصل نہیں ہوتی بلکہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی اشرافیہ کی ایک بڑی تعداد بھی فوج کے اقتدار کی حمایت میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اگرچہ جمہوریت کوئی حرف آخر نظام حکومت نہیں، لیکن اس وقت دنیا میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رائج نظاموں میں جمہوریت ہی وہ واحد نظام ہے جو فردِ واحد کی حکمرانی کے مقابلے میں زیادہ لوگوں کی حق حکمرانی پر زور دیتا ہے۔ یہ مختلف سیاسی وسماجی گروہوں کے وجود کو قبول کر کے لوگوں کی زندگیوں پر دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ رواداری اور اشتراکِ عمل کے ذریعے ایک بہتر اور دیرپا نظام حکومت قائم کریں۔ یہاں جو سیاسی تحریکیں بھی چلیں وہ کسی اصول اور نظریات کے مقابلے میں افراد اور اقتدار کے حصول کے گرد گھومتی رہیں۔ مثلاً 1977ء میں بھٹو حکومت کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک کو دیکھیں جو نظام مصطفیٰ اور اسلامی نظام کی تحریک تھی لیکن عملاً یہ تحریک اسلامی انقلاب سے زیادہ بھٹو دشمنی پر مبنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد قومی اتحاد کی اسلامی انقلاب کی تحریک عملاً ختم ہو گئی تھی۔ ایم آر ڈی کی تحریک، جو جنرل ضیاالحق کے سیاسی مخالفین نے ان کے خلاف چلائی، میں کئی ایسے رہنما شامل تھے جو عملی طور پر فوجی قیادت کے ساتھ رابطوں میں تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاالحق، جو بے نظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھے، نے ایم آر ڈی کے بہت سے رہنماؤں سے ساز باز کر رکھی تھی۔

جنرل ضیاالحق کی کوشش تھی کہ بے نظیر بھٹو اور ان کی جماعت کو 1985ء کے انتخابات سے دور رکھا جائے، اسی لیے انہوں نے غیر جماعتی انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ بے نظیر بھٹو اس شش و پنج میں مبتلا تھیں کہ انہیں غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایم آر ڈی میں شامل بہت سے افراد ضیاالحق کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کو مجبور کرتے رہے کہ وہ انتخابات میں حصہ نہ لیں اور بے نظیر بھٹو نے ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے ضیاالحق کے غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ بعد میں بے نظیر بھٹو نے سیاسی طور پر اعتراف کیا کہ ان کی جانب سے 1985ء کے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ غلط تھا اور اس سے جمہوری عمل کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ اسی طرح 1997ء میں ایم آر ڈی کی تحریک جو نواز شریف حکومت کے خلاف تھی، وہ بھی جمہوریت سے زیادہ نواز شریف دشمنی پر مبنی تھی۔ ایم آر ڈی کے سربراہ نواب زادہ نصراللہ مرحوم، جو جمہوری جہدوجہد کے حوالے سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے، نے اس وقت آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کو خط لکھا۔ حالات کی سنگینی کے باعث وہ اپنا سیاسی کردار ادا کریں۔ اب فوج کا سیاسی کردار فوجی مداخلت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر 12 اکتوبر 1999ء کا واقعہ رونما ہوا، جب ایک بار پھر سیاسی نظام کی بساط کو لپیٹ کر فوجی آمریت کا راستہ ہموار کیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کی فوجی مداخلت کو فوری طور پر بہت سی سیاسی قوتوں نے قبول کیا اور اس مداخلت کا سیاسی جواز فراہم کیا۔ اس میں اے آر ڈی میں شامل تمام جماعتوں کے علاوہ مذہبی جماعتیں بھی شامل تھیں۔ سیاسی جماعتوں کی اکثریت نے ابتدا میں جنرل پرویز مشرف کے اقتدار کی حمایت کی اور ثابت کیا کہ نواز شریف کی آمریت کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ البتہ ان سیاسی تحریکوں میں سیاسی کارکنوں اور اشرافیہ کے دیگر گروپوں نے بہت قربانیاں دیں اور جدوجہد کی، جس میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہزاروں سیاسی کارکنوں اور دیگر طبقات، جن میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے، کو فوجی اور سول آمرانہ نظام میں ہر طرح کے تشدد اور دیگر نوعیت کے استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی تحریک میں ہزاروں کارکن جیلوں اور کوڑوں کی سزاؤں کے مستحق ٹھہرے۔ بالخصوص پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی سیاسی جدوجہد اور ان کے خلاف ہونے والی انتقامی کارروائیاں، ہماری سیاسی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے۔ لیکن ان سب کارکنوں کی جدوجہد ملک میں جمہوری نظام کو آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

معروف صحافی، دانشور اور سیاسی تجزیہ نگار عبدالکریم عابد مرحوم نے اپنی کتاب ''سیاسی، سماجی تجزیے'' میں شامل مضمون ''پاکستانی سیاست میں جاگیردار طبقے کا کردار'' میں صفحہ 77-76 پر لکھا ہے:

''پاکستانی عوام کے لیے الجھن کی بات یہ ہے کہ انتخاب ہو یا انقلاب، جمہوری سیاست کا دور آئے یا مارشل لاء کے ڈنڈے کی حکمرانی ہو، ہر صورت میں قیادت جاگیردار و زمیندار طبقے کی ہوتی ہے۔ کبھی یہ ری پبلکن کا نام اختیار کرتے ہیں، کبھی کنونشن لیگ کے پرچم تلے جمع ہوتے ہیں، کبھی بھٹو کے اسلامی سوشلزم میں ان کی محفل اقتدار سجتی ہے اور کبھی ضیاالحق کی مجلس شوریٰ یا غیر جماعتی پارلیمنٹ کی رونق یہ لوگ ہوتے ہیں۔ غرض ہر عہد اور الٹ پھیر میں انہی کا سکہ رواں ہوتا ہے۔ حد یہ کہ حزب اقتدار ہی نہیں، حزب اختلاف کا بھی سیاسی اثاثہ سرداروں، وڈیروں، نوابوں اور خوانین پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام یا متوسط طبقہ صرف جدوجہد کرنے یا قربانیاں دینے کے موقع پر آگے کر دیا جاتا ہے، وگرنہ اصل سیاسی کھیل فیوڈل طبقہ کا ہوتا ہے۔ اس کھیل کے نتیجے میں اگر حکومت بدلی جاتی ہے تو ایک آدھ شخص کو چھوڑ کر باقی سارا پرانا نظام پرانے افراد کے ساتھ دوبارہ حکمرانی کرتا نظر آتا ہے۔ ہر تبدیلی کے بعد معلوم یہ ہوتا ہے کہ پرانا نظام اور پرانے طبقہ کی قیادت کمزور نہیں ہوئی بلکہ زیادہ مستحکم ہو گئی ہے۔ اس قسم کی تمام سیاسی تبدیلیاں اور سیاسی الٹ پھیر کے بعد اگر آپ آج صورتِ حال کا تجزیہ کریں تو صاف نظر آئے گا کہ 47-46-1945ء کے کمزور جاگیردار اور فیوڈل عناصر آج بے پناہ طاقت کے مالک بنے ہوئے ہیں، پورا ملک ان کی گرفت میں ہے اور فوج کے لیے بھی، جو میزائل، ٹینک، بم، آبدوزیں سب کچھ اپنے پاس رکھتی ہے، یہ ممکن نہیں کہ اس فیوڈل طبقہ کو اقتدار میں شریک کیے بغیر یک وتنہا حکومت کر سکے۔''

عبدالکریم عابد مرحوم کا یہ مختصر تجزیہ ہماری جمہوری کہانی کے کئی تلخ پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ ہم جمہوریت کے تناظر میں کہاں کھڑے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کا مستقبل کیا ہے اور کیا یہاں واقعی حقیقی جمہوریت کا سفر شروع ہو سکے گا؟ اس کا جواب بھی ہمارے پاس موجود ہے کیوں کہ اس کا فیصلہ بحیثیت قوم سیاسی اشرافیہ کو کرنا ہے کہ کیا واقعی ہمیں جمہوریت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ضرورت ہے۔ اگر واقعی جمہوریت کی ضرورت ہے تو یہ کیسے حاصل ہو سکے گی؟ کیوں کہ یہ بات تے ہے کہ کوئی بھی قوم تضادات کی بنیاد پر جمہوریت کے سفر کا آغاز نہیں کر سکے گی۔ اگر قوم نے یہ فیصلہ کر ہے کہ وہ واقعی جمہوریت چاہتی ہے تو پھر اس کے لیے پُرامن جدوجہد کا راستہ اپنانا پڑے گا اور ان تما قوتوں کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کرنا ہوگا جو جمہوریت کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ان رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ، فوج کا سیاسی کردار ہے، اس کو ختم کیے بغیر جمہوریت کا سفر بے معنی ہوگا۔ اس کامیا کے لیے قومی سیاسی ادارے، سیاسی جماعتیں، اشرافیہ اور عوام سب کو اپنے اپنے کردار کا تجزیہ کرنا ہوگا جب تک یہ ادارے یا افراد خود کو جمہوریت کے سانچے میں نہیں ڈھالیں گے، یہاں جمہوریت نہیں پنپ سکے گی۔ دوسری ضرورت اس امر کی ہے کہ اب جمہوری قوتوں کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ حقیقی جمہوریت چاہتی ہیں یا کنٹرولڈ جمہوریت کی حامی ہیں۔ اس کے لیے قوم کو چاہیے کہ وہ نیا سیاسی انداز اختیار کرے اور اس تضاد سے باہر نکلے کہ فوج کی شراکت کے ساتھ جمہوریت کا سفر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ بعض ملکوں میں دونوں فریقین کے درمیان اشتراک کار موجود ہے لیکن ہماری کہانی مختلف ہے۔ جب فو بہت زیادہ بالادست ہو جائے تو اس کی شراکت، سیاسی قوتوں کے مقابلے میں اسی قوت کو مضبوط بنائے گی جس سے گریز کیا جانا چاہیے۔

کسی بھی جمہوری معاشرے میں جمہوریت کا ایک واضح اظہار انتخابات کا تسلسل ہوتا ہے او لوگ ووٹ کی طاقت کی بنا پر جمہوری اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں۔ انتخابات جمہوری استحکام کے لیے ایک مضبوط ذریعہ ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ انتخابات واقعی انتخابات ہوں، یعنی شفاف انداز میں ہوں تاکہ لوگوں کے سیاسی فیصلوں کو طاقت دی جا سکے۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں انتخابات کا عمل بھی سلیکشن کے عمل میں تبدیل ہو گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں 1970ء کے انتخابات کے بعد کوئی شفاف الیکشن نہیں ہوا۔ ہر انتخابات میں پس پردہ قوتوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور انہی کی بنیاد پر یہ طے کیا گیا کہ کن لوگوں کو اقتدار میں لانا ہے اور کن کو اقتدار سے باہر رکھنا ہے۔ ہمیں اس غلط فہمی سے بھی باہر نکلنا ہوگا کہ لوگ یہاں جمہوریت کے لیے ووٹ دیتے ہیں کیوں کہ جو ووٹ ڈالنے کا طریقہ کار موجود ہے، وہ کسی بھی طرح جمہوری نہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم ووٹ خالصتاً ذات برادری، مذہبی بنیادوں فرقوں اور لسانی بنیادوں، شخصیت پرستی، تشدد، خوف، جبر اور دھونس دھاندلی سمیت پیسے لے کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں جو خالصتاً جمہوریت کی ترقی کے لیے ووٹ ڈالتے ہیں۔ اس لیے ووٹ کے انداز اور طریقہ انتخاب کو بدلنا ہوگا اور یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کے لیے سیاسی وسماجی سطح پر ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستانی معاشرہ اور قیادت کا بحران

پاکستان اس وقت جن بڑے بحرانوں سے گزر رہا ہے، ان میں ایک بڑا بحران قیادت کے فقدان کا بھی ہے۔ یہ معاملہ محض سیاسی سطح پر ہی نہیں بلکہ سماجی، معاشرتی اور مذہبی سطح پر بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے مسائل، بے چینی اور اضطراب کے باوجود پاکستانی معاشرہ اور اس کے طبقات ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں کوئی فرد یا ادارہ موجود نہیں جو ان کی قیادت کر سکے۔ یہ بحران اس لیے بھی پیدا ہوا کہ ماضی میں موجود تمام جماعتوں نے اپنی اپنی سطح پر بدترین نااہلی، بدعنوانی اور کرپشن سمیت لوٹ کھسوٹ، بے ضابطگیوں اور وقتی مفادات کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ قیادتوں کی اس ناکامی کے باعث ہمیں مجموعی طور پر معاشرے کے اندر فساد اور انتشار کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ قیادت کے عمل میں ہم سیاسی بانجھ پن کا شکار ہو گئے ہیں۔ گھر اور خاندان سے لے کر معاشرے کے مجموعی اداروں بشمول سیاسی جماعتوں میں قیادت کا ایک ایک خلا پیدا ہو گیا ہے کہ ہم بغیر قیادت کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جو قیادتیں ہم پر مسلط ہوئی ہیں یا ہم پر مسلط کی گئی ہیں وہ عوامی اعتماد و تائید سے محروم ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فساد اور انتشار کو روکنے والی قیادت ہی درحقیقت خود ہی فساد اور انتشار کا حصہ بن گئی ہے۔ دوسری طرف ہم اپنی قیادت پر نظر ڈالیں تو اس میں اخلاقی اور فکری انحطاط، سوچ و فکر کا فقدان نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ یہ قیادت اپنے طرزِ عمل سے ملک میں طوائف الملوکی کا منظر بھی پیش کر رہی ہے۔ موجودہ صورت حال میں لوگ قیادتوں سے مایوس نظر آتے ہیں اور ان کا ان قیادتوں کے ساتھ آگے بڑھنے اور ساتھ چلنے کا عمل عملاً کمزور ہو گیا ہے۔ ماضی کی بڑی بڑی سیاسی تحریکیں اور عوام کا جم غفیر سکڑ کا اپنی بے بسی کی تصویر دکھا رہا ہے اور سیاسی قیادتیں عوام کی اس لاتعلقی پر پریشان ہیں۔ معروف دانشور، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار عبدالکریم عابد اپنی کتاب ''سیاسی و سماجی تجزیے'' میں شامل مضمون ''مسلم معاشرے میں اجتماعی قیادت کیوں نہیں ابھرتی؟'' کے صفحہ 321 پر لکھتے ہیں:

''مسلمان معاشروں کا ایک مسئلہ اس کے مختلف عناصر کے درمیان ذہنی اور مزاجی تضاد کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور یہ ان تضادات کا نتیجہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی اجتماعی قیادت نظر نہیں آتی۔ قیادتوں کے نام پر ایسے گروہ، جھتے اور ٹولے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ افہام و تفہیم سے اور ہم قدم ہو کر نہیں چل سکتے۔ سب سے بڑی خرابی جس نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور قیادت کے معیار میں عوام اور خواص کی پسند کو الگ کر دیا ہے، وہ یہ کہ جسے عوام رہنما بناتے ہیں اسے خواص مسترد کر دیتے ہیں اور خواص کی جو پسند ہوتی ہے وہ عوام کو منظور نہیں ہوتی۔ اس طرح کے معاشرے کے دل اور دماغ میں ہم آہنگی کی بجائے نزاع کی کیفیت برپا رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے خواص اپنے عوام سے اور عوام اپنے خواص سے مایوس ہو جاتے ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ میں قیادت کا بحران اور یہ دیوالیہ پن کیوں کر پیدا ہوا اور کیا وجہ ہے کہ ماضی کی شاندار قیادتیں جن میں قائداعظم محمد علی جناحؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ذوالفقار علی بھٹو، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالستار نیازی، مولانا مفتی محمود، خان عبدالغفار خان، خان عبدالولی خان، جی ایم سید، میر غوث بخش بزنجو جیسے لوگ نایاب ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ مختلف نظریات اور سوچ کے باوجود لوگوں میں ہر دلعزیز تھے اور ان میں باہمی تعلق بھی محبت اور اخلاص کا تھا۔ لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان پر بدعنوانی کے الزامات نہیں لگے۔ یہ لوگ اپنے اصولوں، نظریات اور سوچ کی بنیاد پر لوگوں کے اندر اپنی سیاست کو آگے بڑھاتے رہے، لیکن آج کی قیادت ماضی کی قیادت سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں نہ تو علمی گہرائی ہے اور نہ ہی نظریات سے مضبوط وابستگی اب ان کا منتہا ہے۔ ان لوگوں نے عقلی سیاست کی بجائے جذباتی سیاست کو فروغ دیا اور اس جذباتی سیاست کے پیچھے ان کی وقتی اور مفاداتی سیاست کارفرما تھی۔ دراصل قیادت کا یہ بحران اس لیے بھی سامنے آیا کہ اب لوگوں کی نظروں میں وہ سب ہے جو بظاہر سامنے بھی ہے اور جو کھیل پردے کے پیچھے کھیلا جا رہا ہے وہ بھی کافی حد تک بے نقاب ہو گیا ہے۔ لوگوں کو حیرانی ہے کہ ان کی سیاسی قیادتیں نہ صرف ان کا بری طرح سیاسی استحصال کرتی رہی ہیں بلکہ انہوں نے در پردہ عوام کے نام ہر سول اور فوجی اسٹیبلیشمنٹ سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی سیاست اور حکومت کو آگے بڑھایا ہے۔ ملک میں چلنے والی مختلف تحریکیں بھی در پردہ اسٹیبلیشمنٹ کی مدد سے چلائی گئی اور عوام محض ایک پتلی تماشے کے طور پر مداری کے ہاتھوں میں کھیلتے گئے۔ سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور نواز شریف پہلے ہی میثاق جمہوریت کے معاہدے کے دوران یہ اتفاق کر چکے ہیں کہ انہوں نے ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کیا، وہ اسٹیبلیشمنٹ کی مرضی سے کیا تھا۔ پی این اے کی تحریک ہو یا ایم آر ڈی یا اے آر ڈی کا مزاحمتی کردار، ہر سطح پر یہ لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کا شکار رہے۔ دوسری طرف ہماری سیاسی قیادتوں نے صرف در

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف اقتدار کی سیاست کو فروغ دیا اور انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ اقتدار کس قیمت پر وصول کیا یا ہے۔ سیاسی محاذ آرائی کا پیدا کرنا ان کے مخصوص سیاسی ایجنڈے کا حصہ تھا اور اگر ملک میں جو بھی ہی حکومت اپنی مدت پوری نہیں کر سکی تو اس میں فوج کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاسی قیادتیں بھی بری الذمہ نہیں۔ ہماری فوجی قیادتوں کو آئینی کردار ادا کرنے کا مشورہ دینے والے بھی بہت سے سول رہنما تھے۔ جہاں تک جمہوریت کی مضبوطی اور اس کو استحکام دینے کی بات ہے تو جمہوریت کا تماشا ہی ہم نے ل ہی نام نہاد سیاسی قیادتوں کے ذریعے دیکھا ہے۔ ملک کو محض فوجی آمریتوں کا ہی سامنا نہیں رہا بلکہ سول اور سیاسی آمریتوں کی بھی ایک لمبی کہانی یہاں موجود ہے۔ جمہوری قیادت کے مقابلے میں شخصی قیادت اور شخصیت پرستی کو فروغ دیا گیا۔ لوگوں کی زبانوں پر تالہ بندی کی گئی اور جس نے بھی قیادت کے خلاف زبان کھولی تو اسے اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اخلاقیات سے عاری قیادتوں نے بے اصولیوں کے وہ ریکارڈ قائم کیے کہ ان پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ جس انداز میں یہاں سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کیں یا اس سے جبر کی بنیاد پر پس پردہ قوتوں نے وفاداریاں تبدیل کروائی وہ سب ہماری سیاسی تاریخ کا بدنما داغ ہے۔ بالخصوص جس انداز میں سیاسی قیادتوں نے ''نظریہ ضرورت'' کی سیاست کو اپنایا اس سے ان کی اخلاقیات کا دیوالیہ دیکھا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہر برے عمل کو نظریہ ضرورت کے تحت درست قرار دیا گیا، مثلاً جنرل ضیا الحق اور جنرل پرویز مشرف کی فوجی وردی کو جواز بنانے کے لیے بعض رہنماؤں نے خلفائے راشدین کی مثالیں پیش کر کے اس کا جواز فراہم کیا اور ثابت کیا کہ اسلام کی رُو سے فوج کے سربراہ کا ان حالات میں وردی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ درست تھا۔

سیاسی قیادتوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کرپٹ اور بدعنوان ہیں۔ بدقسمتی سے اہل سیاست نے اپنے اندر ایسا کوئی احتسابی نظام قائم نہیں کیا جو ان کرپٹ افراد کی بدعنوانیوں کا راستہ روک سکے۔ سیاست کو کاروبار بنایا گیا ہے اور اس کا مقصد اپنے کاروبار کو وسعت دینا بن کر رہ گیا ہے۔ سیاسی قیادتوں نے مڈل کلاس طبقے کو آگے لانے کی بجائے کرپٹ اور بدعنوان مافیا سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور اس طرزِ عمل کی وجہ سے ہماری سیاست آج کرپٹ مافیا کے ہاتھوں یرغمال بن کر رہ گئی ہے۔ اسی طرح عوام کی طاقت کو تسلیم کرنے کی بجائے درپردہ قوتوں کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ اسٹیبلیشمنٹ ہے۔ یہی وجہ ہے سیاسی قیادتوں نے عوام کو منظم کرنے کی بجائے چور راستہ اختیار کیا اور انہیں یہ ڈر بھی رہا کہ اگر عوام کو منظم کیا گیا تو یہ عمل خود ان کے لیے بھی احتساب کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس لیے لوگوں کو منظم کرنے کے عمل سے راہ فرار اختیار کی گئی۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری بیشتر سیاسی قیادتیں سیاسی عمل پر یقین نہیں رکھتیں اور چاہتی ہیں کہ جلد از جلد جائز اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناجائز اقتدار کی بندر بانٹ میں انہیں شامل کیا جائے۔ سیاسی قیادتیں جلد بازی اور عجلت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور لوگوں میں ٹھہراو پیدا کرنا اور ان کو عقلی امور میں لانا ان کے ایجنڈے کا حصہ نہیں۔ اس کے خیال میں پہلے سے موجود طاقت کے مراکز کے ساتھ معاملات کو طے کر کے ہی آگے بڑھا جا سکتا ہے اور ان قوتوں کو چیلنج کرنے کا مقصد اپنے آپ کو اقتدار کے عمل سے دُور رکھنے کے مترادف ہوگا۔ معروف صحافی اطہر ندیم اپنی کتاب ''پاکستان کے سیاسی حقائق'' میں شامل مضمون ''پاکستان میں جمہوریت تصور سے حقیقت کیوں نہ بن سکی؟'' کے صفحہ 120-119 پر لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی سیاست اور سیاسی رویوں کو دیکھیں تو شاید یہ سمجھ میں آ جائے کہ جمہوری تصور کیوں معاشرتی رویے میں نہ ڈھل سکے۔ کیوں عوام سے ووٹ لے کر منتخب ہو کر آنے والا لیڈر بھی ''بادشاہ'' بننے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ساتھی اور حامی بھی اسے ''بادشاہ'' بنانے میں لگ جاتے ہیں، کیوں کہ کوئی منتخب لیڈر خود کو عوام یا کم از کم اپنے ووٹروں کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا، کیوں کہ ''بادشاہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا۔ باقی رہے وہ جو غیر جمہوری طریقے سے اقتدار میں آتے ہیں یا اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں تو وہ خود کو عوام یا کسی کے سامنے جواب دہ کیوں سمجھیں۔''

یہ درست ہے کہ پاکستانی معاشرے میں ایک طویل عرصے تک فوج کی براہِ راست حکمرانی رہی ہے اور اس حکمرانی نے سیاسی عمل کو کمزور کیا ہے۔ دراصل ایک اچھی سیاست کا ارتقا بھی اچھی جمہوریت اور اصولوں و نظریات کی سیاست سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں ہر سطح پر اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشی گراوٹ دیکھنے میں آئے تو پھر اچھی سیاسی قیادت کا پیدا ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشروں کے نصیب میں پھر ایسی قیادتیں مسلط ہوتی ہیں جو عملی طور قیادت کی حق دار نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ لوگوں کی نمائندگی یا قیادت کا حق ادا کر سکیں۔ اگرچہ سیاسی قیادت کے ارتقا کے سازگار ماحول ہونا ضروری ہے مگر بعض اوقات بحرانوں کی کیفیت میں بھی جو قیادتیں جنم لیتی ہیں ان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ قیادت کا تو اصل امتحان شروع ہی بحرانوں کے اندر ہوتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس حکمت عملی کے تحت اپنے کام کو آگے بڑھاتی ہیں۔ اچھی قیادت کا تصور سیاسی نظام کے تسلسل کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور کیوں کہ یہاں سیاسی نظام کا تسلسل نہیں تو ہم اس کے نتیجے میں قیادت کے سنگین بحرانوں سے گزر رہے ہیں۔ اچھی اور حقیقی قیادت کا تصور عوام کے اندر سے بھی جنم لیتا ہے، لیکن کیوں کہ یہاں جو قیادتیں سامنے آئیں وہ عوام سے نہیں بلکہ جی ایچ کیو کی سیاست اور ان کی مرضی اور منشا کے ساتھ لائی گئی جن میں ذوالفقار علی بھٹو، نواز شریف، محمد خان جونیجو، غلام مصطفیٰ جتوئی، معراج خالد، شہباز شریف، چوہدری نثار، مشاہد حسین، چوہدری شجاعت، میر ظفر اللہ جمالی، آفتاب شیر پاؤ، فاروق

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری، بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری، یوسف رضا گیلانی، جاوید ہاشمی سمیت سب ہی سیاست میں فوج کی حمایت اور مدد کے ساتھ سامنے آئے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے بعد میں فوج کے خلاف مزاحمت بھی کی لیکن عملاً وہ اس طاقت کے مرکز کی سیاست سے باہر نہیں نکلے۔ جی ایچ کیو کو یہاں سیاست دان بنانے اور ان کا بگاڑنے کا خصوصی ٹاسک ملا ہوا ہے اور یہ ہی ہماری سیاست کے اصل وارث بن گئے ہیں۔ جب سیاسی قیادتوں کا ظہور یہی سے ہوگا تو آپ ان کو عوام میں کیسے مقبول بنا سکتے ہیں کیوں کہ اس طرز کی قیادتیں سمجھوتوں کی سیاست کی عادی ہوتی ہیں اور ان ہی قوتوں کے لیے کام کرتی ہیں جو ان کے اصل وارث ہوتے ہیں۔

اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ملک میں قیادت کے بحران نے ہمیں کہاں لا کھڑا کر دیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ بے پناہ وسائل کے باوجود یہ قیادتیں لوگوں کا اعتماد حاصل نہیں کر پا رہی اور کیوں غیر یقینی میں ایک لاتعلقی کا احساس غالب ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو قیادتوں کے سامنے جو نکات سامنے آئیں گے ان میں ان کا دوہرا معیار، تضادات پر مبنی رویے، کرپٹ اور بدعنوان عناصر کی سرپرستی، بے اصولیاں، بے ضابطگیاں شامل ہوں گی۔ قیادتوں کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اب وہ معاشرے میں غیر اہم ہوگئی ہیں اور اس کے پیچھے ان کا سیاسی کردار ہے۔ اس کے لیے انہیں اپنی ماضی اور حال کی غلطیوں کو تسلیم کرنا ہوگا اور اپنے آپ کو ان تمام برائیوں سے لاتعلق کرنا ہوگا جو بری قیادت کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ اعتماد اسی صورت میں بحال ہوگا جب ان کے سامنے بڑے اور قومی سیاسی مفادات غالب ہوں گے اور یہ اپنی ذات سے نکل کر ایک بڑے قومی تناظر میں صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جب سیاسی قیادتیں جمہوری سیاسی طرزِ فکر اپنائیں گی اور اصولوں، نظریات کی سیاست کو تقویت دیتے ہوئے سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنانا، فوج کے سیاسی کردار کے خاتمہ، عوام کو منظم کرنا اور ان کو اصل طاقت سمجھنا، کرپٹ اور بدعنوان سیاست سے اپنے آپ کو بھی علیحدہ کرنا اور ایسے عناصر کی سرپرستی سے بھی گریز کرنا شامل ہے۔ یہاں مراد محض سیاسی قیادتیں نہیں بلکہ معاشرے کے دیگر طبقات میں قیادت کا یہ بحران ایک سنگینی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ آپ کو اب اچھے عالم اور فاضل رہنما ملتے ہیں اور نہ ہی اچھے استاد اور اہل دانش سب ہی فکری انحطاط اور زوال پذیری ہے اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہاں اچھی اور حقیقی قیادت کے ابھرنے کا تصور اب ایک خواب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

آپ معاشرے میں عام لوگوں اور بالخصوص نئی نسل کے لوگوں سے پوچھیں کہ ان کے ہیروز کون ہیں تو آپ کو اس میں سب سے کم اہل سیاست نظر آئیں گے۔ کوئی ان کو مقبول اور ہیرو کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور لوگوں میں قیادتوں کے بارے میں اتنا غم و غصہ ہے کہ ان کے بارے میں اچھے الفاظ کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔ اس کی ایک وجہ جہاں خود اہل سیاست ہیں تو وہاں وہ پس پردہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومیں بھی ہیں جنہوں ایک خاص ذہن کے ساتھ یہاں سیاسی قیادتوں کے مثبت امیج کو بننے ہی نہیں دیا۔ آج بھی آپ ہمارے میڈیا میں دیکھیں تو آپ کو سب سے زیادہ تنقید اور غم وغصہ سیاست اور سیاست دانوں پر نظر آتا ہے۔ یہاں ایک خاص شعور کے ساتھ بیوروکریسی، فوج اور عدلیہ میں موجود کرپشن کی پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ اس طرزِ عمل نے معاشرے میں سیاست سمیت سیاست کرنے والوں کو ایک گالی بنا کر پیش کیا ہے اور اس کے ذمہ دار کوئی فریق نہیں بلکہ ہم سب اس اجتماعی جرم میں شامل ہیں۔ میڈیا ایسے لوگوں کو ہیروز بنا کر پیش کرتا ہے جو فکری طور بانجھ پن کا شکار ہوتے ہیں مگر گلیمر کی اس دنیا میں ہم کھلاڑیوں، فنکاروں، اداکاروں اور ماڈل گرلز کو تو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں جو بری بات نہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے اس عمل میں عالم، فاضل، دانشور، سنجیدہ افراد، لکھاری، سیاست دان، سماجی رہنما، مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے اہم افراد، تحقیق پر کام کرنے والے اہم عناصر سب ہی پیچھے چلے گئے ہیں۔ جب معاشروں کے اندر ان لوگوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی اور ان کو بطور ہیروز نہیں پیش کیا جائے گا تو نئی نسل ان لوگوں کو جان سکے گی اور نہ ہی ان کو اپنا ہیرو سمجھے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاشرے حقیقی ہیروز اور قیادت کو متعارف کروانے کے عمل میں بہت پیچھے رہ جائے گا اور ہم دنیا کے سامنے فکری انحطاط کا شکار ہوکر خود اپنے آپ کو تماشے کے طور پر پیش کریں گے۔

سیاست سے وابستہ افراد کو سوچنا ہوگا۔ ان کے طرزِ عمل سے نوجوان طبقہ میں جو مایوسی اور لاتعلقی پیدا ہو رہی ہے وہ صرف محض قیادت کا بحران ہی نہیں بلکہ سیاسی نظام کی ایک مکمل ناکامی کے تصور کے ساتھ سامنے آئے گا۔ جب سیاست اس ملک میں نہیں ہوگی اور معاشرے کو جمہوری بنانے کا عمل پیچھے رہ جائے گا تو پھر اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم ڈکٹیٹرشپ ہی کا حصہ رہیں اور چاہے یہ ڈکٹیٹرشپ فوج کی ہو یا سیاست دانوں کی دونوں سے قوم کو نقصان کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ قیادت کے فقدان کا ایک بڑا معاملہ ہمارا گرتا ہوا سماجی اور اخلاقی تربیت کا ڈھانچا ہے اور جب تک اس میں اصلاح و احوال کا راستہ تلاش نہیں کیا جائے گا اچھی قیادت کے ابھرنے کے امکانات مخدوش ہوتے جائیں گے۔

قیادت کا یہ بحران محض پاکستان ہی کا معاملہ نہیں بلکہ آپ دیکھیں جہاں عالمی دنیا اس کا شکار ہے، وہیں بالخصوص مسلم دنیا اس میں زیادہ پسماندہ نظر آتی ہے کیوں کہ سیاسی نظام کا کمزور ہونا، جمہوریت سے دوری مسلم معاشروں کا سب سے بڑا المیہ ہے کیوں کہ آج بھی مسلم ملکوں میں آپ کو آمروں اور بادشاہت پر مبنی فردِ واحد کا اقتدار بالادست نظر آتا ہے۔ جن ملکوں میں تھوڑی بہت جمہوریت ہے وہاں بھی آمرانہ قوتیں اس کو یک طرفہ نظام پر چلانا چاہتی ہیں۔ قیادت کے اس بحران کی وجہ سے مسلم دنیا سمیت پاکستان عالمی دنیا میں سیاسی تنہائی کا شکار ہے اور یہ عالمی قوتیں ہمارے جیسے ملکوں میں کمزور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیادتوں کے باعث وہ سب کچھ کروانے میں کامیاب ہوتی ہیں جو ان کے ان عالمی ایجنڈے کا حصہ ہوتا ہے۔ آپ پاکستان کے بحران کو دیکھیں اور جو قیادتیں گزشتہ بیس برسوں سے ہم پر قابض رہی ہیں اور جو آج بھی قابض ہیں انہوں نے قیادت کے تناظر میں جو کردار ادا کیا، اس میں قومی مفادات کے معاملات پر کہاں تک مزاحمت دکھائی گئی۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو بڑی سیاسی شخصیات ہیں، ان کی ساری سیاست امریکہ اور اسٹیبلیشمنٹ کے گرد گھومتی رہی ہے اور اس میں قومی مفادات بہت پیچھے رہ گئے۔ آج کی دنیا میں جو ہمیں بڑے بڑے چیلنجز ہیں، ان سے نبرد آزما ہونا ایک مضبوط قیادت کی موجودگی کے بغیر ممکن نہیں اور جو قیادتیں آج یہاں موجود ہیں، ان سے یہ توقع رکھنا کہ کہ وہ کوئی بڑا کردار ادا کر سکیں گی، فی الحال ایک مشکل بات لگتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھوٹے صوبوں کا احساسِ محرومی اور صوبائی خودمختاری کا مسئلہ

ریاستی حوالے سے پاکستان کے بحران کو سمجھنے کے لیے ہمیں ملک کے چاروں صوبوں میں ایک دوسرے کے بارے میں سیاسی، سماجی اور معاشی تحفظات کو سمجھنا ہوگا کیوں کہ اس میں کوئی دو آراء نہیں کہ ملک کے اندر چاروں صوبوں میں ایک دوسرے کے بارے میں وہ رائے نہیں جو وفاق کی سیاست کے لیے سازگار ہو یا چاروں صوبوں اور بالخصوص چھوٹوں صوبوں کے مفادات کو یکجا کر سکے۔ ملک کے تین صوبے سندھ، بلوچستان اور خیبر پختون خوا، اسلام آباد اور بڑے صوبے کی اپنے اوپر حاکمیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تینوں چھوٹے صوبوں کا خیال ہے کہ پنجاب اور اسلام آباد کی بالادستی اور ایک دوسرے کے مفادات پر سمجھوتوں نے ان کو سیاسی، سماجی اور معاشی امور میں پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اس بارے میں تینوں صوبوں میں موجود قوم پرست اہل سیاست اور وہاں کی سیاسی اشرافیہ، دونوں صوبوں کے سرکاری اعداد و شمار کی مدد سے ثابت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے ترقی اور خوش حالی کے عمل میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان صوبوں کا یہ الزام بھی ہے کہ اسلام آباد اور پنجاب کی طاقت نے جان بوجھ کر ان کے چھوٹے صوبوں کو ترقی کے عمل میں شامل نہیں کیا تاکہ وہ پس ماندگی کا شکار رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں پاکستان کے تناظر میں اسلام آباد کا مقدمہ چھوٹے صوبوں کے حوالے سے کافی کمزور نظر آتا ہے۔ عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ چھوٹے صوبوں اور اسلام آباد سمیت پنجاب کے درمیان اعتماد سازی کا فقدان نظر آتا ہے۔ بلوچستان میں تو وہاں کے قوم پرستوں نے علیحدگی پسند تحریک بھی شروع کر رکھی ہے اور بلوچستان لبریشن فرنٹ اور اس کے حامی پاکستان کے دستور اور آئینی حدود کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وہ پاکستان سے آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور پاکستان کی ریاست کی رٹ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ صوبہ خیبر پختون خوا میں بھی فوجی آپریشن کے نام پر جو کچھ ہوا، وہاں بھی لوگ ریاست سے نالاں نظر آتے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارا مرکز، جس کا کام چاروں اکائیوں کو مضبوط بنانا اور ان و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پنے ساتھ ملائے رکھنا تھا، عملاً ناکام ہوا ہے۔ جب لوگ ریاست کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف اسلام آباد اور پنجاب کی نمائندگی کرتی ہے تو یہ اہم اعتراض ہے اور اس پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ریاست جب فریق بن جائے اور اس کی بعض اکائیاں اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں یا اس پر شدید تحفظات رکھتی ہوں، تو یہ ایک بڑا لمحہ فکریہ ہوتا ہے۔ بلوچستان کی صورت حال اس قدر تشویش ناک ہے کہ اس کے بعض علاقوں میں پاکستان کی حمایت میں بات کرنا، جھنڈا لگانا اور قومی ترانہ گانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ ریاست کی ناکامی ہے کہ 63 سال گزرنے کے باوجود صوبوں کے درمیان وہاں کی خودمختاری، مالیاتی وسائل کی منصفانہ تقسیم، پانی میں حصہ داری کا تنازع، صوبوں کا اپنے قدرتی وسائل پر مکمل اختیار، حقیقی پارلیمانی جمہوری طرز حکمرانی، پارلیمنٹ کی بالادستی اور صوبوں کے درمیان نئے سماجی یا عمرانی معاہدے کے معاملات تا حال الجھاؤ کا شکار ہیں۔ یہ واقعی بدقسمتی ہے کہ چھوٹے صوبوں کے مسائل یا ان کی خودمختاری کے معاملات حل ہونے کی بجائے جوں کے توں ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں زیادہ الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ 2010ء میں این ایف سی ایوارڈ کی تقسیم کے حوالے سے صوبوں کے درمیان اتفاقِ رائے ایک اچھا عمل تھا۔ اس کے باوجود صوبوں کے عوام کے اندر تحفظات پائے جاتے ہیں۔ اس این ایف سی ایوارڈ کی منظوری کے بعد بھی صورت حال کوئی بہت زیادہ تبدیل نہیں ہوئی ہے۔ ان معاملات میں ریاست کی سنجیدگی خود ایک سوالیہ نشان ہے۔

سندھ کے معروف دانشور جامی چانڈیو اپنی کتاب ''پاکستان میں جمہوری وفاقیت کا بحران اور قومی خودمختاری'' میں صوبوں کی خودمختاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''یہ صورتِ حال جس سنگین ریاستی بحران کا ہمہ گیر عکس پیش کرتی ہے اس کا کوئی منصفانہ اور متوازن حل نکلتا نظر نہیں آتا، نہ ہی حکومتی و ریاستی سطح پر اس کے لیے مطلوبہ سنجیدگی نظر آتی ہے۔ اس لیے اب یہ تاثر تیزی کے ساتھ ملک میں جڑیں پکڑ رہا ہے کہ یہ ملک مافیاؤں اور ناجائز مفادات کا مسکن اور ایک لاعلاج مریض بنتا جا رہا ہے اور اب اس ملک سے کسی بہتر تبدیلی اور انصاف کی توقع کرنا محض ایک خود فریبی ہو گی۔ نئی نسل تو ایک طرف لیکن جس نسل نے یہ ملک بنایا تھا، اب وہ بھی مکمل طور پر پاکستان کے بہتر جمہوری، قومی برابری پر مبنی اور اس کے سیکولر مستقبل سے مایوس نظر آتی ہے۔'' (صفحہ 7)

جامی چانڈیو کے خیالات ظاہر کرتے ہیں کہ بلوچستان کی طرح سندھ میں بھی ایسے دانشور موجود ہیں جو اپنی علمی صلاحیتوں کے باوجود اس ملک کے مستقبل اور صوبائی خودمختاری کے معاملے میں خاصے مایوس نظر آتے ہیں۔ جامی چانڈیو نے بھی ایک ایسی ہی تصویر پیش کی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چھوٹے صوبوں میں جو احساسِ محرومی ہے، وہ حقیقت کے کافی قریب ہے۔ لیکن ہم نے جو کچھ حاصل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے، وہ اسی آئین اور سیاسی جدوجہد کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ اگر ہم اس سے انحراف کر کے الگ سے اذان دیں گے تو ہماری جدوجہد کامیاب ہونے کی بجائے مزید مایوسی کا شکار ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ 2010ء میں این ایف سی ایوارڈ کے تناظر میں جو پیش رفت ہوئی ہے، اسے ایک اچھا آغاز کہا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیں ہر چیز فوری طور پر مل جائے اور بعض اوقات اعلانات کے باوجود اس میں مزید جدوجہد اور سیاسی عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

جامی چانڈیو اس مایوسی کے باوجود کہتے ہیں:

''اس کے باوجود ملک کے تمام روشن خیال اور دُور اندیش لوگ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اگر ان تمام مایوسیوں اور پیچیدگیوں کے باوجود ملک کے باقی رہنے اور چلنے کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ نظام کی تبدیلی، حقیقی جمہوریت اور محض برائے نام اور رسمی صوبائی خودمختاری نہیں بلکہ چاروں صوبوں میں بسنے والی تاریخی قوموں کی مکمل قومی خودمختاری اور ان قوموں کے درمیان ایک نیا عمرانی اور سیاسی معاہدہ ہو سکتا ہے جس کی بنیاد 1940ء کی قرارداد لاہور پر مبنی ہو۔'' (صفحہ 7)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والے افراد ہمیں ملک کے اہم عہدوں، بیوروکریسی، ججوں کے عہدوں اور دیگر اہم مناصب پر نظر نہیں آتے تو یقیناً اس میں کافی حد تک سچائی ہوگی اور اس بات کو بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب کی بالادستی کے پہلو نمایاں ہوں گے۔ لیکن ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سندھ سے ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو، غلام مصطفےٰ جتوئی، محمد خان جونیجو سمیت دیگر لوگ اہم عہدوں پر رہے ہیں۔ اس پر دلیل یہ دینا کہ ان کے پاس کوئی اختیارات نہیں تھے، تو اس طرح سے جو لوگ پنجاب سے آئے ان کے پاس کس قدر اختیارات تھے، اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ نواز شریف تو خود اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا شکار رہے اور نہ صرف ان کی حکومت کو دو بار برطرف کیا گیا بلکہ ان کو جلاوطنی بھی اختیار کرنا پڑی۔ اس لیے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ چھوٹے صوبوں کے احساسِ محرومی کی ایک وجہ اسٹیبلشمنٹ اور پنجاب کی بالادستی ہے، وہاں یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ چھوٹے صوبوں کی اپنی قیادت بھی اپنے مسائل کی ایک حد تک ذمہ دار ہے۔ وہ اگر معاملات کو سیاسی تنہائی میں دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی اپنی مرضی ہے لیکن خود کو ساری صورتِ حال سے بری الذمہ قرار دینا ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ نہیں۔

معروف دانشور، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار مرحوم عبدالکریم عابد اپنی کتاب ''سیاسی و سماجی تجزیے'' میں شامل مضمون ''جمہوریت کی تباہی میں چھوٹے صوبوں کا کردار'' میں لکھتے ہیں:

''پاکستان میں جمہوریت کے پروان نہ چڑھنے کی ذمہ داری یقیناً پنجاب کے حکمران

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبقہ پر ہے اور یہ منطق بھی غلط ہے کہ جو کچھ پنجاب کی فوجی اور سول بیوروکریسی نے کیا، اس کا پنجاب کے دوسرے طبقات اور عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ جب حکمران طبقہ یہ کر رہا تھا تو وہ اکیلا نہیں تھا، پنجاب کے خواص اور عوام دل و جان سے اس کے ساتھ تھے اور اس طرزِ حکمرانی اور طرزِ استحصال کے ثمرات سے مستفید بھی ہو رہے تھے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک رُخ ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ جمہوریت کی تباہی کے عمل میں پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کی سیاسی قیادت کی بے اصولی اور موقع پرستی بھی شامل تھی۔ صورتِ حال ہرگز یہ نہیں تھی کہ پنجاب میں صرف حکمران طبقہ تھا بلکہ یہاں جمہوریت، وفاقیت، صوبائی خود مختاری اور منصفانہ اقتصادی نظام کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگ بھی موجود تھے اور خاصے منظم تھے، ان کے پاس اخبارات بھی تھے لیکن دوسرے صوبوں کی سیاسی قیادتوں نے ان سیاسی عناصر کے ساتھ اشتراکِ عمل کی بجائے حکمران طبقے کے ہاتھوں کا کھلونا بننا زیادہ پسند کیا۔ انہوں نے اپنا سارا وزن جمہوریت اور وفاقیت کی بجائے آمریت اور غیر جمہوری مرکز کے پلڑے میں ڈال دیا۔''

عبدالکریم عابد صاحب اسی مضمون کے صفحہ 127-126 پر لکھتے ہیں:

''سرحد کے ایک رہنما قیوم خان تھے، یہ بھی کوئی معمولی رہنما نہیں تھے۔ ڈاکٹر خان نے نہ تو کانگریسی وزیر اعلیٰ اور نہ ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے صوبہ سرحد کو کچھ دیا لیکن قیوم خان نے واقعی سرحد کو ٹھوس مادی ترقی سے ہمکنار کیا اور اس بنا پر وہ سرحد کی ایک اہم سیاسی قوت تھے لیکن خان موصوف نے بھی اپنے اتحاد کے لیے کبھی پنجاب کی عوامی قوتوں کو پسند نہیں کیا۔ ان کا گٹھ جوڑ اوپر کے اس حکمران طبقے سے تھا جس نے ظلم و جبر کی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ ان کے سائے میں خود خان قیوم کی حکومت بھی حزبِ اختلاف کو کچلنے کی کارروائیاں بے جھجک کرتی رہی۔ انہوں نے نہ مانکی شریف کا لحاظ کیا نہ دوسرے مسلم لیگیوں کا اور وہ سرحد کا مردِ آہن بن کر اپنے ہتھوڑے سے جمہوریت کا سر کچلتے رہے۔ ادھر غفار خان کو سوائے پختونستان کی رٹ لگانے کے دوسری کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ پنجاب میں میاں افتخار الدین، محمود علی قصوری وغیرہ نے بڑی کوشش کی کہ غفار خان اپنی تنگ نظری چھوڑ کر قومی سیاست کے دھارے میں شامل ہو جائیں اور جمہوریت کے لیے جدوجہد کریں لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ سچ پوچھیے تو غفار خان نے یہ رویہ اختیار کر کے صرف پنجاب کے حکمران طبقہ کی خدمت کی کیوں کہ اس طرح وہ اپنے جابرانہ اور آمرانہ وجود کا جواز حاصل کرتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر اس رویہ سے کسی کو مایوسی ہوتی تھی یا نقصان پہنچتا تھا تو وہ پنجاب میں جمہوریت کے لیے جدوجہد کرنے والے عناصر تھے جو غفار خان کو اپنا ساتھی بنانا چاہتے تھے لیکن یہ نادان دوست جمہوریت پسندوں کو زخموں پر زخم اور چرکے پر چرکے لگاتے رہے۔''

عابد صاحب کا تجزیہ کافی جان دار ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں چھوٹے صوبوں کی سیاسی قیادتوں نے بھی اپنے آپ کو مقامی یا صوبائی سیاست تک محدود رکھا اور جو مواقع ان کو ملے کہ وہ قومی سیاست کا حصہ بن کر اپنا مقدمہ ایک قومی منظر نامے میں اجاگر کرتے، ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے لوگوں اور اسٹیبلشمنٹ کے کارندوں نے ان قوم پرست سیاست دانوں کے گرد گھیرا تنگ رکھا اور ان کو آگے بڑھنے کے مواقع نہیں دیئے گئے۔ لیکن یہ مواقع تو ان کو خود پیدا کرنے تھے اور ایسا نہیں کہ ملک کے دیگر حصوں یا پنجاب میں ان کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان قوم پرستوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ پورا پنجاب غلط ہے حالاں کہ پنجاب میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو دیگر صوبوں کے لوگوں کی طرح احساسِ محرومی کا شکار ہیں۔ جنوبی پنجاب میں جو غربت ہے، اس کے اعداد و شمار دیگر صوبوں کی بدحالی سے ملتے جلتے ہیں اور یہاں بھی لوگ ریاست کی بالادستی اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا شکار ہو کر معاشی، سیاسی اور سماجی بدحالی کا شکار ہیں۔ لیکن جب محض گالی دے کر یا سب کو ایک جیسا قرار دے کر بیان بازی یا تعصب پیدا کیا جائے گا تو وہ لوگوں کے اندر قربت پیدا کرنے کی بجائے دوریاں پیدا کرتا ہے۔ اگر چھوٹے صوبوں کے لوگ اور قیادت پنجاب کے اندر موجود جمہوریت پسند اور انصاف پسند طبقے سے سیاسی تعلق پیدا کرتی اور دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو اس سے جمہوریت کے عمل کو آگے بڑھانے میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔

قوم پرست ضرور ماتم کریں اور ان کے ساتھ یقیناً بہت زیادتی ہوئی ہے لیکن کچھ زیادتی انہوں نے خود اپنے ساتھ بھی کی ہے۔ قوم پرست جماعتوں کا بننا، ٹوٹنا، اس میں پھیلی ہوئی گروپ بندیاں، ایک دوسرے پر سنگین الزام تراشیاں، اپنی بات منوانے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کرنا اور اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کو خاندانی اور جاگیرداری سیاست کا حصہ بنانا ان کی سیاست کا اہم حصہ رہا ہے۔ ان کے علاقوں میں جو سیاسی، سماجی ڈھانچا نہیں بنا جن میں سکول، کالج، سڑکیں اور دیگر بنیادی ضروریات پوری کرنے کے پہلو تھے، تو اس میں ان کی اپنی سیاسی قیادت بھی تو ذمہ دار ہے۔ کیا انہیں ریاست نے روکا تھا کہ وہ اپنے علاقوں میں مقامی ترقی کے حوالے سے کچھ نہ کریں۔ پنجاب کے جنوبی حصہ میں بھی یہاں کے بڑے جاگیرداروں اور وڈیروں نے جو کچھ کیا اور جس انداز سے اپنے لوگوں کو پس ماندہ رکھا اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا حصہ بن کر اپنے ہی لوگوں کا استحصال کیا، اس کے وہ بھی تو ذمہ دار ہیں اور انہیں اپنی یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس موضوع پر ممتاز صحافی اطہر ندیم مرحوم اپنی کتاب ''پاکستان کے سیاسی حقائق'' میں شامل مضمون ''بلوچستان کے حقوق کا مسئلہ --- چند مناظر'' میں لکھتے ہیں:

''بلوچ سردار، جو قوم پرست کہلاتے ہیں اور بلوچوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں، کیا وہ اس میں عام آدمی کی بہتری کو بھی شامل رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان سرداروں میں سے کئی ایک اقتدار میں رہے ہیں بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ رہے ہیں مگر ان کے اقتدار سے ہٹنے کے ساتھ ہی رٹ شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بلوچستان میں احساسِ محرومی یا پسماندگی نہیں ہے، یہ ہے اور بہت ہے۔ مگر جب سردار اس کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو ایسا سیاسی طور پر کرتے ہیں اور اپنے سیاسی مفاد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اقتدار میں ہوں تو محرومی جاتی رہتی ہے، اقتدار سے نکلیں تو محرومی نے پھر ڈیرے لگا لیے۔'' (صفحہ 125-126)

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ہمیں اس بحران کو حل کرنے کے لیے نئے صوبوں کی ضرورت ہے۔ آج کل ملک میں نئے صوبوں کی بحث زوروں پر ہے اور صوبہ سرحد کے نام کی تبدیلی اور نیا نام خیبر پختونخوا رکھے جانے کے بعد ہزارہ صوبے کی تحریک، پہلے سے موجود سرائیکی صوبہ کا مطالبہ اور اس کے بعد پوٹھوہار صوبہ اور بہاولپور کی آزاد ریاست کے نعرے بھی گونج رہے ہیں۔ پنجاب کی انتظامی تقسیم پر آواز مسلم لیگ (ن) کے اندر سے بھی آئی اور اس کی قیادت مرکزی رہنما جاوید ہاشمی کر رہے تھے۔ معلوم نہیں ہم نئے صوبے بنانے کے معاملے میں کیوں پریشان ہیں اور اگر آزادی کے بعد سے ہندوستان میں نئے صوبے بن سکتے ہیں تو پاکستان میں کیوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔ چار صوبے کوئی حتمی فیصلہ نہیں اور اپنے حالات و واقعات کی روشنی میں نئے انتظامی یونٹ بن سکتے ہیں۔ جب ملک میں نئے اضلاع، تحصیلیں، ٹاؤن اور یونین کونسلیں بن سکتی ہیں تو نئے صوبے بنانے کے مطالبے پر کیوں اعتراض کیا جا رہا ہے۔ ویسے بھی نئے صوبے بنا کر بالخصوص پنجاب میں ہم چھوٹے صوبوں میں موجود پنجاب کے بڑے ہونے اور اس پر موجود تحفظات کو دُور کر سکتے ہیں۔ البتہ لسانی بنیادوں کی بجائے اگر معاملہ انتظامی بنیادوں پر طے ہو تو اس سے مسائل کم ہوں گے اور ہم آہنگی بڑھے گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیصلہ سازی کے عمل میں لوگوں کی شمولیت کا فقدان

کسی بھی معاشرے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں قومی، صوبائی، علاقائی، گھریلو، خاندانی او مقامی سطح پر موجود ہر شعبے میں جو بھی فیصلے کیے جائیں، ان میں ان یونٹوں کے سبھی ارکان کی شمولیت بالخصوص ان لوگوں، جن کے بارے میں فیصلے کیے جا رہے ہیں، کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے کیوں کہ جمہوریت کا حسن ہی اس بات میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد فیصلہ سازی کے عمل میں شامل ہوں۔ ایسا ہونے کی صورت میں فیصلوں کی ownership بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ اہم ہیں اور جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے، اس میں ان کی رائے کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس معاشرے کی سطح پر ہونے والے فیصلوں میں لوگوں کی رائے نہ لی جائے اور نہ ہی ان کے بارے میں کیے جانے والے فیصلوں میں ان کی شمولیت کے حق کو تسلیم کیا جائے، اسی طرح اگر اہم اور بنیادی نوعیت کے فیصلے اداروں کی بجائے افراد کے ماتحت ہوں اور اس سوچ کے پیچھے اصل طاقت عوام نہیں بلکہ مخصوص طاقتور گروپ ہوں، تو پھر معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی کیے جانے والے فیصلوں سے لاتعلق ہو کر اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیتے ہیں۔ پاکستان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ یہاں فیصلہ سازوں اور عام آدمی میں ایک واضح تضاد اور خلا کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ عوام کو فیصلہ سازی کے اداروں پر اعتماد ہے نہ ہی وہ ان اداروں سے کسی بھی قسم کی خیر کی توقع رکھتے ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ فیصلہ سازی کے ذمہ دار ادارے عوام کی بجائے کسی اور کے تابع ہوتے ہیں۔ فیصلہ سازی کرنے والے اہم افراد کا خیال ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی کیا حیثیت ہے اور ان کے پاس کیا عقل و شعور ہے کہ فیصلہ سازی کرتے وقت ان کی رائے لی جائے یا انہیں اہمیت دی جائے۔ عملاً صورت حال یہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو فیصلہ سازی کے عمل سے باہر ہیں اور ان کی حیثیت محض فیصلوں پر عمل درآمد کرنے والوں کی ہوتی ہے، چاہے فیصلہ ان کے خلاف ہو یا ان کی خواہشات کے برعکس ہو۔ ان کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اسے رد کر سکیں یا اسے چیلنج کر سکیں۔ ایسا کرنے کی صورت میں انہیں طاقت ور عناصر کی جانب سے مختلف قسم کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سماجی، معاشی اور خاندان کی سطح پر معاملات کا جائزہ لیں تو فیصلہ سازی میں لوگوں کو شامل نہ کرنے کا رجحان نہ بلکہ غالب نظر آتا ہے۔ ہم تو اپنے گھر میں بھی بچوں کی آزادی اور ان کے بارے میں ہونے والے فیصلوں میں ان کو شامل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور صاف کہتے ہیں کہ بچوں کو کیا معلوم، ہم ان کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ گھر اور خاندان کی سطح پر ہوتا ہے، وہی کچھ معاشرے میں مختلف حوالوں سے غالب نظر آتا ہے۔

اگرچہ بحران یہ ہے کہ فیصلہ سازی کے عمل میں لوگوں کو شامل نہیں کیا جاتا لیکن ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہمارے معاشرے میں خود فیصلہ سازی کے ذمہ دار اداروں کو فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہے؟ اس معاملے میں بھی ہمارے سامنے عجیب وغریب قسم کے تضادات موجود ہیں اور فیصلہ سازی کے ذمہ دار ادارے بدقسمتی سے اپنے بنیادی حق سے بھی محروم محسوس ہوتے ہیں، خاص طور پر آمریت کے دور میں۔ ہماری پارلیمنٹ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سپریم ہے لیکن اس کی اتھارٹی کہاں ہے، اس کا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے تناظر میں ہماری 2008ء کی پارلیمنٹ نے ایک مشترکہ قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا تھا کہ ملک میں ڈرون حملوں کا سلسلہ روکا جائے اور اس سلسلے میں حکومت امریکہ سے دوٹوک بات کرے لیکن پارلیمنٹ کے فیصلے کو کہیں بھی پذیرائی نہیں مل سکی، یہ حملے آج بھی اسی طرح جاری ہیں۔ ہمارے عوام کے ایک حصے کی سوچ یہ بھی ہے کہ ہمارے فیصلے ہم یا ہمارے حکمران نہیں کرتے بلکہ یہ بڑی غیر ملکی طاقتوں بالخصوص امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ ہمارے پاس اس غیر ملکی ایجنڈے اور ان کے فیصلوں کو ماننے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہیں ہے۔ ہم وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو بڑی طاقتیں ہم سے کروانا چاہتی ہیں۔ جمہوری اور مہذب معاشروں میں ملک یا قوم کے بارے میں اہم فیصلوں کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں دنیا کو دکھانے کے لیے کہ ہم جمہوری ہیں، ایک نمائشی سٹیج سجا دیا جاتا ہے اور عملاً پارلیمنٹ سے فیصلہ سازی کا اختیار چھین کر فرد واحد کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ فرد واحد سے مراد محض فوجی حکمران نہیں بلکہ ایسے سیاسی اور جمہوری حکمران بھی ہیں جو کسی قسم کی مشاورت کے عمل پر یقین نہیں رکھتے۔ پاکستان میں جو سیاسی تاریخ ہے اور بالخصوص جمہوری ادوار کی تو اس میں فیصلے کا اختیار پارلیمنٹ تو کجا خود کابینہ اور اس میں شامل اہم وزرا کو بھی نہیں ہوتا۔ سیاسی جماعتوں میں اہم فورم پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی ہوتی ہے، اس کو بھی مشاورت کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ جمہوری ادوار میں ہم نے کابینہ کے مقابلے میں کچن کیبنٹ اور گھر کی کیبنٹ جیسے الفاظ سن رکھے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی و جمہوری عمل ہمارے جیسے معاشروں میں کس قدر کمزور ہے۔ ایک صورت یہ بھی رہی ہے کہ اہم اور حساس نوعیت کے فیصلوں کو پارلیمنٹ میں پیش ہی نہ کیا جائے تاکہ کوئی بحران پیدا نہ ہو۔ مثلاً دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی بننے کا فیصلہ فوجی حکومت، یعنی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنرل پرویز مشرف کے دور میں کیا گیا مگر جب 2002ء میں پارلیمنٹ سیل پائی تو وہ اس پر خاموش رہی اور اس نے وہ سب کچھ برداشت کیا جو فوجی حکمران چاہتے تھے۔ اسی طرح 2008ء کے انتخابات کے نتیجے میں بننے والی پارلیمنٹ نے بھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جمہوری دور میں کابینہ میں وزرا اور مشیروں کی فوج کی فوج تو بنا دی جاتی ہے مگر ان کو کوئی اختیار نہیں دیا جاتا۔

سیاسی و مذہبی قیادتوں پر نظر ڈالیں جو سب سے زیادہ عوام کی بات کرتی ہیں لیکن افسوس کہ یہ عوام تو کجا اپنی جماعت سے وابستہ کارکنوں کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔ سیاسی کارکنوں میں اب یہ احساس مضبوط ہو رہا ہے کہ ان کی جماعتوں کے اندر ہونے والے اہم فیصلے جماعتوں کے اندر کم اور طاقت کے دوسرے مراکز میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس طرزِ عمل نے سیاسی جماعتوں کی اہمیت کو قدرے کم کر دیا ہے اور جماعتوں میں نئے افراد یا کارکنوں کی شمولیت اب رہنماؤں کے لیے محض خواب بن کر رہ گئی ہے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کی آگاہی'' میں شامل مضمون ''عوام کے نام پر'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے حکمرانوں کو عوام کے مسائل کا ادراک اس لیے نہیں ہے کہ وہ ان سے دوچار نہیں ہوتے۔ اگر وہ بیمار ہوتے ہیں تو علاج کی غرض سے یورپ اور امریکہ چلے جاتے ہیں۔ اگر ملک میں تعلیمی معیار گر رہا ہے اور تعلیمی اداروں میں تعلیم ختم ہو گئی ہے، تو وہ اپنے بچوں کو بیرونِ ملک تعلیم کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اگر انہیں منڈی میں ملاوٹ کی اشیاء ملتی ہیں تو معیاری اور خالص چیزیں باہر کے ملکوں سے منگواتے ہیں۔ اگر ملک میں لاقانونیت ہوتی ہے اور لوٹ مار کا خطرہ ہوتا ہے تو وہ اپنے لیے حفاظتی گارڈ رکھ لیتے ہیں۔ اگر ملک میں سخت گرمی ہو تو وہ سوئٹزرلینڈ یا کسی دوسرے سرد ملک میں جا کر چھٹیاں گزارتے ہیں۔ یہ رہنما اب اکثر تھری پیس سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ ہر وقت اور ہر جگہ ایئر کنڈیشنر میں رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے عوام کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ انہیں جذباتی نعروں میں الجھائے رکھا جائے اور ان کے نام پر حکومت کی جائے۔ جب بار بار عوام کے نام کو استعمال کیا جاتا ہے تو درحقیقت عوام یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید ملک میں ان کی حکمرانی ہے۔ اس نشہ میں ان کو مبتلا کر کے ہمارے یہ حکمران اپنی من مانی کرتے ہیں، ملک لوٹتے ہیں، عیش و آرام کرتے ہیں اور اگر کبھی عوام ان کے رویوں سے تنگ آ کر مظاہرہ کرتے ہیں تو یہ عوام کے مفاد کے لیے ان پر لاٹھی چارج کر کے ان کے احتجاج کا خاتمہ بھی کرتے ہیں۔'' (صفحہ 111-110)

اسی پر معروف صحافی اطہر ندیم اپنی کتاب ''پاکستان کے سیاسی حقائق'' میں شامل مضمون

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری سیاست: پاور پالیٹکس، عوامی سیاست اور انقلابی سیاست'' میں لکھتے ہیں:

''سیاسی لغت کے حوالے سے پہلے زمرے'' پاور پالیٹکس'' کے بارے میں زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد سے زیادہ تر اسی کا چلن رہا ہے۔ عام آدمی کا دن رات اسی سے واسطہ پڑتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جب وہ روزمرہ کی زندگی میں اس سے نبرد آزما ہوتا ہے تو اس وقت وہ شاید نہ جانتا ہو کہ وہ'' پاور پالیٹکس'' کو ہی بھگت رہا ہے۔ یہ دراصل جمہوریت کے نام پر'' خاص لوگوں'' کی حکمرانی ہوتی ہے، ریاستی اختیار و اقتدار جن کے قبضہ میں ہوتا ہے یعنی اشرافیہ کی حکومت۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ''اشراف'' صرف وہی کہلا سکتے ہیں جو صاحب ثروت و املاک ہوں۔ یہاں تک کہ امریکی'' آبائے دستور'' کا یہ نقطہ نظر واضح تھا کہ جو صاحب جائیداد نہیں، وہ ریاست میں حصہ دار کیسے ہو سکتا ہے۔'' (صفحہ 273-274)

اطہر ندیم نے ٹھیک کہا ہے کہ جب لوگوں کی حیثیت ثروت و املاک سے دیکھی جائے گی تو ان کو ریاست میں کون حصہ دار بنائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ریاست کا شہری سمجھنا اور ان کو ریاستی و حکومتی فیصلوں میں شامل کرنا ممکن نہیں کیوں کہ ان کمزور لوگوں کی حیثیت محض کمی کمین سے زیادہ نہیں۔ معاشی سطح پر دیکھ لیں تو بھی ہمارے معاشی ماہرین اور عوام کی معاشی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے معاشی امور کے ماہرین اور ادارے ہمارے کم اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے زیادہ تابع ہوتے ہیں۔ لوگ کس قسم کی معاشی پالیسیاں چاہتے ہیں اور ان کی معاشی ترجیحات کیا ہیں، یہ جاننے کے لیے عوامی سطح پر کوئی بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ جو معاشی اعداد و شمار پیش کر کے ہمیں سہانے خواب دکھائے جاتے ہیں یا سب اچھے کا راگ الاپا جاتا ہے، ان کی عوامی سطح پر کہیں بھی کوئی قبولیت نہیں۔ معاملہ محض اب پاکستان کا نہیں بلکہ پوری دنیا میں گلوبلائزیشن کے خلاف جاری مزاحمتی تحریکوں نے اس خیال کو تقویت دی ہے کہ دنیا بھر میں کی جانے والی فیصلہ سازی اور جاری رکھی گئی معاشی پالیسیوں میں عام لوگوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ سماجی سطح پر جو ادارے موجود ہیں ان کی حالت بھی قابل رحم ہے۔ یہ ادارے، اپنی من مانی پالیسیوں، غیر ضروری چودھراہٹ اور طاقت کی بنا پر لوگوں پر اپنے فیصلے تھوپتے ہیں۔ ہم اکثر حکومتوں اور اداروں سے گلہ کرتے ہیں کہ وہ فیصلہ سازی کے عمل میں لوگوں کو شامل نہیں کرتے۔ یہ گلہ واقعی بجا ہے لیکن سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم بطور عوام یا گروہ اپنی اپنی سطح پر یعنی گھر، خاندان اور کمیونٹی کی سطح پر از خود فیصلے کرتے وقت کس حد تک اپنے لوگوں کو اعتماد میں لیتے ہیں۔ ہم نے اکثر گھروں اور خاندان کی سطح پر دیکھا ہے کہ گھر یا خاندان کے بڑے افراد یا سربراہ فیصلے کرتے وقت خود آمرانہ مزاج کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان سے اپنا حق مانگنا چاہے تو خاندان کے یہ بڑے ان سے بدترین سلوک کرتے ہیں حالاں کہ اللہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں بھی ہے کہ ''انصاف کرنے والے اللہ کے نزدیک نور کے منبروں پر ہوں گے، وہ جو اپنے فیصلہ جات، اہل وعیال اور جو ان کی حکمرانی میں ہوں، میں انصاف کرتے ہیں''۔ اسی طرح ہماری اسلامی تعلیمات بھی ہمیں اس بات کا درس دیتی ہیں کہ فیصلہ کرتے وقت لوگوں سے مشورہ کرلیا کرو تاکہ تمہارے فیصلے پائیدار اور مستحکم ہوں۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ آمرانہ مزاج اور ذہنیت کے گرد گھومتا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے بھی ہوا ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری اور اصلاحی طرز فکر کو کبھی فوقیت نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں مجموعی طور پر مشاورت کا فقدان نظر آتا ہے۔ جمہوریت کا تسلسل سے آگے نہ بڑھنا بھی جمہوری اداروں کی کمزور فیصلہ سازی اور عوام کی اس عمل میں عدم شمولیت کا باعث بنتا رہا ہے۔ ویسے بھی جب معاشروں میں آمرانہ مزاج اور حکمرانی کا غلبہ ہو تو یہ لازمی امر ہے کہ فیصلہ سازی میں شمولیت اور اس کا اختیار عوام الناس کے مقابلے میں چند طاقت ور لوگوں تک محدود ہو جاتا ہے اور عوام کی حیثیت ان آمرانہ معاشروں میں محض ایک تماشائی کی رہ جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے ہمارے ہاں فیصلہ سازی کے عمل میں لوگوں اور بالخصوص کمزور طبقات کی عدم شمولیت کا جو فقدان ہے، اسے کیسے دور کیا جائے اور لوگوں کا اس بارے میں اعتماد کیسے بحال ہو کہ وہ اہم ہیں۔ اس ملک میں عوام کی رائے جاننے کے لیے جو ریفرنڈم کے سہارے لیے گئے اور کہا گیا کہ آمروں کے غیر آئینی اقدامات کو آئینی جواز عوام نے فراہم کیا ہے، وہ بھی سب کے سامنے ہے اور اس کی شفافیت اب بھی لوگوں میں ایک بڑے سوال کے طور پر موجود ہے۔

معروف دانشور محمود مرزا اپنی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے'' میں شامل مضمون ''آمریت اور کرپشن کو کلچرل بنا دیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''دیکھا جائے تو پاپولر لیڈروں کی جانب سے نیم آمرانہ رویہ کا اظہار ہمارے اس دیرینہ کلچر کی نئی شکل ہے۔ مسلم تاریخ میں حکمران ہمہ مقتدر رہا ہے۔ اس نے اقتدار میں دوسروں کو شریک نہیں کیا۔ اس کے وزیر ہوتے تھے اور مشیر بھی، وہ ان سے رائے طلب ضرور کرتا تھا لیکن وہ ان کی رائے تسلیم کرنے کا پابند نہیں تھا۔ آج کے دور کا منتخب حکمران بھی وزرا کو شریک اقتدار نہیں کرتا۔ ایک دور جمہوریت میں بھی کسی وزیر کو وزیراعظم سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے کئی کئی ماہ کا انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس سے پہلے ''دور جمہوریت'' میں ایک وزیر نے جو کبھی فکری استاد ہوتا تھا، اپنی ہڈیاں اس جرم میں تڑوالیں کہ اس نے وزیراعظم سے شکوہ کیا تھا کہ آپ نے اجلاس میں تشریف لانے میں تاخیر کر دی۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے مشاورت کا عمل جو ہمارے بالا دست طبقوں کے طرز عمل کی عکاسی کرتا ہے اور اس کا اظہار ہم نچلی سطح پر بھی دیکھ رہے ہیں جو لوگوں کے مزاج میں آمرانہ طرز عمل کو تقویت دیتا ہے۔

دراصل ہمیں سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے فیصلہ سازی کے اداروں کو خود مختاری دیتے ہوئے ان کی آزادانہ حیثیت کو بحال کریں تاکہ وہ بغیر کسی دباؤ کے بہتر فیصلے کر سکیں۔ لیکن یہ کام کسی بھی طور پر آسان نہیں کیوں کہ اس کے لیے ہمیں ایک بڑی سیاسی تحریک کی ضرورت ہے اور اس تحریک کو ایک بڑی مزاحمتی تحریک کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ عوامی سطح پر اس دباؤ کو اور زیادہ مؤثر انداز میں بڑھانے کی ضرورت ہے کہ وہ فیصلہ سازی کے اداروں پر اپنا دباؤ بڑھائیں اور خود کو منظم کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان اداروں کو از خود اپنی آزادی کو بحال کرانے کی جدوجہد کرنی اور دوم ان اداروں میں ہونے والی فیصلہ سازی میں لوگوں کو شامل کیا جانا چاہیے تاکہ فیصلہ سازی کا یہ عمل انفرادی سطح سے نکل کر اجتماعی عمل کا حصہ بن جائے۔

ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ سیاسی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ادارے اس بات پر بھی تحقیق کریں کہ معاشرے کے اندر فیصلہ سازی میں عدم شمولیت کے تناظر میں کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اگر لوگوں کو فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کرنا ہے تو اس کا واضح طریقہ کار طے کرنا ہوگا اور لوگوں کو اختیار اور رسائی دینا ہوگی کہ وہ آگے بڑھیں اور فیصلہ کے عمل میں اپنی رائے دیں۔ ریاست اور حکومت کی سطح پر یہ بات ماننا پڑے گی کہ ہمارا معاشرہ اس وقت جس بڑے عدم استحکام سے دوچار ہے، اس کی ایک بڑی وجہ لوگوں کی فیصلہ سازی میں عدم شمولیت بھی ہے۔ اس زیادتی کا مداوا اسی وقت ممکن ہوگا جب ہمارے ہاں سیاسی و سماجی سطح پر لوگوں اور اداروں کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ فیصلہ سازی میں اپنے بنیادی حق کو استعمال کریں۔ اس کے لیے اوّلین شرط حکومت کی سیاسی کمٹمنٹ اور مرضی ہے۔ اگر ارباب اختیار، عام لوگوں اور اداروں کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں تو پھر اس حق کے حصول کے حوالے سے ان لوگوں کی جانب سے جو مزاحمتی عمل سامنے آئے گا، وہ ملک میں انتشار بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر لوگ منظم ہو کر مزاحمتی کردار ادا کریں تو وہ اپنے حق کو جمہوری انداز میں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی لوگوں کے حقوق کی پاسداری خالصتاً ایک سیاسی عمل ہے اور اس کا نتیجہ بھی سیاسی طور پر ہی سامنے آئے گا۔ اس لیے ہمیں اپنی جدوجہد کا بہتر تعین کرنا چاہیے تاکہ ایک مضبوط اور جمہوری پاکستان کی نئے انداز میں بنیاد رکھی جا سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں سیاسی جماعتیں اور ان کے داخلی تضادات

کسی بھی معاشرے کے سیاسی و سماجی اور معاشی استحکام کے لیے سیاسی جماعتوں کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا کردار زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ عوام کو طاقت کا سرچشمہ اور انہیں اپنی سیاست کا محور کہنے والی سیاسی جماعتوں کی اکثریت نے خود کو پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیوں کے ماڈل میں تبدیل کر لیا ہے۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو ان جماعتوں کو محض بیرونی سطح پر ہی مسائل اور چیلنجز درپیش نہیں بلکہ یہ داخلی سطح پر بھی بحران کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف یہ جماعتیں عوامی سطح پر ایک مضبوط کردار کی حامل نہیں ہو سکیں تو دوسری طرف یہ اپنے داخلی تضادات کے باعث عوامی اعتماد سے محروم ہونے کے بحران سے بھی دوچار ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ملک کی سیاسی تاریخ میں سیاسی جماعتوں کو آزادانہ انداز اور سازگار ماحول میں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور فوجی ادوار میں سیاسی جماعتوں کے اندر تواتر کے ساتھ فوجی مداخلتوں نے ان کو مختلف مشکلات میں بھی مبتلا کیا۔ پاکستانی سیاست میں ان بالادست پس پردہ قوتوں نے یہاں کی سیاسی جماعتوں کا نہ صرف استحصال کیا بلکہ ان جماعتوں، بالخصوص پاپولر سیاسی جماعتوں کے زور کو کم کرنے کے لیے ان میں گروپ بندی اور توڑ پھوڑ کے عمل کو پروان چڑھایا۔ مثلاً فوجی حکمرانوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی سیاسی ساکھ قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے پہلے سے موجود سیاسی جماعتوں میں اپنی حمایت کے حصول کے لیے نئے گروپ بنائے۔ جنرل ضیاالحق مرحوم کو جب سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مسلم لیگ کے مردہ گھوڑے میں دوبارہ جان ڈالنے کی کوششیں کیں اور مسلم لیگ کو دوبارہ سرکاری سرپرستی میں منظم کیا گیا۔

جنرل ضیاالحق مرحوم کو سیاسی جماعت اور وہ بھی مسلم لیگ کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ انہوں نے 1985ء میں جب عام انتخابات، وہ بھی غیر جماعتی بنیادوں پر کروانے کا فیصلہ کیا، تو انہیں پیپلز پارٹی سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک سیاسی جماعت کی ضرورت تھی۔ قرعہ فال مسلم لیگ کے نام نکلا اور اس نے سرکاری و فوجی سرپرستی میں اپنے نئے سیاسی سفر کا آغاز کیا۔ مسلم لیگ کے اندر نواز شریف کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرکاری سرپرستی بھی جنرل ضیاالحق مرحوم نے کی اور یہاں تک کہ انہوں نے نواز شریف کو اپنا سیاسی جانشین تک قرار دیا۔ پہلی بار نواز شریف جب 1988ء کے انتخابات کے نتیجے میں پنجاب کے وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے مرکز میں بے نظیر بھٹو کو جو شدید مزاحمت پیش کی، اس میں انہیں فوج اور اسٹیبلشمنٹ کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔ اس سے قبل ایوب خان نے بھی اپنے دور میں کنونشن مسلم لیگ بنا کر اسے اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا تھا۔

یہ کھیل وہیں ختم نہیں ہوا بلکہ 12 اکتوبر 1999ء کو فوجی انقلاب کے بعد جنرل پرویز مشرف نے بھی اپنے پیش رو ایوب خان اور جنرل ضیاالحق مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے سیاسی جماعتوں میں بردست توڑ پھوڑ کی۔ سب سے پہلے نواز شریف کی مسلم لیگ کے مقابلے میں مسلم لیگ (ق) کی بنیاد ڈالی اور اس کی سرکاری سرپرستی کی۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی سوانح عمری میں بھی کیا کہ وہ اس جماعت کے بانیوں میں شامل تھے۔ 2002ء کے انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کی بنیاد ڈالی اور مسلم لیگ (ق) اور پیٹریاٹ کو ملا کر حکومت سازی میں سرکاری معاونت فراہم کی۔ اس طرز عمل نے پہلے سے موجود دو بڑی سیاسی جماعتوں یعنی مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کو سیاسی طور پر کمزور کیا اور اس سے یہ تاثر ابھرا کہ اصل طاقت مسلم لیگ (ق) کو حاصل ہوگئی ہے۔ اسی طرح پس پردہ قوتوں یا اسٹیبلشمنٹ نے سیاسی جماعتوں کی قیادت کو بھی اپنی مرضی اور منشا کے مطابق ریموٹ کنٹرول کے طور پر استعمال کیا اور جہاں ان کو لگا کہ یہ قیادتیں ان کے مفادات کے برعکس کام کر رہی ہیں تو ان کو تبدیل کر کے اپنی پسند کی قیادتوں کا کھیل بھی کھیلا گیا۔ اس کھیل میں اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں کو کسی حد تک کامیابی بھی ملی۔ اس لیے یہ نہیں کہ سیاسی جماعتوں کو آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، مکمل سچ نہیں اور اس میں اس پس پردہ قوتوں کے کھیل کا کافی گھناؤنا ہاتھ ہے۔

لیکن یہ سمجھ لینا کہ سارا قصور محض اسٹیبلشمنٹ کا ہے، یہ بھی مکمل سچ نہیں کیوں کہ اصل مسئلہ سیاسی جماعتوں کا اپنا بھی ہے کہ انہوں نے کس حد تک اپنے اندر جمہوری کلچر کو فروغ دیا، یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ کیا ہماری سیاسی جماعتیں حقیقی معنوں میں جمہوری سیاسی جماعتیں ہیں؟ ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ بیرونی محاذ پر سیاسی جماعتوں کے اندر مداخلت یا کامیاب حملہ اسی صورت میں ہوتا ہے، جب وہ اندرونی معاملات میں کمزور ہوں یا عوام کے مقابلے میں کسی اور کی طاقت پر انحصار کرتی ہوں۔ اسی طرح جب سیاسی جماعتیں اندرونی سطح پر کمزوری کے ساتھ ساتھ آمرانہ مزاج کی جماعتوں میں تبدیل ہو جائیں تو ان قوتوں کو زیادہ تقویت ملتی ہے جو سیاسی جماعتوں کو عملی طور پر کمزور دیکھنا چاہتی ہیں۔ مثلاً آپ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں پر نظر ڈالیں اور ان جماعتوں کو بڑی اس لیے کہا جاتا ہے کہ قومی سطح پر یہ سب سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے والی جماعتیں ہیں۔ ان جماعتوں کا اندرونی تجزیہ کرنے کے بعد آپ اسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ جماعتیں جو عملاً کمزور ہو گئیں ہیں، ان کی اصل کمزوری کا سبب پس پردہ قوتوں سے زیادہ خود ان کا اپنا پیدا کردہ ہے جو اپنی ناکامی کی خود ذمہ دار ہیں۔ پیپلز پارٹی کو ہر صورت میں ملک کی سب سے بڑی اور مقبول جماعت کہہ سکتے ہیں اور جس کا دعویٰ ہے کہ وہ عوام کی مقبول ترین جماعت ہے۔ ایک زمانے میں اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں کو پیپلز پارٹی سے مقابلہ کرنے کے لیے اس کے تمام سیاسی مخالفین کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر متحد کرنا پڑتا تھا اور ان کی سرکاری سرپرستی میں پیپلز پارٹی سے مقابلہ کیا جاتا تھا۔ پیپلز پارٹی کو اپنے سیاسی مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی قسم کے اتحاد کی سیاست کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس جماعت کی صورت حال کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ اب اسے بھی انتخابات میں کامیابی کے لیے اتحادوں کی سیاست کی ضرورت پڑ رہی ہے اور آج بھی اس کی مرکز اور صوبوں میں جو حکومتیں ہیں، وہ اتحادی جماعتوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ بدقسمتی سے پیپلز پارٹی جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ عوام کے اندر ایک مضبوط کردار رکھتی ہے، نے اصل میں اب اس نے بھی اپنی سیاست کا محور عوام کے مقابلے میں اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں کو بنا لیا ہے۔ پیپلز پارٹی جو مختلف ادوار میں اقتدار میں شامل رہی، اس کا عوام کے ساتھ تعلق اب خاصا کمزور ہو گیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے ووٹروں کا اپنی جماعت کے ساتھ لاتعلقی کا مظاہرہ ہم نے 1997ء کے عام انتخابات میں دیکھا تھا، جب پیپلز پارٹی کے ووٹروں نے اپنی ہی جماعت اور اس کے امیدواروں کا بائیکاٹ کر کے قیادت کو واضح پیغام دیا تھا کہ وہ جماعت کی سیاست سے بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

یہی حال بلکہ اس سے بھی برا حال مسلم لیگ کا رہا ہے جو اپنے قیام سے لے کر اب تک عملاً اسٹیبلشمنٹ کی آلہ کار رہی ہے اور اسے ہر فوجی حکمران نے آنے کے بعد اپنی سیاسی ضرورت کے تحت استعمال کیا۔ اس جماعت سے وابستہ لوگوں نے کبھی بھی اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کیا اور خود نواز شریف نے بھی اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد میں وہ ایک مقبول رہنما کے طور پر سامنے آئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کئی مواقع پر اسٹیبلشمنٹ کے خلاف عملاً بغاوت یا مزاحمت بھی کی۔ نواز شریف نے باقی مسلم لیگوں اور قیادت کے مقابلے میں اپنی جماعت کو بہت زیادہ متحرک اور فعال کیا اور یہ لگتا کہ وہ صرف اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے ساتھ طاقتور ہوئے ہیں، مکمل سچ نہیں ہوگا۔ مسلم لیگ (ن) اگر ایک طاقت بنی تو اس میں خود نواز شریف کی سیاست کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔ انہوں نے ڈرائنگ روم میں موجود مسلم لیگ کو عوامی جماعت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے باوجود نواز شریف کی سیاست کا اولین مقصد اپنی سیاسی جماعت کو مضبوط کرنے کی بجائے اپنی ذات اور اپنے خاندان کو مضبوط کرنا رہا۔ اس کا عملی مظاہرہ ہم نے 12 اکتوبر 1999ء کو فوجی مداخلت، نواز شریف کی حکومت کے جانے اور ان کی نظر بندی کے دوران دیکھا کہ ان کی اپنی مضبوط مسلم لیگ، جس کو وہ تنہائی اکثریت حاصل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی، اس کی طرف سے کوئی بڑا احتجاج فوجی حکومت کے خلاف نہیں دیکھا گیا۔ چند درجن افراد نے ان کی نظر بندی پر ضرور مظاہرہ کیا جو ظاہر کرتا تھا کہ ان کی جماعت اقتدار سے باہر آنے اور فوجی مزاحمت کے خلاف ایک کمزور جماعت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواز شریف کی جانب سے جلاوطنی کے فیصلے میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما تھے، وہیں ان کو عوام اور اپنی جماعت کے کارکنوں کی جانب سے کمزور مزاحمت نے بھی حیران کیا تھا اور اسی بنیاد پر انہوں نے جلاوطنی کی سیاست میں ہی اپنی سیاسی عافیت سمجھی۔ نواز شریف جب بھرپور سیاسی طاقت اور اقتدار میں شامل تھے تو انہیں ان کے ہمدردوں کی جانب سے مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنی سیاسی جماعت زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں تاکہ وہ مستقبل میں مؤثر کردار ادا کرسکیں۔ لیکن نواز شریف اہل دانش کے ان مشوروں پر ہنستے اور ایک بار انہوں نے اپنے سیاسی مشیر سے کہا کہ یہ اہل دانش عملی سیاست کے تقاضوں سے لاعلم ہیں اور ان کی گفتگو مان کر سیاست نہیں کی جاسکتی۔ ان کے بقول اگر سیاسی جماعت مضبوط ہوگئی تو قیادت کمزور ہوگی اور سیاسی جماعت کے تابع ہوکر سیاست کرے گی۔ اس کے برعکس اگر قیادت مضبوط ہوگی تو سیاسی جماعت کو اس کے تابع رہنا پڑے گا۔ لیکن نواز شریف نے یہ دیکھ لیا کہ جب ان پر برا وقت آیا تو ان کی مقبول شخصیت بھی لوگوں کو ان سے دُور جانے اور مسلم لیگ (ق) کے ساتھ سمجھوتوں کی سیاست کرنے سے روک نہیں سکی۔ ان کی جماعت میں شامل جو ارکان اسمبلی اور وزیر تک بنے، ان کی اکثریت نے جنرل مشرف کی تیار کردہ مسلم لیگ (ق) میں سیاسی پناہ لی اور اقتدار کی سیاست کے مزے لوٹے۔

سیاسی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے عوام کی طاقت کے مقابلے میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ کی سیاست کو فروغ دیتے ہوئے فوجی حکمرانی اور فوج کی سیاست کو مضبوط کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بیشتر سیاسی جماعتیں جو اپنے آپ کو جمہوریت کی علمبردار کہتی ہیں، آج بھی فوج کے کنٹرول سے آزاد نہیں۔ جب بھی ملک میں فوجی مداخلتیں ہوئیں تو ان کا ایک بڑا سیاسی جواز یہاں موجود سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادتوں نے فراہم کیا۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اس ملک میں کوئی بڑی اصلاحی تحریکیں چلاسکیں اور نہ ہی ان سیاسی جماعتوں کے پاس عوام کے مسائل کا کوئی ٹھوس حل اور اس کی بہتر حکمت عملی موجود ہے۔ اقتدار میں آنے والی جماعتیں عوام کے لیے کچھ کرسکیں اور نہ ہی اقتدار سے باہر سیاسی جماعتوں نے اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت کی۔ جہاں تک مذہبی جماعتوں کا تعلق ہے، تو ان میں سے بیشتر نے عوامی منصوبوں، بالخصوص فلاحی منصوبوں پر اپنی اپنی سطح پر ضرور کام شروع کر رکھے ہیں لیکن اس سے بھی کوئی بڑا سیاسی اثر پیدا نہیں ہوسکا۔ دراصل سیاسی جماعتوں نے خود کو مسلسل جدوجہد کے عمل میں شامل کرنے کی بجائے انتخابات اور انتخابی سیاست تک محدود کرلیا ہے۔ سیاسی جماعتیں انتخابات میں ہی بھرپور یا فعال انداز میں نظر آتی ہیں اور انتخابات کے بعد یہ جماعتیں عملی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر گوشہ نشینی اختیار کر لیتی ہیں یا پھر یہ اپنے آپ کو میڈیا یا ڈرائینگ روم تک محدود کر لیتی ہیں۔ اس محدود تصور کے ساتھ سیاسی جماعتوں کا کام کرنا یا غیر فعال ہونا ایک فطری امر بن جاتا ہے۔ اسی طرح سیاسی جماعتیں آج بھی پرانے طرز کی سیاست پر قائم ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عوام کے جم غفیر کو وہ آج بھی بغیر کسی عملی اقدام کے اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ حالاں کہ اب عوام سیاسی جماعتوں کی جانب سے نہ صرف عملی اقدام چاہتے ہیں بلکہ وہ مختلف سطح پر موجود سیاسی جماعتوں کے اندرونی تضادات سے بھی نالاں ہیں۔ اس کا اظہار وہ ماضی کے مقابلے میں جن جماعتوں سے لاتعلقی کا اظہار کر کے دے رہے ہیں، اس سے دونوں بڑی جماعتوں کے لوگوں کو اکٹھا کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا ہے۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ سیاسی کارکنوں میں پڑھنے پڑھانے کا رجحان ختم ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی بڑی ذمہ داری بھی سیاسی جماعتوں کی قیادت پر آتی ہے جو اپنی جماعتوں میں سیاسی کارکنوں نے کی اور خود بھی سیکھنے سیکھانے کا کلچر پیدا نہیں کر سکے۔ مذہبی جماعتوں میں کبھی سٹڈی سرکل ہوتے تھے، اب وہ بھی نایاب ہو گئے ہیں اور نہ ہی اب سیاسی جماعتوں میں ایسے کوئی ونگ ہیں، جہاں مستقبل کے حوالے سے سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کے لیے پالیسی گائیڈ لائن تیار کی جاتی ہو۔

آپ دیانت داری سے ملک کی اکثر بڑی جماعتوں کے اندرونی معاملات کا تجزیہ کریں تو ان کے پاس قومی، صوبائی اور ضلعی سطح پر اپنی ممبر شپ کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ کسی پارٹی کی اصل ممبر شپ کتنی ہے اور کہاں ہے۔ مجھے ایک موقع پر میرے بھائی اور دوست احسن اقبال، جو مسلم لیگ (ن) کے اندر ایسے شخص ہیں جو پارٹی کو جمہوری انداز میں چلانے کے سب سے زیادہ خواہش مند ہیں، نے بتایا کہ ایک بار انہوں نے پارٹی کے تمام ممبران اور ورکروں کی ممبر شپ کو کمپیوٹرائیز ڈ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن انہیں اس سلسلے میں پارٹی کے اندر کوئی خاص پذیرائی نہیں مل سکی۔ اس طرح 1997ء میں احسن اقبال نے میرے ساتھ ایک منصوبہ share کیا کہ وہ پارٹی کے اندر ایک ایسا پالیسی ساز سیل بنانا چاہتے ہیں جو پارٹی کو فعال بنانے اور اسے بہتر گائیڈ کرنے میں معاون ثابت ہو لیکن اسے بھی پارٹی قیادت میں عملاً کوئی خاص قبولیت نہیں مل سکی۔

دراصل عوام کو منظم کرنے کی سوچ اسی صورت میں پروان چڑھتی ہے، جب آپ یقین رکھتے ہوں کہ عوام ہی اقتدار کے حصول کا واحد ذریعہ ہیں لیکن چوں کہ سیاسی جماعتوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ اقتدار بذریعہ عوام نہیں بلکہ فوج یا اب بیرونی قوتوں کی مدد سے ملتا ہے۔ اس صورت میں عوام بے چارے ان سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے ہاتھوں میں یرغمالی بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب یہ بھی بحث پروان چڑھ رہی ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں عملی طور پر مفاداتی گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہیں اور ان سیاسی جماعتوں کی سیاست بھی عوام کے مقابلے میں مخصوص مفادات کے پابند ہے یعنی محدود ہو کر رہ گئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کی پالیسیاں اب آزاد نہیں رہیں، یا تو ان میں اندرونی محاذ پر مفاداتی گروپس کی اجارہ داری ہے یا اب بیرونی کھیل بین الاقوامی صورت میں غیر ملکی مداخلت کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ سیاسی جماعتیں اور ان کی قیادت اپنے فیصلوں میں اب انہی لوگوں کے مفادات کا خیال رکھتی ہے اور اکثر اوقات تو سیاسی جماعتوں میں شامل اہم افراد کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی قیادت کیا فیصلے کر رہی ہے۔ اکثر فیصلے سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں پر تھوپے جاتے ہیں۔ مثلاً نواز شریف نے کب اپنی سیاسی جماعت یا اپنے رہنماؤں کو اعتماد میں لیا تھا کہ انہیں جنرل پرویز مشرف سے 2000ء میں کوئی خصوصی ڈیل کر کے ملک سے باہر چلے جانا چاہیے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ معاہدہ ان کے خاندان اور کچھ قریبی دوستوں کے درمیان طے ہوا اور پارٹی ان تمام معاملات سے مکمل طور پر لاعلم تھی۔ نواز شریف بار بار کہتے رہے کہ انہوں نے کوئی دس سال کی ڈیل نہیں کی لیکن پھر وقت نے ثابت کیا کہ ان کا مؤقف غلط تھا اور بین الاقوامی ضامنوں سعودی عرب اور لبنان کے نمائندوں نے اسلام آباد میں آ کر وہ تمام تحریری ثبوت میڈیا کے سامنے پیش کر دیئے کہ وہ ایک معاہدے کے تحت باہر گئے تھے۔ اس لیے نواز شریف کا یہ کہنا کہ معاہدہ دس سال کا نہیں پانچ برس کا ایک واضح اعتراف جرم تھا۔

یہی حال مرحومہ بے نظیر بھٹو کی سیاست کا بھی تھا جو کبھی اپنی جماعت کو فیصلے کرنے میں شامل نہیں کرتی تھیں۔ پوری پیپلز پارٹی یہی ثابت کرتی رہی کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے کوئی ڈیل نہیں ہوئی۔ جنرل پرویز مشرف اور امریکہ، برطانیہ اور متحدہ عرب امارات کے تعاون سے ڈیل کے نام پر جو کھیل کھیلا گیا اور جو سودے بازی ہوئی، وہ سب کے سامنے عیاں ہو گئی۔ ایم کیو ایم کی پوری سیاست ایک ریموٹ کنٹرول کے تحت چل رہی ہے اور ریموٹ اسی جلاوطن قائد الطاف حسین کے ہاتھوں یرغمال ہے۔ اس لیے یہ کہنا جائز ہو گا کہ سیاسی جماعتوں کی اکثریت ایک ڈکٹیشن (Dictation) پر چل رہی ہے۔ یہ ڈکٹیشن اندرونی یا بیرونی دونوں سطحوں پر موجود ہے۔ سیاسی جماعتوں کا خیال ہے کہ وہ ان اندرونی اور بیرونی محاذ پر موجود مفاداتی گروپس کو ناراض کر کے اپنی طاقت اور سیاست کے حصول کو برقرار نہیں رکھ سکیں گی۔ اس لیے اب آپ کو عوام بھی سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے کا حصہ نظر نہیں آتے اور عملاً عوام اور سیاسی جماعتوں کے اندر ایک واضح خلیج اور gap نظر آتا ہے۔ سیاسی جماعتوں نے بھی اب تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ وہ یہ جان سکیں کہ عوام سیاسی جماعتوں سے کیوں لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو سیاسی اداروں میں تبدیل نہیں کر سکیں۔ ماضی میں جس مذہبی و سیاسی جماعتوں کے جو نظریاتی اور اصولی معاملات تھے، وہ اب بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اکثر سیاسی جماعتیں عوام میں اپنی مقبولیت اس حد تک کھو چکی ہیں کہ ان کے پاس اپنی پارٹی کو چلانے کے لیے فنڈز تک بھی موجود نہیں جس کی وجہ سے یہ جماعتیں عوام کے اندر زیادہ فعال نہیں ہو سکیں۔ ماضی میں سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتیں اوران کے رہنما لوگوں کے مسائل پر مزاحمت کرتے ہوئے بھی نظر آتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم کی سیاست نے ان سیاسی جماعتوں کولوگوں کے مسائل سے لاتعلق کردیا ہے۔ دوسرا جس شعوری انداز میں غیر سیاسی قوتوں نے لوگوں کے ذہنوں کوغیر سیاسی ذہن میں تبدیل کیا ہے، اس سے بھی سیاسی جماعتوں کی اہمیت خاصی کم ہوئی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بھی اس صورتِ حال کے ذمہ دار ہیں کیوں کہ محض اسٹیبلشمنٹ کی قوتوں کو ذمہ دار قرار دے کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینا دانش مندی نہیں ہوگی جب کہ اسٹیبشلمنٹ تو واقعی ذمہ دار ہے لیکن سوال یہ بھی ہے کہ سیاسی جماعتوں نے کیوں اسٹیبلشمنٹ کی وکٹ پر کھیلنے کو ترجیح دی اور کیوں ان کے ساتھ مل کر سیاست کرنے اور چوردروازہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ یہ خود کو سیاسی جماعتوں میں تبدیل کرنے کی بجائے ایک موروثی سیاست کا مرکز بن چکی ہیں۔یعنی سیاسی جماعتوں کی اکثریت ایک ہی خاندان کے گرد گھومتی ہے۔پیپلز پارٹی آج تک بھٹو خاندان سے باہر نہیں نکل سکی۔وہ اس کو اپنا حق سمجھتا ہے اور وہ یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ پارٹی کا کوئی فرد اس جماعت کی قیادت کے لیے خود کو پیش کرے۔ اپنے آپ کو پارٹی قیادت میں پیش کرنے والے کو پارٹی اور بھٹو خاندان کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ذوالفقار علی بھٹو کے بعد نصرت بھٹو اور اس کے بعد بے نظیر بھٹو اس کی روح رواں رہیں۔بدقسمتی سے محترمہ بے نظیر بھٹو کا قتل ہو گیا اور پارٹی عملاً بھٹو خاندان سے محروم ہوگئی تو ایک خیال تھا کہ پارٹی قیادت مخدوم امین فہیم کو سونپی جائے گی۔لیکن سب نے دیکھا کہ اچانک اس موقع پر ایک وصیت نامہ سامنے آ گیا یا لایا گیا کہ پارٹی ان کے بعد اس کا اصل وارث ان کا بیٹا بلاول زرداری ہوگا۔معلوم نہیں کہ وصیت اصلی تھی یا نقلی لیکن اس کو اگر اصلی مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ بینظیر موروثی سیاست کی علمبردار تھیں اور ان کی اپنی جمہوریت پسندی بھی محض ایک دکھاوا تھا۔اس موقع پر ان کے بیٹے بلاول زرداری کے نام کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ اس کا راستہ یہ نکالا گیا کہ ان کے نام میں بھٹو کا اضافہ کر کے بلاول بھٹو زرداری رکھا گیا۔اس طرح ایک بار پھر یہ طے کر دیا گیا کہ اگلے تیس برس بھی پارٹی میں بھٹو خاندان کی اجارہ داری برقرار رہے گی۔

یہی حال ملک کی دوسری بڑی سیاست جماعت کا ہے، جہاں اب عملاً شریف خاندان کی اجارہ داری ہے اور وہ بھی بھٹو کی طرح یہ حق کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہیں کہ پارٹی قیادت ان کے خاندان سے باہر نکلے۔نواز شریف پر جب برا وقت آیا تو انہوں نے پہلے قیادت کی ذمہ داری سب سے اہم اور مزاحمتی کردار جاوید ہاشمی کے سپرد کی اور انہوں نے ہی برے وقت میں پارٹی کے نام کو نہ صرف زندہ رکھا، پابند سلاسل بھی ہوئے لیکن ان کو مستقل صدر بنانے کی بجائے جب نئے انتخابات کا معاملہ آیا تو قرعہ فال نواز شریف کے بھائی شہباز شریف کے نام نکلا۔اب شہباز شریف اپنے بیٹے حمزہ شریف کو بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے ہیں کہ وہ پنجاب کی سیاست میں سرگرم کردار ادا کرے۔ شہباز شریف کے بعد پارٹی ایک بار پھر نواز شریف کے نام کر دی گئی اور یقیناً وہ پارٹی کی قیادت کے حق دار ہیں لیکن جس انداز میں انہوں نے پارٹی خاندانی جاگیر بنالی ہے، وہ بھی ایک تکلیف دہ امر ہے۔ نواز نیشنل پارٹی یعنی اے این پی کی پوری سیاست ولی خاندان کے گرد گھوم رہی ہے۔ خان عبدالغفار خان سے لے کر ولی خان تک اور بیگم نسیم ولی سے لے کر اسفند یار ولی تک اور اب ان کے داماد کا خیبر پختونخوا کا وزیر اعلیٰ بننا ظاہر کرتا ہے کہ پارٹی کے اندر جمہوریت کہاں کھڑی ہے۔ مسلم لیگ (ق) جو 2000ء میں فوجی ضرورت کے تحت تشکیل دی گئی تھی، اس نے بھی اس طرز کے ماڈل کو آگے بڑھایا اور اب یہ چوہدری خاندان کے گرد گھوم رہی ہے۔ اس کی سیاست میں تازہ اضافہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کے بیٹے مونس الٰہی کا ہے، جو اس خاندان کی سیاست کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سیاسی جماعتیں جو ملک میں جمہوریت کی سب سے زیادہ باتیں کرتی ہیں اور اپنے آپ کو جمہوری رہنما قرار دیتی ہیں، پارٹی کے اندر جمہوری رویے اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج بھی اوپر سے لے کر نیچے تک بیشتر عہدوں پر براہ راست انتخاب کروانے کی بجائے نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

سیاسی جماعت کی قیادت کا انتخاب بھی اب پاکستانی سیاست میں ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جماعت کا بلا مقابلہ صدر منتخب ہو جاتا ہے، نواز شریف اور شہباز شریف بالترتیب مرکز اور صوبے کے صدر منتخب ہو جاتے ہیں۔ چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی بھی اسی طریقہ کار کو اپناتے ہیں، عمران خان، اسفند یار ولی خان، الطاف حسین، مولانا فضل الرحمان، مولانا سمیع الحق، بلاول بھٹو زرداری سمیت سبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ ان کی جماعت سے کوئی فرد ان کے مقابلے میں قیادت کے لیے اپنا نام پیش کرے۔ یہ طرز عمل ایک جاگیردارانہ نظام کی مکمل عکاسی کرتا ہے اور جب یہ خود اپنی اپنی سیاسی جماعتوں میں جمہوری روایات پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں تو ان کو کیا حق ہے کہ وہ اپنی ڈکٹیٹر شپ میں رہتے ہوئے ملک کے اندر جمہوریت اور جمہوریت کی بحالی کا نام نہاد ڈرامہ رچائیں۔ کیا ہمارے یہ خاندانی اور موروثی سیاست کے علمبردار واقعی جمہوریت کے قابل ہیں۔ اس پر ضرور غور ہونا چاہیے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب ''تاریخ کی آگاہی'' میں شامل مضمون ''ہیروز کی ضرورت کیوں ہوتی ہے'' میں لکھا ہے:

> ''ہمارے جیسے معاشرے میں جہاں جمہوری کردار کمزور ہیں اور جہاں اجتماعی لیڈر شپ کا تصور موجود نہیں ہے تو اس صورت میں کوئی فرد تمام اختیارات اپنی ذات کے اندر جمع کر لیتا ہے اور جمہوری اداروں اور اجتماعی لیڈر شپ کو آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ایسے معاشروں میں سیاسی جماعتیں اور سماجی گروپس بھی شخصیت کا سہارا لے کر اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں نہ تو تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ فکر اور سوچ۔ اس لیے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کی تبلیغ کے نام پر اسے ہیرو بنا کر اپنے مفادات کو حاصل کیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ ماضی سے ہیروز کو نکال کر لاتے ہیں اور حال کی روشنی میں ان کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں، ان کی ذہنی کم مائیگی اور نااہلی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی ہیرو کو تقدس کا درجہ دے کر لوگوں کے جذبات کو اُبھاریں۔ اس مقصد کے تحت ہیروز کا تشکیل دینا عوام کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا عام لوگ شخصیتوں کے جال میں گرفتار اپنی سوچ اور فکر سے محروم رہیں گے۔'' (صفحہ 51)

ہمارے ایک اور دانشور ساتھی محمود مرزا کا خیال ہے کہ سردست سیاسی جماعتوں کی ساخت جمہوری بنانا مشکل کام ہے۔ وہ اپنی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے'' میں شامل مضمون ''ہمارے کچھ کے سیاسی پرتو'' میں لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں جمہوریت کی نام لیوا سیاسی پارٹیوں کی تنظیمی ساخت بھی جمہوری نہیں۔ پاپولر پارٹیاں (جن کو ہمارے ہاں جمہوری پارٹیاں کہا جاتا ہے) کے باقاعدہ انتخابات نہیں ہوتے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لیڈر اپنی حیثیت مختارِ کل کے طور پر برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پارٹی کے اندر انتخابات کے نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ ہو جاتی ہے۔ انتخابات ہارنے والا امیدوار اور اس کا حامی گروہ ناراض ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ پارٹی سے باہر چلا جاتا ہے۔ شاید پارٹیوں کو جمہوری بنانا سردست مشکل ہے۔ فی الحال انہیں جمہوری اصولوں کے قریب لانے کی کوشش ہی کافی ہوگی۔ مناسب ہوگا کہ انتخابات صرف پارٹی کے قومی صدر، صوبائی و ضلعی صدر کے ہوں اور یہ صدر اپنی اپنی تنظیموں کے عہدے دار اپنی صوابدید کے مطابق مقرر کر کے ان کی تصدیق پارٹی کی متعلقہ کونسل سے کروالیں۔'' (صفحہ 82)

محمود مرزا صاحب کو تسلیم کرنا چاہیے کہ مرکزی اور صوبائی سطح پر جو انتخابات ہوتے ہیں، وہ محض فرضی دکھاوے کے اور کچھ نہیں ہے اور جب اوپر کی سطح سے پارٹی میں جاگیردارانہ مزاج غالب ہوگا تو نچلی سطح پر بھی اس کے اثرات مضبوط ہوں گے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں عوامی سیاست میں ناکام رہی ہیں اور عوام کا ایجنڈا ہماری سیاسی جماعتوں کی ترجیحات کا کیوں نہیں حصہ بن سکا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں نے اسٹیبلشمنٹ اور ریاست کے اندر سیاست کے ایجنڈے کو اپنی سیاست کا مرکز بنایا اور انہی کے گرد اپنی سیاست کی خارجی سطح پر ہم نے بھارت دشمنی اور جہادی کلچر،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی تناظر کو اپنی سیاست کا محور بنالیا ہے۔ ہم بین الاقوامی سیاست میں سب کچھ فتح کرنے کے خواہش مند تھے لیکن اپنے اندرونی معاملات سے لاتعلقی کی واضح مثالیں یہاں موجود ہیں۔ جو جماعتیں اقتدار کی سیاست سے باہر ہوتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ اب ہمارا کھیل ختم ہوگیا ہے اور ہمیں نئے انتخابات کا انتظار کرنا ہوگا جب کہ اس کے برعکس حزبِ اختلاف میں شامل جماعتیں بھی عوامی مفاد کو بنیاد بنانے کی بجائے حکومت کو قبول کرنے سے گریزاں اسے گرانے کی سیاست میں مگن ہو جاتی ہیں۔ اس لیے عوامی اور سیاسی جماعتوں کی ترجیحات میں کافی تبدیلی آ چکی ہے۔ بالخصوص وہ جماعتیں جو بڑی ہیں اور جن کا ہمیشہ سے حکومت میں حصہ رہا ہے۔ وہ تو عوام کے مقابلے میں بالادست گروپس کی سیاست کو ترجیح دیتی ہیں۔ اس سبب کر اس ملک میں عام لوگوں کو فوجی حکمرانی سے کوئی فائدہ نہیں مل سکا تو سول اور جمہوری حکمران اور ان کی حکمرانی بھی لوگوں میں ایک سوالیہ نشان کے طور پر موجود ہے۔ سیاسی جماعتوں میں بعض سیاسی شخصیات نے سیاست کو عملی طور پر دولت اور کاروبار میں تبدیل کیا ہے۔ بدقسمتی سے سیاست میں دولت کے کھیل کو متعارف کروانے میں جنرل ضیاالحق مرحوم کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور انہی کی حکمت عملی نے ہماری سیاست کو کرپٹ بھی کیا۔ اس کے بعد نواز شریف نے اس کھیل کو خوب آگے بڑھایا اور اب سبھی اس کھیل میں شامل ہو گئے ہیں جس وجہ سے سیاست غریبوں سے نکل کر امیروں کے گرد آ گئی ہے اور وہ امیر ہی آج ہماری سیاست اور سیاسی جماعتوں میں غالب نظر آتے ہیں۔ جب سیاست عام آدمی سے نکل کر ایک مخصوص گروپ اور خاندان یا بالادست طبقوں تک محدود ہو جائے تو اس کا فائدہ عام آدمی کے مقابلے میں ان ہی مخصوص گروپوں کو ہوتا ہے۔ یہی ہماری سیاست کا بڑا المیہ ہے۔

یہاں ہمارا مقصد محض سیاسی جماعتوں اور ان قیادت پر تنقید کرنا نہیں بلکہ ہمارا مجموعی طور پر معاشرہ جمہوری عمل سے دُور ہے اور ہمیں اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ سیاسی جماعتیں ایک سطح پر معاشرے میں موجود رویوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ جب سیاسی جماعتوں کے سامنے رول ماڈل آمرانہ مزاج اور غیر دستوری قیادتیں ہوں تو پھر ان جماعتوں کے اندر جمہوری قیادت کہاں سے پیدا ہوگی۔

اس لیے اگر سیاسی جماعتیں اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کریں گی تو اصلاح کا راستہ بھی تلاش کرنا ممکن نہیں رہے گا اور دوسروں پر الزام لگانے کی یہ روایت اب خاصی کمزور ہوگئی ہے اور اسے اب کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔ اس لیے اب سیاسی جماعتوں کی سطح پر نئی سیاسی اصلاحات کی ضرورت ہے اور یہ اصلاحات ہی ان کو دوبارہ عوام میں مقبول بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں کیوں کہ جب تک سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوری اور خوداحتسابی کلچر پیدا نہیں ہوگا تو جمہوریت کا مجموعی تاثر بھی بے معنی ہوگا۔ نئے حالات کے تناظر میں سیاسی جماعتوں کو اپنے آپ کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہوگا جو اسے ایک عملی ادارے کی شکل میں پیش کر سکے۔ سیاسی جماعتوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اب ملک میں پرانے اور فرسودہ خیالات پر مبنی سوچ کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اختیار کر کے وہ اپنے لیے کوئی بہتری کا راستہ تلاش نہیں کر سکیں گی۔ ہمیں سیاسی جماعتوں میں افراد کے مقابلے میں سیاسی جماعتوں کو مضبوط بنانا ہوگا، جہاں قیادتیں اور دیگر اہم افراد اپنی اپنی جماعتوں کے اندر جواب دہ ہوں۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ سیاسی کارکنوں کو جدید سیاسی علوم سے آراستہ کرنا ہوگا، تاکہ وہ سیاسی محاذ پر کوئی فکری کام بھی کر سکیں اور عوام اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ اس انداز میں مضبوط ہو کہ دونوں فریق ایک دوسرے پر اعتماد کر سکیں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنے اندر اوپر سے لے کر نیچے تک جمہوری کلچر پیدا کرنا ہوگا اور اس کی بنیاد اصولوں، نظریات اور اخلاقیات پر رکھنی ہوگی۔ ایسے تمام اقدامات سے نفرت کرنا ہوگی جو ملک میں سیاسی جماعتوں کی کمزوری کا سبب بن رہے ہیں۔ ان حالات میں جب ملک ایک بڑے سیاسی گرداب کا شکار ہے اور اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر ہم ایک مشکل مقام پر کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل کی تعداد میں روزانہ کی بنیادوں پر اضافہ ہو رہا ہے اور غیر ملکی ثقافتی، معاشی یلغار ہے اور معاشرتی اخلاقیات بری طرح پامال ہو رہی ہوں۔ ادارے زوال پذیری کا شکار ہوں اور جہاں ادارے عوام کے مقابلے میں طاقت کے مراکز کے ساتھ کھڑے ہوں، تو ایسے حالات میں سیاسی جماعتوں کی مضبوطی اور بھی زیادہ اہم ہوتی ہے کیوں کہ کوئی بھی پائیدار ترقی اور سیاسی مضبوطی سیاسی جماعتوں کے مضبوط کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے سیاسی جماعتوں کو ملک میں ایک بڑی تبدیلی کے لیے اپنا قبلہ درست کرنا ہوگا۔ وگرنہ یہ آج بھی غیر اہم ہوتی جا رہی ہیں اور آنے والے کل میں ان کی اہمیت اور بھی کم ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارا معاشرہ جو پہلے ہی ناکامیوں سے دوچار ہے مزید سیاسی اور اخلاقی بانجھ پن کا شکار ہو جائے گا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوام کا مزاج اور جمہوری نظام کی ناکامی

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کے تناظر میں ہم سب سے زیادہ سیاسی جماعتوں اور پس پردہ قوتوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور اس میں کافی حد تک سچائی کے پہلو بھی موجود ہیں۔ ہمارے ہاں سیاسی اشرافیہ کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ اس ساری صورتِ حال کے ذمہ دار عوام ہیں کیوں کہ وہ انہیں وہ حق ہی نہیں دیتے جس سے وہ اپنی اور قوم کی صورت حال کو تبدیل کر سکیں۔ اس تجزیے سے کافی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ہمیں بحران درپیش ہیں، ان میں عوام کہیں بھی ذمہ دار نہیں، ایک مکمل سچ نہیں۔ سیاست میں کہا جاتا ہے کہ کسی بھی بڑی تبدیلی کے اصل محرک عوام ہوتے ہیں اور جب تک عوام یہ طے نہ کر لیں کہ وہ صورت حال کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں، حالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اور دنیا بھر کی سیاست میں عوام کو سیاست اور سیاسی جماعتوں کی کنجی کہا جاتا ہے۔ مگر ہمارے بیشتر تاریخ نویس اور دانشور حضرات صورتِ حال کا تجزیہ کرتے وقت عوام کے مزاج اور ان کی کیفیات سمیت ان کے مجموعی کردار کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ صورت عوام کو مظلوم اور دیگر قوتوں کو ظالم بنا کر پیش کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جیسا معاشرہ ہوتا ہے ویسا ہی نظام بھی وہاں پر آئے گا، یعنی جیسے لوگ ویسا ہی نظام۔

پاکستانی معاشرے کے بارے میں بہت سے لوگ وثوق سے کہتے ہیں کہ یہ ایک زوال پذیر معاشرہ ہے اور ہر شعبہ زندگی اس صورتِ حال کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ صورت حال یک دم ہی پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ کسی ایک فرد یا گروہ کی ناکامی ہے۔ درحقیقت یہ صورت حال ہماری اجتماعی ناکامی کا نتیجہ ہے اور اس میں معاشرے کے تمام فریق نہ کسی شکل میں حصہ دار ہیں۔ جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے، اس ناکامی کے اصل ذمہ دار حکمرانوں کا طرزِ عمل اور ریاستی اداروں کی کارکردگی ہے۔ تو سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ریاست اور حکومت کا مجموعی مزاج کبھی عوام دوستی پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ وہ خالصتاً اپنے مفادات کے تحت کام کرتے ہیں۔ جب عوام کو اندازہ ہو کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے تو وہ صورت حال کو تبدیل کرنے کے عملاً ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ حکمران، ریاست اور اس کے ادارے ہواؤں میں نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے بلکہ یہ بھی عوام کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں اور عوام ہی میں سے لوگ جا کر ان اداروں میں نمائندگی کرتے ہیں۔ جو حکمران اور ریاست ادارے اپنے ذاتی مفادات کو قومی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں، وہ ایک لحاظ سے عوام کی مدد کے ساتھ ہی سب کچھ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ پچھلے 63 برسوں میں جب بھی عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کریں تو انہوں نے کیا فیصلے کیے۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ اگر واقعی عوام کے فیصلے ٹھیک تھے تو پھر ہمیں اجتماعی سطح پر ناکامی سے کیوں دوچار ہونا پڑا۔ عوام کی نفسیات کا جائزہ لیں تو اس میں کافی دلچسپ صورتِ حال نظر آتی ہے۔ وہ سیاسی شعور تو کجا ہمارے ہاں تو خواندگی ہی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریاست کی سطح پر بالخصوص لڑکیوں کی شرح خواندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سطح پر ریاست اور حکومت کی جانب سے لوگوں کو تعلیم اور شعور کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ یہ سمجھنا مناسب نہیں کہ عوام غلط فیصلے نہیں کرتے کیوں کہ جب عوام کو اچھے اور برے کی تمیز نہ ہو تو اچھے فیصلے کیسے ہو سکتے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں عوام کی اکثریت کسی اصول اور نظریہ کے بنیاد پر کم ہی فیصلہ کرتی ہے کیوں کہ ان کے فیصلوں میں ذات، برادری، مذہبی فرقہ بندی، خاندانی دباؤ، شخصیت پرستی اور ذاتی کاروباری مفادات سمیت خوف اور ڈر کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں۔ عوام اپنے فیصلے کرتے وقت ان گروپوں کو مطمئن کرنے یا انہیں خوش کرنے میں مگن ہوتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرزِ عمل سے ان کو کسی نہ کسی شکل میں ضرور فائدہ پہنچے گا۔ بعض اوقات ان پر قومی اور بڑے مفادات کے مقابلے میں ذاتیات کی سیاست غالب ہو جاتی ہے اور وہ اسی تک اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ ہمارے عوام بالخصوص غریب اور محروم طبقات اور دیہات میں رہنے والے لوگوں کو کس حد تک اپنے فیصلوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ انہی عوام کی جانب سے ہمیں جو مضبوط مزاحمتی تحریک نظر آتی تھی وہ بھی اب خاصی کمزور ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ محض عوام نہیں بلکہ ہمارے سیاسی نظام کی ناکامی ہے۔ تجربات کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا ہے کہ انہیں مزاحمت کرنے کی بجائے خود بھی اسی طرح کی مفاداتی سیاست کرنی چاہیے جیسی ہمارے بڑے یا سیاسی رہنما کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے عوام کی جانب سے اس رویہ اور کمزور مزاحمت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بالادست طبقات اور زیادہ مضبوط ہو گئے اور ان کا خیال ہے عوام کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ریاست، حکومت اور بالادست طبقات کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ لوگوں کو مضبوط بنانے کی بجائے انہیں کمزور رکھیں اور انہیں بڑے مسائل پر سوچنے اور سمجھنے کی بجائے اپنے معاملات کو روزمرہ کے کاموں تک محدود رکھیں۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ عام لوگ ریاستی و حکومتی امور کے معاملات میں دلچسپی لیں اور پوچھیں کہ نظامِ حکومت اس انداز میں کیوں چلایا جا رہا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے ہاں چار قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ جو سارے کام غلط مفادات یا ذاتی مفادات کے لیے کرتے ہیں اور ان کے سامنے قومی یا دیگر اہم مفادات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ محض اپنی خوشنودی کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوتے ہیں جو غیر قانونی ہوتا ہے۔ اس طبقہ کا خیال ہے دولت، اختیارات اور طاقت کا حصول ہی اہم ہوتا ہے اور اگر یہ آپ کے پاس ہیں تو آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ لوگ دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی انہی کے راستے پر چلیں تاکہ وہ بھی کامیاب ہوں۔ دوسرا طبقہ وہ ہوتا ہے جو بنیادی طور پر اپنے سیاسی و سماجی شعور و عقل کی کمی کی وجہ سے غلط فیصلے کرتا ہے۔ اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہوتی اور حقیقی معنوں میں یہ لوگ مختلف بالادست طبقوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو اچھے اور برے کی ضرور تمیز رکھتا ہے اور برے کاموں کو دل و زبان سے تو برا کہتا ہے لیکن کسی طرز کی مزاحمت کے لیے وہ بالکل تیار نہیں ہوتا۔ ایک طبقہ ایسا ضرور ہے جو سیاسی شعور بھی رکھتا ہے اور مزاحمت کرنا بھی جانتا ہے لیکن چوں کہ اسے کوئی بڑی حمایت اور مدد گار ڈھانچا نہیں ملتا کہ اس کی مزاحمت کی پذیرائی کی جائے یا اس کو مدد دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عوام میں ایسا طبقہ جو مزاحمت کا حامی ہے، اس کی جدوجہد کا اسے وہ صلہ نہیں ملا جس کا وہ حق دار تھا۔ عوام میں ایسے لوگوں کی بے توقیری کے باعث وقت کے ساتھ ساتھ ان میں یہ رجحان مضبوط ہوا کہ ہمیں مزاحمت کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ جب لوگ طاقت کے حصول اور اختیار کو اصل منزل سمجھ لیں تو اس کا اثر براہ راست معاشرے کے مجموعی مزاج پر پڑتا ہے۔ آپ ملک میں یا ملک سے باہر ہونے والے مختلف عوامی سروے کے نتائج پر نظر ڈالیں تو آپ حیران ہوں گے کہ لوگوں کو جمہوریت سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں۔ وہ صرف اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ بعض سروے کے نتائج کے مطابق لوگوں کی ایک اچھی خاصی بڑی تعداد نے فوجی حکمرانوں کو زیادہ پسند کیا اور انہیں سول حکمرانوں کے مقابلے میں بہتر حکمران تسلیم کیا۔ آج بھی اگر آپ عام لوگوں سے پوچھیں کہ پاکستان کے بہترین حکمران یا حکومتیں کون سی تھیں، تو لوگوں کی اکثریت ایوب خان کے نظام کو بہتر قرار دے گی۔ جنرل ضیا کو بھی پسند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کبھی پسندیدہ حکمران نہیں رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم یا تو شخصیات پرستی میں مبتلا ہیں یا طاقت کے کھلاڑیوں کے ساتھ اپنی وابستگی کو ظاہر اپنی سیاسی مجبوری سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں بعض فوجی اور سول حکمرانوں کی اکثریت نے آمرانہ طرز عمل اختیار کیا تو اس کو عوام ہی سے سپورٹ ملی۔ جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف نے جب ملک میں ریفرینڈم کروائے تو انہیں بھرپور قومی حمایت ملی۔

ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی آمرانہ سیاست کو بھی ان کے چاہنے والوں کی جانب سے پذیرائی ملی اور ان کے بقول ان کا قائد غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ لوگوں کے اس مزاج کا جو مفادات پر مبنی تھا ان بالادست طبقوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور آج بھی یہ کھیل جاری ہے۔ معاشرتی سوچ کا جائزہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیں تو آپ کو لگے گا کہ لوگ دیوانگی کی حد تک اپنے رہنماؤں کے ساتھ ہیں۔ اور ان سے جب کہا جاتا ہے کہ آپ کے بڑے لیڈروں نے بڑی کرپشن اور بدعنوانی کی ہے تو انہیں اس پر کوئی ندامت نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کا مختلف حوالوں سے جواز فراہم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بڑے ایشوز نہیں ہیں۔ اس طرزِ عمل سے کرپشن کا اخلاقی جواز لوگوں کو ملتا ہے اور اسی طرح کرپشن سب لوگوں میں عام ہوتی ہے۔

پھر لوگ انتخابات کے دوران جو طریقہ اختیار کرتے ہیں، اس پر کوئی زیادہ بات نہیں کرتا۔ پچھلے کچھ عرصے سے عام ووٹروں نے امیدواروں سے مطالبات کرنے شروع کر دیئے ہیں اگر وہ کہتے ہیں کہ آپ ہمارے فلاں فلاں کام یعنی سڑک وغیرہ بنوا دیں تو ہم آپ کو ووٹ دیں گے۔ یعنی ابھی وہ منتخب نہیں ہوتا اور ہم اس کے سامنے مطالبات کی فہرست پیش کرتے ہیں جو مناسب نہیں ہے۔ اس صورت حال میں امیدواروں کے پاس غیر قانونی اقدام کے سوا اور کیا چارہ رہ جاتا ہے۔ اب آٹھ انتخابات کے دوران سڑکوں پر ایسے بینرز واضح نظر آتے ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے پہلے سڑک پھر ووٹ یا پہلے سوئی گیس پھر ووٹ۔ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ منتخب ارکان نے جیتنے کے بعد ہمیں کہاں ملنا ہے اس لیے انتخابات سے قبل ہی کچھ لو اور دو کی بنیاد پر ووٹوں کا سودا کر لیا جائے۔ اس کھیل میں وہ امیدوار پیچھے رہ جاتے ہیں جو مالی طور پر کمزور امیدوار ہوتے ہیں۔ اس طرح پیسے نہ ہونے کے باعث وہ انتخابی سیاست میں غیر اہم بن جاتے ہیں۔ پھر ارکان اسمبلی اس بات کا گلہ کرتے نظر آتے ہیں کہ منتخب ہونے کے بعد ووٹران کے پاس ہے، وہ صرف انہیں نالیوں، گلیوں اور تھانوں تک ہی محدود رکھتے ہیں اور ان کے سامنے کوئی بڑا سیاسی ایجنڈا نہیں ہوتا۔ ان کے مسائل میں اجتماعیت کے مقابلے میں انفرادی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ عوام کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ چوں کہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے، اس لیے ہم کیوں کسی کا اعتبار کریں۔ یہ بات درست ہے کہ بہت کچھ غلط ہو رہا ہے اور اسی کا تو یہاں ماتم کیا جا رہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت حال کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے یا اس کو تبدیل کرنا چاہیے؟ اگر کسی کا خیال ہے کہ یہ صورت حال بالادست طبقے تبدیل کریں گے تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس کے لیے عوام ہی کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا۔ میرا مقصد محض عوام کو قصوروار ٹھہرانا نہیں کرنا بلکہ یہ باور کروانا ہے کہ عوام خود ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے آپ کو منظم کر کے صورت حال کو تبدیل کر سکتے ہیں۔

ایک اور معاملہ یہ ہے کہ لوگوں کے تناظر میں وہ تمام سیاسی و سماجی ادارے ناکام ہو گئے ہیں جو لوگوں کی فکری رہنمائی کرتے ہیں اور ایک سیاسی ذہن تشکیل دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس میں جہاں قصور لوگوں کا ہے وہیں بنیادی خرابی ان اداروں کی بھی ہے جو اپنا کردار ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر یہ ادارے فعال ہوتے اور اپنی ذمہ داری بہتر انداز میں ادا کرتے تو آج لوگوں کے مزاج بالکل مختلف ہوتے۔ اصل میں لوگوں کی سطح پر سب سے بڑی خرابی ان کے منظم نہ ہونے اور مزاحمت کے کمزور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یلو کا ہے۔ مزاحمت منظم انداز میں ہو تو وہ اپنا اثر رکھتی ہے۔ عوام اگر یہ طے کر لیں کہ وہ مفاداتی سیاست کا صہ بننے کی بجائے ملکی اور قومی مفادات کو ترجیح دیں گے تو اس کا اثر ہوگا۔ مگر یہ کام آسان نہیں اور اس کے لیے عوام اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اشتراک کار کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن یہاں عوام کی اکثریت نے پنے آپ کو سیاسی نظام اور سیاسی جماعتوں سے لاتعلق کر رکھا ہے اور ان کا خیال ہے کہ صورت حال خود ہی بدیل ہو جائے گی۔ لوگوں کا ایک معاملہ یہ بھی ہے۔ اب ان کا سیاسی عمل اور سیاسی جدوجہد پر یقین کم ہو گیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں رہی۔ یہ کام سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما کریں گے ہاں کہ ایسا ممکن نہیں کیوں کہ جب تک عام لوگ سیاسی جماعتوں کا حصہ نہیں بنیں گے، صورت حال بدیل نہیں ہوگی۔ لوگ چاہے کسی بھی گروپ سے تعلق رکھتے ہوں، ان کو سب سے پہلے شخصیت پرستی کے مار سے باہر نکالنا ہوگا اور یہ ماننا ہوگا کہ مقبول شخصیتیں بھی غلطی کر سکتی ہیں اور ان کا بھی احتساب ضروری ہے۔ نام نہاد شخصیت پرستی کا بخار ایک ایسا بخار ہے جس کا علاج ہمارے جیسے فرسودہ معاشروں میں بہت ضروری ہے کیوں کہ اسے ٹھیک کیے بغیر ہم کوئی بھی مضبوط، شفاف اور احتساب پر مبنی نظام نہیں تشکیل دے سکیں گے۔ اس لیے جو لوگ بھی اس ملک میں تبدیلی کے خواہش مند ہیں، انہیں ایک نئے انداز سے اپنے آپ کو منظم کرنا ہوگا۔ ہمیں ڈر اور خوف کی بنیاد سے باہر نکل کر عوامی طاقت پر انحصار کرتے ہوئے اپنی نئی سیاسی حکمت عملی ترتیب دینا ہوگی۔ اور یہ حکمت عملی ایک ایسا راستہ تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو ہمیں بطور ایک معاشرہ درکار ہے۔

اسی طرح سیاسی جماعتوں اور سیاسی اشرافیہ کے گروپوں کو بھی سمجھنا ہوگا کہ اگر وہ لوگوں کی سیاسی و معاشی تعلیم پر کام نہیں کریں گے اور لوگوں کو اچھے اور برے کا ادراک نہیں دیں گے تو لوگ کیسے تبدیل ہوں گے۔ جو لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں ان کو ایک مددگار ریونٹ کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسا کوئی نظام بن سکیں گے جو ان لوگوں کی معاونت کرے جو نظام کی تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنے طور طریقے تبدیل کریں تو لوگ بھی تبدیل ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ کوئی شارٹ کٹ اور جلد سے جلد آگے بڑھنے کا عمل ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس سے گریز کر کے انہیں سیاسی عمل کا حصہ بننا ہوگا اور جدوجہد کے راستے کو اپنی بنیاد بھی بنانا ہوگا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محاذ آرائی کی سیاست میں جمہوریت کا سفر

پاکستان کی سیاست کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہاں تریسٹھ چونسٹھ برسوں کے دوران اگر جمہوری استحکام قائم نہیں ہو سکا تو اس کی ایک بڑی وجہ سیاسی بساط پر سیاسی فریقین کے درمیان محاذ آرائی کی سیاست تھی۔ اس طرز سیاست نے ہماری جمہوریت کو بھی نقصان پہنچایا اور جو کمزور سا سیاسی نظام تھا، اسے بھی جمہوری انداز میں پنپنے نہیں دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1970ء ہی میں ہماری سیاست، بھٹو دشمنی اور بھٹو دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اینٹی بھٹو اور پرو بھٹو سیاست نے اس معاشرے میں ایک طویل عرصے تک لوگوں میں ایک واضح سیاسی خلیج پیدا کیے رکھی اور لوگ ایک دوسرے کے اس انداز میں خلاف ہوئے جیسے وہ دشمن ہوں۔ دونوں فریقین نے ایک دوسرے کو وطن دشمن اور غدار جیسے القابات سے نوازا اور جب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو ان کے مخالفین نے اس پر مزاحمت کرنے کی بجائے خوشی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ بعض گروپوں نے مٹھائیاں بھی بانٹیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کو قومی اتحاد کی تحریک کے دوران اس انداز میں مخالفین نے پیش کیا جیسے وہ اسلام کے دشمن تھے۔ بھٹو صاحب نے بھی اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ وہ بدترین سلوک کیا جس کی کسی بھی سطح پر حمایت نہیں کی جا سکتی۔ جنرل ضیاالحق نے جب فوجی مداخلت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے خلاف بہت زیادہ انتقامی کارروائیاں کیں، یہاں تک کہ ان پر وحشیانہ تشدد بھی کیا گیا۔

پاکستان میں پی این اے کی تحریک، بھٹو اور بھٹو مخالفین کے درمیان ایک بڑی جنگ ثابت ہوئی اور اس کا منطقی نتیجہ ملک میں فوجی مارشل لاء کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی سے وابستہ افراد تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے زوال میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما تھے، وہیں پی این اے کی تحریک نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اسی تحریک نے پاکستان کی سیاست کو عملاً بھٹو کے حامیوں اور اس کے مخالفین میں تقسیم کیا اور یوں ملک میں ایک دوسرے کے بارے میں عدم برداشت کا کلچر مضبوط ہوا۔ بنیادی طور پر پی این اے کی تحریک ایک بڑی تحریک تھی اور اسے پس پردہ قوتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔

اس تحریک پر ممتاز دانشور، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار مرحوم عبدالکریم عابد نے اپنی سوانح عمری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سفر آدھی صدی کا" میں شامل مضمون "پی این اے کا انجام" میں لکھا ہے:

"پی این اے کی تحریک نے بڑا قومی ابھار پیدا کیا، اگر چہ زیادہ تر یہ شہری علاقوں میں رہا اور دیہات اس سے کم متاثر ہوئے، تاہم تحریک میں جھوٹ اور خوش فہمیوں کو شامل نہ کیا جاتا اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس کے رہنما مل جل کر اسے چلاتے اور چلائے رکھتے تو ملک کو کچھ اور نہ ملتا لیکن ایک سیاسی نظام مل جاتا اور اس کا ارتقا ہوتا، سیاسی مفاہمت کا عمل بھی ترقی پاتا، لیکن کچھ لیڈروں کی منافقت تھی، کچھ سادہ لوحی تھی اور کچھ پس پردہ قوتوں کی کارفرمائی تھی کہ پی این اے کی تحریک ہر ایک کے لیے پچھتاوا بن گئی۔"

(صفحہ 274)

پاکستان میں سیاسی محاذ آرائی کا ایک سیاہ ترین باب 1988ء سے 1997ء تک کی سیاست تھی س میں ماضی کی سیاسی محاذ آرائی میں اور زیادہ شدت پیدا کی گئی۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی سیاست ر ایک دوسرے کے خلاف اسٹیبلشمنٹ کی مدد سے کی جانے والی محاذ آرائی نے ملکی سیاست پر بہت زیادہ فی اثرات مرتب کیے۔ مثلاً 1988ء میں پہلی بار جب محترمہ بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم بنیں تو ان کے قابلے میں سب سے بڑے صوبے پنجاب میں نواز شریف وزیراعلیٰ تھے۔ مرکز اور صوبے میں نواز شریف ر بے نظیر بھٹو کی سیاست کے تناظر میں جو محاذ آرائی کا طوفان مچایا گیا وہ ہماری سیاسی تاریخ پر ایک بدنما غ ہے۔ نواز شریف 1988ء میں بطور وزیراعلیٰ پنجاب جو کچھ محاذ آرائی کی صورت میں کر رہے تھے، اس یں انہیں بعض پس پردہ قوتوں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ اس محاذ آرائی کے نتیجے میں 1988ء سے لے ر 1997ء تک اس ملک میں جو بھی جمہوریت کا تجربہ کیا گیا، وہ عملاً ناکام رہا۔ ان دونوں سیاسی فریقین یں سے جس نے بھی حکومت بنائی، اس کو پہلے ہی دن سے مخالفت کا شدید سامنا کرنا پڑا۔ نواز شریف یا بے نظیر بھٹو میں سے جو بھی اقتدار میں آیا، اس نے دوسرے کی حکومت کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا ر کہا کہ آنے والی حکومت جعلی ہے اور ہم اس کو کسی بھی طور پر برداشت نہیں کریں گے۔ اس محاذ آرائی کا یک نتیجہ یہ نکلا کہ 1988ء، 1990ء، 1993ء اور 1997ء میں بننے والی بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کومتیں اپنی آئینی میعاد پوری کرنے سے پہلے ہی کرپشن اور بدعنوانی کے الزامات میں ختم کر دی گئیں۔ وئی بھی سیاسی حکومت ان ادوار میں اپنی حکومت کی مدت کو پوری نہیں کر سکی اور یہ دونوں قوتیں سٹیبلشمنٹ کی سیاست کی مدد سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہیں۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں یا ریقین کے درمیان ہونے والی سیاسی محاذ آرائی کا نتیجہ دونوں جماعتوں کے سیاسی کارکنوں اور ملک میں وجود اہل دانش میں بھی نظر آیا۔ وہ لڑائی جو محض اقتدار کے حصول کے لیے تھی اور اس کا عام آدمی کی زندگی ے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ان کو بھی اس لڑائی میں ڈال دیا گیا۔ گلی محلوں کی سطح پر سیاسی کارکنوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوران کے حمایت یافتہ لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف ہونے والی اس محاذ آرائی میں تشدد کا عنصر بھی غالب آیا۔ کئی سیاسی کارکن دونوں اطراف سیاسی محاذ آرائی کی سیاست کی نذر ہو گئے۔

بدقسمتی سے اس محاذ آرائی نے ملک کے اہل دانش کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ کیمپوں میں تبدیل ہو گئے۔ معاشرے اور سیاسی عمل کو جتنا زیادہ نقصان اہل دانش نے پہنچایا، اس کا ازالہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ لوگ رائے عامہ پر براہ راست اثر انداز ہوئے اور انہوں نے لفظوں اور زبان کی جنگ میں دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان ہونے والی اقتدار کی اس جنگ کو سچ اور جھوٹ یا حق اور باطل کی جنگ میں تبدیل کر دیا۔ دونوں اطراف کے لوگ یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو میں سے کوئی ایک محب وطن اور دوسرا ملک کا غدار ہے۔ اس کام کے لیے یہ نام نہاد اہل دانش بڑے بڑے سیاسی جواز پیش کرتے اور عام لوگوں کے لیے گمراہی کا بے پناہ سامان مہیا کرتے۔ ان میں سے بیشتر لوگ شعوری اور بعض لوگ غیر شعوری طور پر اس محاذ آرائی کے کھیل میں استعمال ہوئے۔ جو لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ اصولوں اور نظریات کی جنگ ہے تو حالات نے ثابت کیا کہ یہ بھی غلط تھا اور یہ لڑائی محض اور محض اقتدار کے لیے تھی۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے میثاق جمہوریت پر دستخط کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ ہم دونوں رہنما ماضی میں ایک دوسرے کے خلاف جو محاذ آرائی کرتے رہے ہیں، وہ اسٹیبلشمنٹ کی مرضی سے ہوتی رہی۔ پس پردہ قوتیں جو ہمیں ٹاسک دیتی تھیں ہم اسی پر عمل پیرا ہوتے تھے اور ہمیں کہا جاتا تھا کہ ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کی بجائے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کریں اور اسی کام کے عوض آپ کے اقتدار کو مضبوط بنایا جائے گا یا آپ کو فلاں شخص کے مقابلے میں اقتدار کے کھیل کا حصہ بنایا جائے گا۔

محاذ آرائی کے اس کھیل میں ادارے جو پہلے ہی کمزور تھے، مزید کمزور کر دیئے گئے اور دونوں فریقین نے اپنے اپنے دور میں اپنے سیاسی مخالفین کو نیچا دکھانے کے لیے ان سیاسی و انتظامی اداروں کو برے طریقے سے استعمال کیا۔ آج پاکستان میں ہمیں جمہوریت جو کمزور نظر آتی ہے اور جس انداز میں ادارے کمزور ہوئے ہیں، اس میں دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ سیاسی محاذ آرائی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ کے اس کھیل میں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو استعمال تو ہوئے لیکن انہوں نے عام لوگوں کو سیاست اور سیاسی نظام سے سخت متنفر کر دیا اور لوگوں میں یہ احساس غالب ہوا کہ سیاست محاذ آرائی اور ایک دوسرے کو قبول نہ کرنے کا نام ہے۔

یہ محاذ آرائی محض سیاست تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ جو سیاسی کلچر اس کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا وہ ایک دوسرے کو قبول نہ کرنے کا تھا اور اس نے رواداری پر مبنی سیاسی نظام کو سخت نقصان پہنچایا۔ اسی دور میں اسٹیبلشمنٹ نے پیپلز پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھٹو مخالفین کو اکٹھا کر کے اسلامی جمہوری اتحاد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیاد ڈالی۔ اُس دَور میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل (ر) حمید گل اس بات کا صاف اقرار کرتے ہیں کہ وہ اس اتحاد کے بنانے اور سب کو اکٹھا کرنے میں پیش پیش تھے۔ ان کے بقول پیپلز پارٹی کے خلاف یہ اتحاد بنانا بہت ضروری تھا کیوں کہ بے نظیر بھٹو ملک کے لیے سیکیورٹی رسک بن چکی تھیں اور ان کا راستہ روکنا ملکی مفاد کے لیے بہت ضروری تھا۔ یہاں تک کہ اس کھیل میں آئی ایس آئی نے اسلامی جمہوری اتحاد کے حمایت یافتہ انتخابی امیدواروں کو سرکاری خزانے سے بھاری رقوم بھی دیں تاکہ وہ اپنے سیاسی مخالف، یعنی پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے مقابلے میں انتخابی کامیابی حاصل کریں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سیاسی محاذ آرائی ہماری پس پردہ قوتوں کا ایجنڈا تھا اور اگر سیاسی جماعتوں کو موقع ملتا اور فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا تو وہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور سیاسی استحکام کا راستہ نکال سکتی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسٹیبلشمنٹ اس بحران کی ذمہ دار ہے لیکن یہاں یہ بھی سوال ضرور سامنے رکھنا ہوگا کہ کیا سیاسی جماعتیں، ان کی قیادت اور سیاسی کارکن سمیت اہل دانش اتنے ہی معصوم اور بے خبر ہیں کہ وہ ان لوگوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہے اور انہیں اس کا شعوری طور پر کوئی احساس بھی نہیں ہوا۔ سیاسی قیادتوں کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ان مسائل کی ذمہ دار وہ خود بھی ہیں اور اگر وہ اپنے دانش اور فہم و فراست کو بہتر انداز میں استعمال کرتیں اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا حصہ نہ بنتیں تو اس سیاسی محاذ آرائی سے بچا جا سکتا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ جب آپ اقتدار کی سیاست کے کھیل کا حصہ بن جائیں اور سمجھ لیں کہ اقتدار کا حصول ہی سب کچھ ہے تو سیاسی مخالفین کے بارے میں قبولیت کا معاملہ سرد ہو جاتا ہے۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر سیاسی عمل میں اسے کام کرنے کا پورا موقع ملے تو کہیں یہ سیاسی میدان میں اپنے لیے ہم سے زیادہ جگہ نہ پیدا کر لے اور اسی تناظر میں محاذ آرائی کو پیدا کیا اور بڑھایا جاتا ہے۔

پاکستان میں 1985ء سے لے کر 1999ء تک جو بار بار فوجی مداخلتیں ہوئیں اور اسمبلیوں سمیت سیاسی و جمہوری حکومتوں کو آمرانہ انداز سے برطرف کیا گیا، اس میں جہاں فوجی رضامندی کا دخل تھا، وہیں سیاسی عناصر بھی جمہوری توقعات پر پورا نہیں اتر سکے تھے۔ فوجی حکومتوں کا خیال تھا کہ ہم حکومتوں کو گرا کر اس کھیل میں سیاسی استحکام پیدا کر لیں گے لیکن اس کے برعکس حکومتوں کا تسلسل نہ ہونے اور انہیں جبری طور پر گھر بھیجنے کی روایت نے معاشرے میں پہلے سے موجود سیاسی محاذ آرائی میں مزید اضافہ کیا۔ بے نظیر اور نواز شریف کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ جب بھی برا سلوک ہوا، اس کی ایک ذمہ داری فوج پر تھی تو دوسری ان کے سیاسی مخالف پر بھی عائد ہوتی ہے جو پس پردہ قوتوں کے ساتھ مل کر ان کی حکومت کے خاتمے کی سازشیں کرتے رہتے تھے۔

اسی محاذ آرائی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان ادوار میں ہونے والا تمام تر ترقیاتی کام بھی سیاست کی نذر ہو گیا اور ملک ترقیاتی امور میں بہت پیچھے چلا گیا۔ بے نظیر بھٹو جب 1988ء میں پہلی بار وزیر اعظم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیں تو انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو کے پانچ نکاتی پروگرام کا خاتمہ کیا اور اس کی جگہ پیپلز ورکس پروگرام کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت نواز شریف وزیراعلیٰ پنجاب تھے، انہوں نے تعمیر وطن پروگرام کے نام سے پنجاب میں ترقیاتی پروگراموں کا آغاز کیا۔ اسی طرح 1990ء میں جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو انہوں نے پیپلز ورکس پروگرام کا خاتمہ کر دیا اور تعمیر وطن پروگرام کے نام سے اپنے کام کو جاری رکھا۔ جب محترمہ بے نظیر بھٹو 1993ء میں دوبارہ وزیراعظم بنیں تو انہوں نے نواز شریف کے تعمیر وطن پروگرام کو ختم کر کے اپنے پیپلز ورکس پروگرام کا دوبارہ اجرا کیا۔ یہ کھیل مزید جاری رہا اور 1997ء میں نواز شریف نے دوبارہ ماضی کی تاریخ دہرائی اور اپنا پروگرام پھر آگے بڑھایا اور جب 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے پیپلز ورکس اور تعمیر وطن پروگرام کے مقابلے میں اپنا سات نکاتی ترقیاتی و سیاسی ایجنڈا جاری کیا۔ اس سارے کھیل میں اس ملک کے اندر کوئی بھی مربوط اور جامع ترقیاتی منصوبہ سازی نہیں ہو سکی اور سارا ترقیاتی کام سیاست اور محاذ آرائی کی نذر ہو گیا۔ محاذ آرائی کے اس کھیل کی وجہ سے جہاں سیاست کو نقصان پہنچا، وہیں اداروں کے سیاسی استعمال نے ان اداروں کو جو پہلے ہی کمزور تھے، مزید کمزور کیا۔ ملکی معیشت کو سخت نقصان پہنچا اور ملک میں سرمایہ کاری کے مواقع بھی کم ہوئے۔ ظاہری بات ہے کہ جب حکومت اور حزب اختلاف دونوں ہی ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کریں گی اور کرپشن اور بدعنوانی کے قصے عام ہوں گے۔ جب ہم جان بوجھ کر میڈیا میں ایک دوسرے کی کردار کشی کریں گے تو کون یہاں سرمایہ کاری کرے گا۔ بیرونی سرمایہ کاری تو کجا اندرونی سطح سے بھی کوئی سرمایہ کاری کے لیے تیار نہیں ہوگا اور ظاہر ہے جمہوریت یہاں مضبوط نہیں ہو سکے گی جس کے اثرات عوام کے ساتھ ساتھ ملکی ترقی پر بھی پڑیں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں انتخابات کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ

کسی بھی جمہوری معاشرے میں انتخابات بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیوں کہ یہی وہ ذریعہ ہے جو مسلح جدوجہد کے مقابلے میں پُرامن جدوجہد کا راستہ فراہم کرتا ہے۔ انتخابات لوگوں کو موقع بھی فراہم کرتے ہیں کہ وہ اپنے ووٹ کی بنیاد پر اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔ پاکستان میں انتخابات کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی طرح کے سوالات موجود ہیں اور اس تناظر میں ہونے والے کئی فیصلے اور انتخابات اور ان کے نتائج پر لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں انتخابات میں تسلسل کبھی بھی نہیں رہا اور کئی ادوار جمہوری اور انتخابی عمل کے بغیر آمریت اور ڈکٹیٹرشپ کے سائے میں رہے ہیں۔ یہاں جمہوری عمل کو وقفے وقفے سے سبوتاژ کر کے فوجی حکمران اپنی حکمرانی کو بالادست کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوریت اور جمہوری قدریں نہ تو مضبوط ہو سکیں اور نہ ہی اس کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکا۔ اس لیے یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاں انتخابات کی تاریخ کا عمل ہمیشہ ہی متنازع رہا ہے۔

قومی سطح پر ملک میں عام انتخابات پہلی مرتبہ اکتوبر 1970ء میں ہوئے، تاہم انتخابات کی تاریخ اور اس میں موجود شکوک وشبہات اس سے بھی پرانے ہیں، مثلاً ہمارے خطے میں آئین اور انتخابات کی تاریخ 70 سال پرانی ہے اور 1935ء کے قانون ہند کے تحت پہلے انتخابات 1937ء میں منعقد ہوئے۔ اسی طرح 1935ء کے قانون کی دفعہ 10 کے تحت اسمبلی توڑنے اور حکومت کو برخاست کرنے کا اختیار گورنر جنرل کو حاصل تھا لیکن انگریزوں نے اس غیر جمہوری حق کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے 1953ء میں پہلی بار 1935ء کے قانون کی دفعہ 10 کے تحت یہ اختیار استعمال کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو برطرف کیا۔ ملک میں پہلے انتخابات صوبہ مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ اتحاد نے 1954ء میں جیتے تو وہاں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ اسی طرح 1956ء کے آئین کی تحت نومبر 1958ء میں ہونے والے عام انتخابات سے قبل مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ جنوری 1965ء کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں جنرل ایوب خان کو کامیاب قرار دے دیا گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1970ء کے انتخابات کے بعد حکومت سازی کے لیے شیخ مجیب، ذوالفقار علی بھٹو اور یحییٰ خان میں تصفیہ نہ ہو سکا اور دسمبر 1971ء میں ملک دولخت ہو گیا۔ اسی طرح 1977ء کے انتخابات کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو پر دھاندلی کے الزامات عائد کیے گئے، اور اس کے نتیجے میں جنرل محمد ضیاالحق نے ملک میں فوجی مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس کے بعد 1985ء کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد اسمبلی نے آرٹیکل 58 ٹوبی کی منظوری دی اور نومبر 1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو کامیابی ملی۔ اکتوبر 1990ء کے انتخابات میں نواز شریف وزیراعظم بنے اور 1993ء کے انتخابات کے نتیجے میں دوبارہ بے نظیر وزیراعظم بنیں۔ اس کے بعد نواز شریف بھی 1997ء کے انتخابات میں ایک بار پھر وزیراعظم بنائے گئے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ 1985ء سے لے کر 1997ء تک بننے والی تمام اسمبلیاں اور اس کے تحت بننے والی حکومتیں اپنی مدت پوری نہیں کر سکیں۔ سب کی سب حکومتیں کرپشن اور بدعنوانی کی بنا پر برطرف کر دی گئیں۔ محمد خان جونیجو، بے نظیر بھٹو، نواز شریف، جنرل محمد ضیاالحق، غلام اسحاق خان، صدر فاروق لغاری اور جنرل پرویز مشرف کی جانب سے مداخلتوں کے باعث کئی حکومتیں اپنا تسلسل برقرار نہ رکھ سکیں۔ ان تمام حکومتوں کو کرپشن، بدعنوانی اور ریاست کے خلاف ماورائے آئین اقدامات کے باعث برطرف کیا گیا تھا۔ نواز شریف کی 1990ء کی حکومت کو اگرچہ سپریم کورٹ نے بحال کر دیا تھا لیکن بعد ازاں وہ اور صدر غلام اسحاق خان پس پردہ قوتوں کی مدد سے ہونے والے ایک معاہدے یا ڈیل کے تحت مستعفی ہو گئے۔ جنرل پرویز مشرف کی جانب سے 1999ء میں نواز شریف حکومت کے خاتمے کے بعد 2002ء میں ہونے والے انتخابات میں جو حکومت بنی، اس نے پہلی بار اپنی پانچ سالہ مدت پوری کی۔ البتہ اس حکومت کے عرصہ اقتدار کے دوران تین وزیراعظم منتخب ہوئے، جو میر ظفر اللہ جمالی، چوہدری شجاعت حسین اور شوکت عزیز تھے۔ اس حکومت کی پانچ سال کی مدت پوری ہونے کی بڑی وجہ حکومت پر جنرل پرویز مشرف کا بھرپور کنٹرول تھا۔

جہاں تک انتخابات کی شفافیت یا متنازع ہونے کا تعلق ہے، تو اس پر کئی تبصرے کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ملک میں ہونے والے پہلے صوبائی انتخابات 10 مارچ 1951ء کو پنجاب میں منعقد ہوئے۔ پاکستان کمیونسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے مقابلے میں کئی مضبوط امیدوار کھڑے کیے تھے۔ تاہم صوبائی انتخابات سے دو روز قبل حکومت کو راولپنڈی سازش کیس کو افشا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس تناظر میں کمیونسٹ پارٹی کے ہزاروں کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا، اس کے باوجود ملک کے کونے کونے سے انتخابات میں دھاندلیوں کی شکایات موصول ہوئیں۔ سیالکوٹ سے خواجہ صفدر کا انتخاب متنازع تھا۔ لاہور میں مرزا ابراہیم کے سینکڑوں ووٹ مسترد کر کے احمد سعید کرمانی کو کامیاب قرار دیا گیا، جھرلو کی اصطلاح اسی انتخاب میں سامنے آئی۔ دوسرے صوبائی انتخابات دسمبر 1951ء میں صوبہ سرحد میں منعقد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے، جہاں خان عبدالقیوم خان صوبائی وزیراعلیٰ تھے۔ اس انتخابی مہم میں خان قیوم اپنے پسندیدہ امیدواروں کو کامیاب کرانے میں اس حد تک آگے چلے گئے کہ خود مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری اسلم خٹک نے الزام لگایا کہ قیوم خان نے حکمران مسلم لیگ کے ناپسندیدہ امیدواروں کو اٹھا کر دریائے اٹک کے پار پھینک دیا ہے۔

پاکستان کے سب سے بڑے صوبے مشرقی پاکستان میں مارچ 1954ء میں صوبائی انتخابات منعقد ہوئے۔ جگتو فرنٹ نے 310 میں سے 301 نشستیں جیت کر حکمران لیگ کا صفایا کر دیا لیکن صوبے کے عوام کو اس کی سزا دی گئی۔ دو ماہ کے اندر صوبے کے وزیراعلیٰ فضل الحق کو غدار قرار دے کر برطرف کر دیا گیا اور سکندر مرزا کو گورنر بنا کر صوبے پر مسلط کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے اس تلخ تجربے کے بعد تقریباً اب دہائی تک حکمران ٹولے کو عوامی رائے جاننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ستمبر 1954ء میں گورنر جنرل غلام محمد ایبٹ آباد میں تھے اور کراچی میں ان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے ایک ہی رات میں ایسا قانونی مسودہ تیار کیا جس کا مقصد گورنر جنرل کے اسمبلی توڑنے کے اختیارات ختم کرنا تھا۔ پروگرام کے مطابق دوسری صبح وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے اس قانونی مسودے کو اسمبلی سے پاس بھی کروالیا اور جب گورنر جنرل غلام محمد کو اس کی اطلاع ملی تو وہ پھر گئے اور صرف 33 دن بعد ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کرتے ہوئے قانون ساز اسمبلی برخاست کر دی گئی۔ محمد علی بوگرہ دوبارہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے واپس چلے گئے اور ان کی جگہ چوہدری محمد علی وزیراعظم بنے۔ ان کی اسمبلی نے 30 ستمبر 1955ء کو ون یونٹ کا فارمولا پاس کیا اور چوہدری محمد علی نے 8 جنوری 1956ء کو آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیا جو 29 فروری کو پاس کر لیا گیا۔ 2 مارچ 1956ء کو گورنر جنرل نے اس کی توثیق کر دی اور 23 مارچ 1956ء کو آئین نافذ العمل ہو گیا۔ اگست 1956ء میں سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے غلام محمد کو فارغ کر دیا اور 1956ء کے آئین کے بعد سکندر مرزا گورنر جنرل سے صدر بن گئے۔ 9 ستمبر کو چوہدری محمد علی مستعفی ہو گئے۔ ان کے بعد حسین شہید سہروردی، اسماعیل ابراہیم چندریگر اور فیروز خان نون یکے بعد دیگرے وزیراعظم بنے۔ اس کے بعد عوامی سطح پر عام انتخابات کا مطالبہ شدید ہو گیا اور حکومت نے مارچ 1958ء کو عام انتخابات کروانے کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر اسی مہینے مسلم لیگ کے صدر عبدالرب نشتر انتقال کر گئے تو خان عبدالقیوم، مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ انتخابی مہم شروع ہوئی تو مسلم لیگ، جماعت اسلامی اور نظام اسلام پارٹی نے صدر سکندر مرزا کو تنقید کا نشانہ بنایا اور حکومت نے ان کے خلاف سختی کی، جس کا نتیجہ عام انتخابات کو نومبر 1958ء تک ملتوی کرنے کی صورت میں نکلا۔ اس کے بعد 17 اکتوبر 1958ء کو میجر جنرل سکندر مرزا نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے 1956ء کا آئین منسوخ کر دیا، حکومتیں اور اسمبلیاں برطرف کر دیں اور افواج پاکستان کی کمان خود سنبھال لی اور کمانڈر انچیف جنرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ 24 اکتوبر 1958ء کو سکندر مرزا نے 12 رکنی کابینہ تشکیل دی جس میں جنرل ایوب خان کو وزیر اعظم، چیف مارشل لا ایڈمینسٹریٹر کے علاوہ وزیر دفاع اور امور کشمیر کی وزارتیں بھی دیں۔ اس کابینہ میں بھٹو صاحب پہلی بار وزیر تجارت بنے اور اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا لیکن 27 اکتوبر 1958ء کو ایوب خان نے سکندر مرزا سے استعفیٰ لے کر انہیں لندن بھیج دیا اور خود صدر بن گئے۔

صدر ایوب نے 1962ء کا صدارتی آئین نافذ کر کے پارلیمانی جمہوریت کی بجائے صدارتی نظام متعارف کروایا۔ جمہوریت کی بجائے بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت بلدیاتی سطح کے 40 ہزار حلقے مشرقی پاکستان میں اور 40 ہزار مغربی پاکستان میں بنائے گئے۔ یوں 80 ہزار بی ڈی ممبران نے صدر اور پارلیمنٹ کے ارکان کو منتخب کرنا تھا۔ اسی دوران جنوری 1965ء میں محدود رائے دہی کی بنیاد پر صدارتی انتخاب منعقد کیا گیا جس میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح امیدوار تھیں۔ تاہم تمام تر سیاسی دباؤ اور ریاستی مشینری کی مدد سے صدر ایوب نے اس معرکہ میں بہت کم مارجن سے کامیابی حاصل کی۔ حکومت پر دھاندلی کے الزامات عائد کیے گئے اور مشرقی پاکستان اور کراچی میں احتجاج بھی ہوا جو بے فائدہ ثابت ہوا۔ ان انتخابات میں ایوب خان کو 49,951 جب کہ ان کے مقابلے میں فاطمہ جناح کو 28,691 ووٹ ملے۔ ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ کے بعد 10 جنوری 1966ء کو تاشقند میں پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ ہوا اور واپسی پر وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کا مؤقف تھا کہ صدر ایوب خان نے میدانِ جنگ میں جیتی ہوئی جنگ مذاکرات میں ہار دی ہے۔ رفتہ رفتہ صدر ایوب خان کے خلاف تحریک شدت اختیار کر گئی اور 25 مارچ 1969ء کو صدر ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا، جنہوں نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔

دسمبر 1970ء میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پہلے انتخابات منعقد ہوئے جنہیں ملکی تاریخ میں پہلے غیر جانب دارانہ انتخاب بھی کہا جاتا ہے۔ 17 دسمبر 1970ء کے انتخاب میں عوامی لیگ نے قومی اسمبلی کی 151 اور پیپلز پارٹی نے 81 نشستیں حاصل کیں۔ انتخابات کے بعد اقتدار کی منتقلی کے ایشو پر عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور یحییٰ خان میں تصفیہ نہ ہو سکا جس میں عوامی لیگ کے چھے نکات مثلاً صدر کا پی سی او اور اسمبلی کی حلف برداری کے بعد 120 دن میں آئین بنانا جیسے مسائل شامل تھے۔ اس کے بعد 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ رونما ہوا اور 20 دسمبر 1971ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنا کر اقتدار ان کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے 1972ء کا عبوری آئین قومی اسمبلی سے منظور کروا کے ملک میں پارلیمانی نظام حکومت بحال کیا اور پھر 1973ء کا آئین متفقہ طور پر قومی اسمبلی سے منظور کروایا۔ ان کے دورِ حکومت میں بلوچستان کی منتخب حکومت غیر جمہوری انداز میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف کی گئی، جس کے ردِعمل پر صوبہ سرحد کی نیپ اور جے یو آئی کی مخلوط حکومت صوبے کی حکومت سے
ستعفی ہوگئی۔ بھٹو صاحب کو قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل تھی اور وہ ایسی اکثریت دوبارہ حاصل
رنا چاہتے تھے۔ انہوں نے 1978ء کی بجائے 1977ء ہی میں انتخابات کروانے کا فیصلہ کر لیا اور ان
کے مقابلے میں ملک کی نو سیاسی و مذہبی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے نیا اتحاد تشکیل دیا۔
س طرح 1977ء میں پہلی بار کسی سیاسی جماعت کے تحت عام انتخابات کا انعقاد ہوا اور ان انتخابات میں
ٹھو صاحب کی حمایت شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ ان انتخابات میں بھٹو صاحب نے بلا مقابلہ منتخب ہونے کا
حیلہ کیا اور اس کے بعد وزیر اعظم میں یہ اخلاقی جرأت نہیں رہی کہ وہ اپنے چاروں وزرائے اعلیٰ کو
مقابلہ منتخب ہونے سے روک سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انتخاب متنازع بنا اور انتخابی ساکھ کو بری طرح
نقصان پہنچا۔ 10 مارچ کو ہونے والے صوبائی انتخابات میں لوگوں کی اکثریت نے انتخاب کا بائیکاٹ
کیا۔ دوبارہ انتخابات کے لیے حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ ان
مذاکرات میں کافی حد تک اتفاقِ رائے بھی ہو گیا تھا لیکن 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاالحق نے اقتدار پر
قبضہ کرتے ہوئے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ جنرل ضیاالحق کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب اپنی مقبولیت کھو
چکے ہیں لیکن ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انہیں 17 ستمبر 1977ء کو نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل میں
گرفتار کر لیا گیا اور انتخابات ملتوی کر دیے گئے۔ 4 اپریل 1979ء کو بھٹو صاحب کو عدالتی فیصلے کے تحت
پھانسی دے دی گئی۔

اس کے بعد 1979ء میں افغانستان میں روسی فوج کی مداخلت سے جنرل ضیاالحق کی اہمیت
امریکہ اور یورپی ممالک میں بڑھ گئی۔ اس کے بعد 25 ستمبر 1979ء کو پندرہ برس کے بعد انہوں نے
بلدیاتی انتخابات کروائے اور ان کے اسی دور میں بحالی جمہوریت کے تناظر میں ایم آر ڈی بھی بنی، جو
بعد میں ملک کے اندر جنرل ضیاالحق کی آمریت اور جمہوریت کی بحالی کے لیے کوشاں رہی۔ جنرل ضیا
الحق نے 1982ء میں مجلس شوریٰ تشکیل دی اور دسمبر 1984ء میں انہوں نے اسلامی نظام کے نفاذ کو بنیاد
بنا کر ملک میں ریفرنڈم کروایا اور اس کامیابی کو اپنی کامیابی قرار دیا۔ وہ انتخابی عمل اور سیاسی نظام کے قطعاً
حامی نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ 90 دن کے وعدے پر پورے نہ اتر سکے اور آخر 1985ء میں انہوں نے
غیر جماعتی انتخابات کروائے بھی تو مجبوراً اور وہ بھی غیر جماعتی انتخابات۔ انہوں نے کئی لوگوں اور سیاسی
جماعتوں بالخصوص پیپلز پارٹی کے خلاف بلاوجہ انتقامی کارروائیاں کیں، مخالفین کو جیلوں میں بند رکھ کر
تشدد کیا گیا اور ان پر کوڑے تک برسائے گئے۔ 29 مئی 1988ء کو جنرل ضیاالحق نے جونیجو کی حکومت
اور اسمبلی کو برطرف کر دیا۔

اس کے بعد اگست 1988ء میں جنرل ضیاالحق ایک طیارے کے حادثے کا شکار ہو گئے جس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد آئی ایس آئی کی سیاسی معاملات میں بہت زیادہ مداخلت دیکھنے کو ملی۔ اس وقت آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل نے پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں پر مشتمل اسلامی جمہوری اتحاد کی تشکیل کی اور اس اتحاد کو آئی ایس آئی کی مکمل سرپرستی حاصل رہی۔ جنرل حمید گل اس کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام قومی مفاد کو سامنے رکھ کر کیا تھا۔ آئی ایس آئی کی جانب سے اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدواروں کے لیے ریاستی فنڈ بھی دیئے گئے۔ آئی ایس آئی کی مداخلت کے باوجود پیپلز پارٹی نے 1988ء کے انتخابات میں 93 نشستیں حاصل کیں۔ بہت سی پس پردہ مفاہمت کے بعد پیپلز پارٹی کو محدود اقتدار سونپا گیا اور بے نظیر بھٹو پہلی بار بحیثیت ایک خاتون ملک کی وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ ان کی حکومت بننے کے چند دن بعد گورنر بلوچستان نے صوبے کی اسمبلی توڑ دی اور 20 دسمبر 1988ء کو عدلیہ نے بلوچستان اسمبلی بحال کر دی اور نواب اکبر بگٹی وزیراعلیٰ بنے۔ ادھر پنجاب میں بے نظیر کے مخالف دھڑے یعنی مسلم لیگ کی حکومت بنی جس سے مرکز اور صوبے کے درمیان محاذ آرائی عروج کو پہنچ گئی۔ بالآخر اس اسمبلی کو 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے برطرف کر دیا اور ملک میں نئے انتخابات کروانے کا اعلان کیا گیا۔

اکتوبر 1990ء میں ہونے والے عام انتخابات وہی تھے جن کے بارے میں آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اسد درانی نے دائیں بازو کی جماعتوں میں مہران بینک سکینڈل کی صورت میں 14 کروڑ روپے تقسیم کرنے کا اعتراف کیا تھا۔ یہ اعتراف سامنے آنے پر تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خان نے سپریم کورٹ میں ایک آئینی درخواست دائر کی لیکن کئی برس گزرنے کے باوجود کوئی فیصلہ سامنے نہ آ سکا، یہ مقدمہ تا حال زیر التوا ہے۔ ان انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ اور اس کی اتحادی جماعتوں کی حکومت بنی لیکن زیادہ عرصہ نہ چل سکی کیوں کہ اس دوران نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے اختلافات سامنے آ گئے، جس کے نتیجے میں دونوں اقتدار سے رخصت ہو گئے اور ملک میں ایک بار پھر نئے انتخابات کروانے کا اعلان کیا گیا۔ اسی طرح 1993ء اور 1997ء کے انتخابات کے نتیجے میں بالترتیب محترمہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف دوسری دوسری بار وزیراعظم بنے لیکن اپنی حکومتیں نہ بچا سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1996ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے میں انہی کی پارٹی کے صدر فاروق لغاری نے اہم کردار ادا کیا۔ اکتوبر 1999ء میں نواز شریف کی دوسری حکومت برطرف کرنے کے بعد جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد نواز شریف کو ایک معاہدے کے تحت جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا اور بے نظیر بھی اپنے خلاف مقدمات کے باعث ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔

اگرچہ 1985ء سے لے کر 1997ء تک بننے والی تمام حکومتوں کو کرپشن اور بدعنوانی کی بنیاد پر برطرف کیا گیا لیکن معاملہ محض کرپشن کا نہیں تھا۔ یقیناً ان حکومتوں نے کافی غلطیاں کی ہوں گی اور ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے دورِ حکومت کی طرزِ حکمرانی بھی اچھی نہیں رہی ہوگی، لیکن فوجی حکمرانوں کی جانب سے بار بار حکومتوں کی تبدیلی کا معاملہ خالصتاً سیاسی تھا اور ملک کی غیر سیاسی قوتیں سول قیادت کے مقابلے میں اپنی بالادستی کی خواہش مند تھیں۔ جہاں سول لوگوں نے ان کی بالادستی کو چیلنج کیا وہاں انہیں اپنی حکومت کی برطرفی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس منظرنامہ نے اس تاثر کو مضبوط کیا کہ انتخابات کا عمل اور اس کے تحت حکومتوں کے چلنے کا عمل زیادہ تر عوامی رائے کے مقابلے میں مقتدر قوتوں کے ہاتھوں میں ہے جو اپنی مرضی کا نظام چلانا چاہتی ہیں۔ جنرل مشرف نے جب اقتدار پر قبضہ کیا تو انہوں نے 01-2000ء میں مقامی حکومتوں کے انتخابات کروائے اور بعد میں انہوں نے ریفرنڈم بھی کروایا۔ اس مقامی نظام حکومت سے جنرل مشرف نے اپنی مرضی کے نتائج حاصل کیے اور اپنی مرضی سے لوگوں کو ضلعی حکومتوں میں نوازا گیا۔ اس کے بعد 2002ء میں عام انتخابات کے نتیجے میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کو دیوار سے لگا دیا گیا اور مسلم لیگ (ق) کی تشکیل کی گئی اور انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی میں سے پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کو جنم دیا گیا۔ اس طرح 2002ء میں جو حکومت بنائی گئی، اس کا سارا نظام غیر منصفانہ اور غیر شفاف تھا۔

اس لیے اگر ہم پاکستان کی سیاسی تاریخ اور بالخصوص انتخابی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو کچھ ہماری درپردہ طاقتوں اور فوجی قیادت نے انتخابات اور جمہوری عمل کے ساتھ کیا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آج بھی بحرانوں کا شکار ہیں اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ہمارے یہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط نہیں ہوسکی ہیں۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو جو خود بھی انہی قوتوں کی مدد سے سیاست کرتے رہے اور انہوں نے ہر اس انتخاب کو جعلی، غیر منصفانہ اور اپنے خلاف سازش قرار دیا جس کے نتائج ان کے خلاف تھے۔ اسی طرزِ عمل کے باعث ایک دوسرے کی حکومتوں کو پہلے ہی دن سے قبول نہ کرنا اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی اور حکومتوں کو گرانے کا عمل ہماری سیاسی تاریخ کا سیاہ باب ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ پاکستان میں ہونے والے اکثر و بیشتر انتخابات محض ملک کے اندر ہی متنازع نہیں رہے بلکہ باہر کی دنیا میں بھی ہمارے انتخابات پر انگلیاں اٹھائی جاتی رہی ہیں۔ بین الاقوامی رپورٹوں میں بھی انتخابی دھاندلیوں کی ایک لمبی کہانی ہے اور اس کے تانے بانے مقتدر قوتوں اور سرکاری ایجنسیوں تک جاتے ہیں۔ یہ سب انتخابات کو منصفانہ بنانے میں رکاوٹ بنے رہے جس کا نتیجہ آج سیاسی بحران کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقامی طرزِ حکومت اور ہمارا جمہوری رویہ

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ اس ملک میں مقامی سطح پر کسی بھی طرح کی بہتر اور مضبوط گورننس کے نظام کا نہ ہونا ہے۔ اگرچہ ہماری سیاسی جماعتیں جمہوریت اور جمہوری اداروں کی بالادستی کی بہت زیادہ بات کرتی ہیں لیکن مقامی سطح پر جمہوریت اور اس سے وابستہ اداروں کی مضبوطی کے لیے ان کا رویہ ہمیشہ سے غیر جمہوری رہا ہے۔ پاکستان میں بنیادی اور نچلی سطح پر اوّل تو ادارے کبھی بھی فعال نہیں رہے اور اگر ان اداروں کو فعال کیا بھی گیا تو وہ بدقسمتی سے سول حکومت کے مقابلے میں فوجی ادوار تھے۔ ایوب خان کا بنیادی جمہوریت کا نظام، جنرل ضیاالحق کا بلدیاتی اداروں کا نظام اور جنرل پرویز مشرف کا پہلی بار ملک میں مقامی اداروں کے مقابلے میں مقامی حکومتوں کا نظام غیر سیاسی حکومتوں کے نظام تھے۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ فوجی جرنیلوں کو ملک میں جمہوریت کے نظام سے کوئی بہت زیادہ دلچسپی تھی کیوں کہ وہ تو پہلے ہی جمہوریت پر شب خون مار کر اقتدار پر قابض ہوئے تھے۔ دراصل فوجی حکومتوں اور فوجی جرنیلوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے موجود جمہوریت کے اداروں کو ختم کر کے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جمہوری اور سیاسی نظام ناکام ہو گیا ہے۔ اس لیے جب وہ اقتدار میں آتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے اقتدار کو تقویت دینے کے لیے ایک بھرپور سیاسی حمایت درکار ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتوں میں بہت سی جماعتیں فوجی مداخلتوں کی مخالفت کرتی ہیں اس لیے انہیں عام لوگوں میں یہ سیاسی حمایت درکار ہوتی ہے۔ اس سیاسی حمایت کے لیے فوجی حکومتیں مقامی انتخابات کا راستہ اختیار کرتی ہیں تاکہ وہ اس نئی سیاسی کھیپ کی مدد سے اپنے اقتدار کو تقویت دے سکیں۔

ایوب خان، جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف نے اسی سوچ کی مدد سے یہ مقامی نظام متعارف کروائے اور ان اداروں کو بالخصوص اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ ایوب خان نے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنے دور میں بنائے گئے بنیادی جمہوریت کے اداروں کو صدارتی انتخاب میں استعمال کیا۔ ایوب خان، محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی امیدوار تھے اور ان مقامی سطح پر منتخب 80 ہزار نمائندوں نے ملک کے صدر کا انتخاب بھی کرنا تھا۔ ایوب خان پر الزام لگا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں نے اپنے صدارتی انتخاب میں ان مقامی اداروں کو اپنے مفاد میں استعمال کر کے انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ممتاز تاریخ دان پرفیسر ڈاکٹر طاہر کامران اپنی کتاب''پاکستان میں جمہوریت ر گورننس'' کے صفحہ 56-55 میں بنیادی جمہوریت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مراعات کی تقسیم کے میکانیزم کے ذریعے اور نئے مراعات یافتہ طبقہ کو تخلیق کرنے کے لیے ریاست حکومت کو جواز فراہم کرنا چاہتی تھی جب کہ ایسا کرنے سے سماجی، اقتصادی اور معاشرتی تناؤ میں اضافہ ہوگیا۔ایک اور ممتاز مؤرخ عائشہ جلال سول افسران کو بنیادی جمہوریتوں کے نظام کا محور قرار دیتی ہیں۔ان کے نزدیک یہ ہی افسران امیدواروں کو نامزد کرنے کی بنیادی ذمہ داری نبھاتے تھے۔اس طرح سے لوگوں کے نمائندوں کی سلیکشن سے دیہی مراعات یافتہ طبقہ کو مزید طاقت میسر آئی۔''

عائشہ جلال اپنی کتاب''The State of Martial Rule'' کے صفحہ 304-303 پر لکھتی ہیں:

''ایوب خان کے نئے متعارف شدہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں ڈسٹرکٹ اور ڈویژنل کونسلر کے تقریباً آدھے ممبران کو بیوروکریسی اور خاص طور پر سی ایس پی افسران نامزد کرتے تھے۔اس طرح کے نظام جس میں نامزدگی رہنما اصول تھی، سے دیہی سیاست دانوں کی اہمیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اس نظام میں صنعتی مزدور اور دانشور طبقے کا کردار ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔اگرچہ یہی طبقات شہری معاشروں میں سب سے زیادہ متحرک اور بیدار طبقے تھے۔بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی معاشرے کے شہری طبقے نے مخالفت کی تھی۔لیکن اس کے باوجود اسے 1962ء کے آئین کا حصہ بنادیا گیا اور 6 فروری 1960ء کو ان ممبران سے یہ سادہ سا سوال پوچھا گیا:''کیا تمہیں صدر ایوب خان پر اعتماد ہے؟''اور اسی طرح سے ایوب خان کی بطور صدر پاکستان کی پوزیشن کو جواز میسر آ گیا اور ریفرنڈم میں انہیں 95.06 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔''

ایوب خان کے بنیادی جمہوریت کے اس نظام پر معروف مصنف آئین ٹالبوٹ نے اپنی کتاب''تاریخ پاکستان 1997-1947ء''میں صفحہ 245-244 میں لکھا ہے:

''مارشل لاء کی وجہ سے گھٹن کے ماحول کے باوجود بنیادی جمہوریتوں کے نظام پہ سرکاری گرفت کے خلاف تنقید منظر عام پر آئی۔چنانچہ بی ڈی سسٹم کو طنزیہ انداز میں ''بے کس'' جمہوریتوں کا نظام بھی کہا گیا۔حکومت کے لیے عوامی سطح پر حمایت کی لہریں پیدا کرنے کی بجائے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان روز بہ روز تضحیک کا سامان بنتے گئے اور 1969ء میں احتجاجی مظاہروں کے دوران وہ جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ایوب خان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> کے بنیادی جمہوریت کی سکیم کو مقبول بنانے کے لیے اپنی طاقت کو ہر طرح استعمال کیا۔انہوں نے پاک جمہوریت سپیشل کے نام سے ایک ٹرین مارچ کا بھی اہتمام کیا اور اس کے ذریعے مختلف سٹیشنوں پر عوام کے اجتماعات سے بھی خطاب کیا تاکہ لوگوں کو اپنی تجاویز اور منصوبوں سے آگاہ کر سکیں۔جنوری 1960ء میں اس خصوصی ٹرین کے ذریعے انہوں نے مغربی پاکستان کا ایک ہفتے کا دورہ کیا جس کے بعد ایسا ہی سفر مشرقی پاکستان میں کیا گیا۔لیکن اس طرح کے انوکھے اقدامات کے باوجود یہ بات ناممکن ثابت ہوئی کہ مشرقی پاکستان کے سیاسی طور پر حساس اور مغربی پاکستان سے اجنبی ہوتے ہوئے عوام سے اس جمہوری سکیم کی خامیاں چھپائی جا سکیں۔"

جنرل ضیاالحق نے بھی جب 1979ء میں مقامی اداروں کا نظام متعارف کروایا تو انہوں نے بعد میں اپنے صدارتی ریفرنڈم میں ان اداروں کو بالخصوص استعمال کیا۔اسی طرح جنرل ضیاالحق نے 1977ء میں اپنے اقتدار کے حصول کے بعد پہلی بار 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کروائے تو اس عرصے میں جب مرکز اور صوبائی سطح پر سیاسی حکومتیں نہیں تھیں، ان ہی مقامی اداروں کی مدد سے ملک کا نظم ونسق چلانے کی کوشش کی گئی۔البتہ جنرل ایوب خان اور جنرل ضیاالحق کے مقابلے میں جنرل پرویز مشرف نے پہلی بار مقامی اداروں کی جگہ مقامی حکومتوں کا نیا نظام متعارف کروایا۔اس نظام سے مراد یہ تھی کہ اس میں مقامی حکومتوں کو سیاسی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات ہوں گے جب کہ اس کے برعکس ماضی میں مقامی ادارے مکمل طور پر صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہوتے تھے۔اسی نظام میں پہلی بار ملک میں کسانوں، مزدوروں، اقلیتوں اور بالخصوص خواتین کو بہت زیادہ سیاسی نمائندگی کا حق ملا۔خواتین کو مقامی سطح کے ان اداروں میں 33 فیصد نمائندگی کے مطالبے کو پذیرائی ملی اور اسے قبول کیا گیا۔اسی نظام میں نشستوں کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر مقامی سطح پر عام لوگوں کو بہت زیادہ موقع ملا کہ وہ بھی مقامی اداروں میں بطور ممبر منتخب ہو سکیں۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جرنیلوں کے یہ نظام ان کے اقتدار میں رہنے تک ہی محدود رہے اور جیسے ہی ان کے اقتدار کا خاتمہ ہوا ان کے اپنے متعارف کروائے گئے نظام بھی ان ہی کے ساتھ رخصت کر دیے گئے۔

اس کے برعکس فوجی حکمرانوں کے مقابلے میں سیاسی حکومتوں نے ان اداروں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور کئی کئی برسوں تک اس نظام کو لپیٹ کر مقامی سطح پر غیر سیاسی نظام یا بیوروکریسی کی مدد سے نظاموں کو چلایا گیا۔ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں یعنی پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے ان اداروں کا اسی طرح سیاسی استحصال کیا جیسے فوجی حکمرانوں نے کیا تھا۔پیپلز پارٹی نے تو کبھی بھی اپنے دور اقتدار میں مقامی اداروں کے انتخابات ہی نہیں کروائے جب کہ اس کے برعکس مسلم لیگ (ن) نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روائے اور کبھی سیاسی مفاہمت کے تحت ان انتخابات کے انعقاد سے گریز کیا۔ مسلم لیگ (ن) نے
تخابات 2008ء کے بعد جب پنجاب میں اپنی حکومت بنائی جہاں اس کی اتحادی جماعت پاکستان
پیپلز پارٹی تھی، دونوں نے مل کر سب سے پہلے ان ہی مقامی اداروں پر شب خون مارا اور اداروں کو ختم
ر کے یہاں بیوروکریسی کی مدد سے انتظامی ایڈمنسٹریٹر تعینات کیے۔ اب تک اس حکومت کو اقتدار میں
ئے ہوئے ڈھائی برس ہو گئے ہیں لیکن مسلسل ان انتخابات سے گریز کیا جا رہا ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی
، ایم کیو ایم کی مخلوط حکومت، صوبہ خیبر پختونخوا میں اے این پی اور پیپلز پارٹی کی حکومت اور بلوچستان
یں پیپلز پارٹی اور جے یو آئی کی حکومت سب ہی ان مقامی حکومتوں کے انتخابات کروانے کے عمل سے
ریز کر رہے ہیں اور ان اداروں کا برے طریقے سے سیاسی استحصال کیا جا رہا ہے۔ حالاں کہ دونوں بڑی
ماعتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے میثاق جمہوریت کے معاہدے میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ آئندہ
قتدار میں آ کر بیوروکریسی اور انتظامی اداروں کی مدد کی بجائے سیاسی اداروں کو مستحکم کریں گے۔ اسی
رح ان کا یہ بھی عہد تھا کہ سیاسی عمل کو تسلسل کے ساتھ چلایا جائے گا لیکن اقتدار میں آنے کے بعد ان
دونوں بڑی جماعتوں نے وہی کچھ کیا جو وہ ماضی کی سیاست میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں بنیادی جمہوریت کے یہ ادارے کیوں کامیاب
یں ہو سکے۔ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ یہ جمہوریت کے اداروں کے لیے بہترین سیاسی نرسریاں ہیں تو
دوسری طرف ہماری ترجیحات میں یہ ادارے کہیں بھی شامل نہیں۔ حالاں کہ اب دنیا بھر میں اختیارات کی
یلی سطح پر منتقلی کی باتیں کی جا رہی ہیں اور بہت سے ملکوں میں ان بنیادی اداروں کو خصوصی اہمیت دی
جا رہی ہے جب کہ اس کے برعکس ہم دنیا کے تجربات سے سیکھنے کی بجائے ماضی کے ناکام تجربے کرنے پر
ضد ہیں۔ ہماری سیاسی قیادت جس میں مسلم لیگ (ن) پیش پیش ہے، جنرل مشرف کے آخری مقامی
حکومتوں کے نظام کو اس لیے مسترد کرتی ہے کہ یہ جرنیل کا نظام ہے اور ہم چوں کہ جمہوری لوگ ہیں تو اس
کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ (ن) جس نظام کو
نے میں بضد ہے وہ لوکل باڈیز آرڈیننس 1979ء ہے۔ یہ نظام جنرل ضیا الحق کا پیدا کردہ تھا یعنی ایک
رنیل ان کو برا لگتا ہے تو دوسرے جرنیل کے نظام کو لانے میں انہیں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔ یعنی جس
رنیل کی شکل اچھی لگے وہ ٹھیک اور جس کی بری لگے یا جو آپ کو سیاسی مفاد نہ دے وہ برا ہوگا۔ بدقسمتی یہ
ہے کہ ہمارے ہاں جو سیاسی نظام مضبوط ہوا وہ مرکزیت پر مبنی تھا اور ہم اختیارات کے ارتکاز پر یقین نہیں
رکھتے۔ یہ سوچ صرف ہمارے ریاستی اداروں اور پس پردہ قوتوں ہی میں نہیں بلکہ یہاں پر موجود سیاسی
نماؤں اور سیاسی جماعتوں کے اندر واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ تمام لوگ اختیارات کے ارتکاز کی
تیں تو بہت کرتے ہیں لیکن عملاً اس میں ان کا یقین کافی کمزور ہے۔ نہ صرف حکمران جماعتیں ہی نہیں بلکہ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتیں بھی جو یہاں حکمرانی کی حق دار نہیں ٹھہریں، وہ بھی اپنی اپنی جماعتوں کی سطح پر فرد واحد کی حکمرانی کو مضبوط کیے ہوئے ہیں۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے اس ملک میں بہتر طرزِ حکمرانی کا بحران ایک سنگین نوعیت اختیار کر چکا ہے اور مقامی نظام حکومت نام کی کوئی بھی ڈھانچا یہاں نظر نہیں آتا۔ دراصل ہمارا حکمران طبقہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم سیاسی، انتظامی اور مالی اختیارات نچلی سطح پر منتقل کریں گے تو اس سے نہ صرف اس سطح پر موجود سیاسی طبقہ زیادہ تر طاقت حاصل کرے گا بلکہ مقامی لوگ بھی زیادہ طاقت ور ہوں گے۔ یہ سوچ حکمران طبقات کو ڈراتی ہے کہ مقامی لوگوں کی مضبوطی ان کے موجودہ سیاسی طاقت کو کمزور کرنے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

دنیا بھر میں مقامی سطح کے مسائل کے حل میں مقامی نظام حکومت اپنا کردار ادا کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس صوبائی اور قومی سطح پر سیاسی ادارے یعنی پارلیمنٹ قانون سازی اور اس کو oversee کرنے کا کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں 1985 سے لے کر اب تک مقامی ترقی اور روزمرہ کے مسائل کے حل میں قومی اور صوبائی حکومتیں اور ان کے منتخب نمائندے جن کا اصل کام قانون سازی کرنا تھا، وہ کرتے ہیں۔ ہمارے مرکزی اور صوبائی عوام کے منتخب نمائندوں کی اصل توجہ قانون سازی پر نہیں بلکہ ترقیاتی کاموں اور اس کے تناظر میں مختص ترقیاتی بجٹ پر ہوتا ہے۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان اسمبلی اپنی انتخابی مہم میں لوگوں سے جو وعدے کرتے ہیں یا جن کی بنیاد پر ووٹ لیتے ہیں وہ بھی قومی اور صوبائی سطح کے مسائل نہیں بلکہ مقامی مسائل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سیاست قومی اور صوبائی تناظر میں کافی کمزور ہے اور سب کی توجہ مقامی سیاست پر ہے جس سے وہ یہاں اپنی سیاسی طاقت کو ترقیاتی کاموں کی مدد سے مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یونین کونسلر سے لے کر صدرِ پاکستان تک سب ہی ترقیاتی کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اگر ان سب اداروں نے یعنی مقامی، صوبائی اور مرکزی نے ایک ہی کام ترقیاتی امور سرانجام دینے ہیں تو اس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔ سیاسی اداروں کے درمیان اس طرزِ عمل سے ٹکراؤ کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے کوئی بھی سیاسی نظام چاہے وہ مقامی ہو یا قومی سطح کا ہو پنپ نہیں سکے گا۔ بدقسمتی یہ ساری خرابی پیدا کرنے میں مرحوم جنرل ضیاالحق ذمہ دار تھے جنھوں نے پہلی بار اس ملک میں 1985 میں ہونے والے غیر جماعتی انتخابات کی مدد سے بننے والی غیر سیاسی اسمبلی میں ترقیاتی فنڈز کا اجرا کیا اور ہر رکن اسمبلی کو کروڑوں روپے فنڈ دیئے جسے سیاسی رشوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جنرل ضیاالحق کا خیال تھا کہ وہ اس طرزِ عمل سے ارکان اسمبلی کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنے سیاسی اقتدار کو اور زیادہ مضبوط کر سکیں گے۔ اگرچہ جرنیلوں نے مقامی انتخابات اور ادارے ضرور تشکیل دیئے لیکن بعد میں ان کی توجہ بھی ان مقامی اداروں سے ہٹ کر قومی اور صوبائی سطح پر بننے والی اسمبلیوں اور حکومتوں تک محدود ہو گئی جس سے یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادارے سیاسی استحصال کا شکار ہوئے۔

اس طرزِ عمل سے ہم نے دیکھا کہ جب ملک میں جنرل پرویز مشرف نے مقامی حکومتوں کا نظام متعارف کروایا تو یہ عام انتخابات 2002 تک بہت اچھا چلا لیکن جب عام انتخابات ہوئے اور قومی و صوبائی سطح پر اسمبلیاں بن گئیں تو صوبائی اور مقامی حکومتوں کے درمیان سرد جنگ شروع ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں طرز کے ادارے ترقیاتی امور تک ہی اپنی توجہ محدود کرنا چاہتے ہیں اور اسی بحران کی وجہ سے مقامی حکومتوں کا نظام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا۔ انتخابات 2008 کے بعد جب مرکزی اور صوبائی حکومتیں بنیں تو سب سے پہلے انہوں نے ان ہی اداروں کو ختم کیا۔ چاروں صوبوں میں موجود صوبائی حکومتیں اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں مقامی حکومتوں کا نظام نہیں بلکہ مقامی کونسلوں یعنی 1979 کے آرڈیننس کے تحت نظام درکار ہے۔ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس ملک میں قومی اور صوبائی حکومتوں کے مقابلے میں تیسری حکومت یعنی مقامی حکومت بھی ہونی چاہیے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم دنیا کے تجربات سے سیکھنے کے لیے تیار نہیں، حالاں کہ اگر یہاں مقامی حکومتیں مضبوط ہوں گی تو اس کا براہِ راست اثر مقامی نظام حکومت، بہتر طرزِ حکمرانی کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو بھی مضبوط کرے گا کیوں کہ ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عام افراد بالخصوص جو کمزور طبقات ہیں، ان کی یہ آسانی رسائی قومی اور صوبائی ارکان کے مقابلے میں ان مقامی حکومتوں اور مقامی منتخب نمائندوں تک ہو سکتی ہے۔ دوسرا مقامی ترقی کے بارے میں جتنی زیادہ معلومات اور معاملات کی شفافیت اور احتساب کے نظام کے ساتھ حکمرانی کا موثر نظام یہ مقامی نظام حکومت چلا سکتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس نظام کو مضبوط کر کے ہم ترقی کا موثر نظام بھی چلا سکتے ہیں اور دوئم اپنی قومی اور صوبائی سیاست جس میں اب کافی بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اس کو بھی ایک بہتر سمت میں دوبارہ واپس لا سکتے ہیں۔ مقامی حکومتوں کا یہ نظام ملک میں مقامی سطح سے ایک نئی قیادت اور اس کے لیے بہتر نرسری کا کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ جس معاشرے میں مقامی نظام حکومت مضبوط ہوگا وہاں کی قومی سیاست بھی ایک مضبوط شکل میں اپنا کردار ادا کر رہی ہوگی یعنی یوں کہ جب ہم مضبوط نظام حکومت کہتے ہیں تو اس سے مراد قومی اور صوبائی سطح پر موجود یہ حکومتیں اپنے کردار اور طریقہ کار کے ساتھ ساتھ اپنے کام کے دائرہ کار میں بھی واضح ہوں گی۔ سب کو معلوم ہوگا کہ کس کی اصل ذمہ داری کیا ہے اور بالخصوص اس نظام کو مضبوط کرنے سے آپ کو قومی اور صوبائی سطح پر ایسے منتخب ارکان ملیں گے جو واقعی قانون سازی میں دلچسپی رکھتے ہوں گے اور آپ کی پارلیمنٹ کی تصویر بھی مختلف نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر اگر ہم طے کر لیں کہ مقامی مسائل صرف اور صرف مقامی اداروں کے ذریعے ہی ہوں گے اور ترقیاتی کام اور اس کا بجٹ بھی صرف ان ہی اداروں کے ماتحت ہوگا تو عملاً ایسے لوگ جو مقامی ترقی اور ترقیاتی بجٹ میں دلچسپی رکھتے ہوں گے قومی اور صوبائی سیاست چھوڑ کر مقامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست میں حصہ لیں گے۔ ممتاز دانشور محمود مرزا نے اپنی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے'' میں اپنے مضمون ''ہمارے کلچر کے سیاسی پرتو'' کے صفحہ 83-82 پر لکھا ہے:

''عام اصول کے مطابق جمہوری نظام کی جڑیں لوکل سیلف گورنمنٹ میں ہوتی ہیں مگر ہمارے ملک کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بڑے زمینداروں اور قبائلی سرداروں کا سیاسی اور سماجی کنٹرول ہے اور یہ اندیشہ بالکل بجا ہے کہ ان علاقوں میں ضلع کی منتخب حکومت وڈیروں اور سرداروں کے مزید کنٹرول میں چلی جائے گی۔ تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کے بعد میری رائے یہی ہے کہ لوکل سیلف گورنمنٹ کی سکیم پر عملدرآمد ابتدائی مشکلات سے گزرنے کے بعد بالآخر قوم کے مفید ثابت ہوگی۔ یہ فریضہ عوامی سیاسی پارٹیوں پر چھوڑ دیا جائے کہ عوام کو وڈیروں اور سرداروں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے موثر تحریک پیدا کریں۔ شاید ایسی تحریک کے امکانات نمایاں ہی تب ہوں گے جب وڈیروں اور سرداروں پر مشتمل مقامی حکومت سے عوام کو براہ راست واسطہ پڑے گا۔''

محمود مرزا نے بجا کہا ہے کہ اگر اس ڈر سے کہ کہیں وڈیرے بالادست نہ ہو جائیں، خاموشی اختیار کریں تو مسائل حل ہونے کی بجائے اور زیادہ گمبھیر ہو جائیں گے اور ہمیں جو بھی تجربہ کرنا ہے مشکل ہی سے شروع ہوگا اور اچھے کی طرف جا سکے گا۔

اگرچہ 01-2000ء میں جب اس ملک میں مقامی نظام حکومت یعنی مقامی حکومتوں کا نظام متعارف کروایا گیا تھا اور اس وقت کے ادارہ قومی تعمیر نو کے سربراہ جنرل تنویر نقوی نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ اب قومی اور صوبائی اسمبلیاں صرف قانون سازی کریں گی اور مقامی مسائل مقامی اداروں کے ذریعے حل ہوں گے۔ اس پر کافی شور مچا اور بقول مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین کے بقول لوگ ہمیں قانون سازی کے لیے نہیں بلکہ مقامی مسائل کے حل کے لیے ووٹ دیتے ہیں۔ لیکن ادارہ قومی تعمیر نو اپنے موقف پر بضد رہا۔ لیکن جب 2002ء کے انتخابات ہوئے اور اس کے نتیجے میں حکومت سازی کا وقت آیا تو مسلم لیگ (ق) کو حکومت بنانے کے لیے کچھ ارکان کی ضرورت تھی تو اس وقت کے وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی نے ایک بار پھر تمام ارکان قومی اور صوبائی اسمبلی کو بالترتیب ایک کروڑ پچاس لاکھ سالانہ ترقیاتی فنڈ کی گرانٹ کی منظوری دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھیل پھر وہی جاری رہا جو پہلے سے جاری تھا۔ سیاسی حکومتوں کے آمرانہ طرز عمل کا ایک مظاہرہ ہم نے پہلے مسلم لیگ (ق) کی 002ء میں بننے والی حکومت میں دیکھا جب صوبائی حکومتوں نے 2005ء میں ان مقامی انتخابات سے قبل متنازعہ آرڈیننس 01-2000ء میں جو ترامیم کیں وہ مکمل غیر جمہوری تھیں۔ مثال کے طور پر ایک ترمیم کے تحت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صوبائی حکومت کو یہ حق دیا گیا کہ جب وہ چاہیں کہ کوئی مقامی حکومت یا اس ادارہ تحصیل، ٹاؤن یا یونین کونسل بہتر انداز یا شفافیت پر کام نہیں کر رہی تو وہ اسے نااہلی اور کرپشن کی بنیاد پر برطرف کر سکتی ہیں۔ اسی طرح صوبائی حکومت کسی بھی مقامی کونسل کی منظور کردہ قرارداد کو مسترد کرنے کا بھی اختیار رکھ سکتی ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی ترامیم تھیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ ہم جمہوری انداز میں کہاں کھڑے ہیں اور مسلم لیگ (ق) نے اپنی ترمیم کے ذریعے ان مقامی اداروں میں 58 ٹو بی جیسی ترمیم یعنی ان مقامی حکومتوں کو برطرف کرنے کا اختیار لے کر سب سے بڑی غیر جمہوری حرکت کی۔ کچھ یہی انداز 2008 میں بننے والی صوبائی حکومتیں بھی کر رہی ہیں کہ اس ترمیم میں اسی تمام ترامیم جو ان اداروں کی خودمختاری اور آزادی کے مرے میں آتی ہیں کو ختم کر کے عملاً ان کو اپنے کنٹرول میں رکھا جائے۔

اس لیے پاکستان میں جو جمہوری تجربہ ناکام ہو رہا ہے اس میں جہاں غیر جمہوری قوتیں یعنی ج جیسے ادارے ذمہ دار ہیں، وہیں ہماری سیاسی جماعتیں اور ان کی جمہوریت پسند قیادتوں کے یہ جمہوری اور آمرانہ رویہ بھی ذمہ داری کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ ہم مقامی نظام حکومت کو مضبوط بنائے بغیر یا ان اداروں کو قائم کیے بغیر اپنی طرز حکمرانی کو بہتر اور شفاف انداز میں چلا سکیں گے تو وہ عملاً غلطی پر ہیں۔ اس لیے پاکستان میں وہ لوگ جو جمہوریت کی مضبوطی کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور وہ تمام سیاسی کارکن اور اہل دانش جو اس ملک کو جمہوری اور شفافیت کے انداز میں چلانا چاہتے ہیں، انہیں اسی بات پر زور دینا ہوگا کہ ہماری ریاست اور حکومتیں ہر لحاظ سے مقامی کونسلوں کو نہیں بلکہ مقامی حکومتوں کے نظام کو مضبوط بنائیں۔ یقیناً یہ کام آسان نہیں اور نہ ہی ہماری ریاست اور ارباب اختیار محض آپ کی خواہش پر یہ سب کچھ کر دیں گے کیوں کہ عملاً وہ اس کے خواہش مند نہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی ریاست اور حکومتوں پر جمہوری انداز اختیار کرنے کے دباؤ ڈالیں اور بالخصوص اپنی اپنی سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادت کو جھنجھوڑیں کہ وہ اپنے ان اندرونی تضادات کو ختم کریں جو مقامی نظام حکومت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ طرز عمل اور دباؤ کی یہ پالیسی اور مزاحمت ہماری ریاست اور حکومت دونوں کو پابند کرے گا کہ وہ اپنی ماضی کی غلطیوں کو چھوڑ کر ایک بہتر سیاسی حکمت عملی اختیار کریں جو مقامی لوگوں کی ترقی میں معاون ثابت ہو۔ محض فوجی حکمرانوں پر تنقید کر کے اگر ہماری سیاسی قیادت اپنی سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کا موجودہ طریقہ کار یا طرز عمل کو جاری رکھتی ہے تو وہ خود بھی لوگوں اور سیاسی کارکنوں کے اندر غیر اہم ہو جائیں گے اور اس کا نقصان ایک طرف جہاں جمہوریت کو ہوگا، وہیں وہی غیر جمہوری قوتیں بالادست ہوں گی جو آج بھی بڑی شدت کے ساتھ ہم پر بالادست ہیں اور اس کی ذمہ داری سیاسی جماعتوں اور سیاسی اشرافیہ پر ہوگی جو تضادات پر مبنی سیاست اور طرز عمل کو فروغ دیتے رہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں طلبہ سیاست... سیاسی ذہن کی تشکیل کیوں ضروری ہے؟

پاکستان میں طالب علموں کے سیاست میں حصہ لینے اور طلبہ تنظیموں کے کردار کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے اور اس کے حامی و مخالفین بڑی شدت کے ساتھ اس کی افادیت اور نقصانات کے بارے میں دلائل دیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس ملک میں ایک طویل عرصے تک عملی طور پر طلبہ تنظیموں پر پابندی عائد رہی، پھر بھی یہ تنظیمیں کسی نہ کسی حوالے سے اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہی ہیں۔ اس تناظر میں 18 فروری 2008ء کے انتخابات کے نتیجے میں منتخب ہونے والی پیپلز پارٹی کی جمہوری حکومت نے طلبہ تنظیموں پر پابندی ختم کرنے کا اعلان کیا تو اس سے جہاں طلبہ تنظیموں اور ان کی حامی سیاسی جماعتوں نے خوشی کا اظہار کیا، وہاں بہت سے سیاسی و سماجی گروہوں اور اہلِ علم نے اس پابندی کے خاتمے پر اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا اور ان کے بقول اس پابندی کے خاتمے سے تعلیمی اداروں کا نہ صرف ماحول دوبارہ خراب ہو جائے گا بلکہ اس سے ان اداروں میں طلبہ گروہوں کے درمیان تصادم کا خطرہ بھی ایک بار پھر بڑھ جائے گا۔ طلبہ تنظیموں کے خلاف یہ نقطۂ نظر کوئی نیا نہیں، اس سے پہلے بھی لوگ طلبہ تنظیموں کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کا ایک بڑا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ان تنظیموں نے تعلیم کے نام پر تشدد، مار کٹائی، لڑائی جھگڑے اور اسلحہ کے عام استعمال کو فروغ دیا ہے۔ ان کے خیال میں تعلیمی اداروں میں تعلیم کی اصل بربادی کی ذمہ دار بھی یہ طلبہ تنظیمیں ہیں۔ اس خیال کے حامی لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ طلبہ و طالبات کو اپنی توجہ صرف تعلیم تک محدود رکھنی چاہیے اور انہیں سیاست، سیاسی مسائل اور اُن کے خلاف آواز اُٹھانے کے عمل سے مکمل طور پر دُور رہنا چاہیے۔

ممتاز صحافی اور سیاسی دانشور پروفیسر عزیز الدین اپنی کتاب ''پاکستان، طلبہ تحریک کے پس منظر میں'' صفحہ 48-47 پر لکھتے ہیں:

''ملک کی سیاسی تاریخ کے پہلے دور 1947ء تا 1958ء میں ایک خاص سوچ کے ساتھ طلبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو سیاست سے دُور رکھنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً آبادی کے بڑے حصے نے بالخصوص درمیانے طبقے نے سیاسی عمل میں دلچسپی لینا بند کر دی، مزدور اور کسان مسائل کی چکی میں پستے رہے مگر سوسائٹی کے بالائی حصے ملک میں جاری لوٹ مار میں ہمہ تن مشغول رہے۔ پنجاب میں سیاسی بے حسی کی فضا نے صوبے کے اندر ان قوتوں کو مضبوط کیا جو صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنا چاہتی تھیں۔ درمیانہ طبقہ سیاست کو جاگیرداروں کا کھیل قرار دے کر دست کش ہو گیا۔ طالب علموں کو یہ درس دیا گیا کہ تعلیم حاصل کر کے ملازمت حاصل کریں، عزت سے روٹی کمائیں اور سیاست کی طرف توجہ نہ دیں۔ ایک طرف ترقی کے مواقع اور دوسری جانب سیاست کے خلاف پروپیگنڈا۔ ان دونوں کا اثر یہ ہوا طلبہ ملکی صورتِ حال میں کم اور اپنی حالت سدھارنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔''

پروفیسر عزیز الدین نے جو کہا وہ بالکل ٹھیک ہے اور یہی وہ سوچ تھی روزِ اوّل سے طلبہ یاست کے بارے میں ریاست اور ایک مخصوص طبقے نے اختیار کی۔ اس سوچ نے ملک کا بھلا کیا اور نہ لبہ کا، کیوں کہ ان کی اپنی حالت بھی نہیں سدھر سکی جس کا انہیں یقین دلایا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جوانوں کی حالت بغیر کامیاب سیاست کے کیسے بہتر ہو سکتی ہے، اس پر ضرور غور ہونا چاہیے۔ دلچسپ ت یہ ہے اس خیال کے حامی عناصر جو طلبہ کو سیاسی عمل سے دُور رکھنا چاہتے ہیں وہ تعلیم کو محض ایک سماجی ر انفرادی مسئلہ سمجھتے ہیں حالاں کہ تعلیم کا دوسرا نام تبدیلی ہے اور تبدیلی خالصتاً ایک سیاسی عمل ہے اور طلبہ طالبات کو سیاسی عمل سے کسی بھی طور پر دُور نہیں رکھا جا سکتا۔ ہمارے جو تعلیمی مسائل ہیں، ان کا حل بھی چھی طرزِ حکمرانی اور بہتر سیاست کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اس کی ایک واضح مثال ملک میں تعلیمی بجٹ کی ر مناک حد تک کم شرح اور ملک کا تعلیمی نظام ہے، جو اپنے اندر لاتعداد خرابیاں رکھتا ہے اور جس میں بقاتی تعلیم اور تعلیم میں غیر منصفانہ تقسیم بھی ایک نمایاں پہلو ہے۔ اس لیے اگر طلبہ و طالبات سیاست میں صہ لیتے ہیں تو یہ ان کا جمہوری، سیاسی اور قانونی حق ہے اور انہیں اس حق سے محروم رکھنا از خود غیر جمہوری ر ردِعمل ہوگا۔ ایک طرف طلبہ تنظیموں کے مخالفین تحقیق کے لیے سوچ کی آزادی اور آزادانہ ماحول کی بات رتے ہیں، دوسری طرف وہ ان تنظیموں کی پابندی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ حالاں کہ پابندیاں مسائل ا حل نہیں ہوا کرتیں اور ہماری ماضی کی تاریخ نے اس پہلو کو سچ ثابت کیا ہے۔ جہاں کسی بھی فریق کو ت کے ذریعے دبانے کی کوشش کی تو اس سے ماحول میں بہتری کی بجائے اور زیادہ بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ ستی سے ماضی میں بھی اس قسم کے معاملات پر غیر سیاسی انداز فکر اختیار کیا گیا اور آج بھی بعض حلقوں کی ب سے اسی انداز فکر کی ترجمانی کی جا رہی ہے۔

جنرل ضیاالحق مرحوم کے مارشل لاء کے دوران پورے ملک کو غیر سیاسی بنانے کے ان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایجنڈے، خاص طور پر 1984ء میں طلبہ تنظیموں پر پابندی نے، مجموعی طور پر پورے معاشرے کو سیاسی ارتقا کے حوالے سے بہت نقصان پہنچایا اور معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح طلبہ وطالبات بھی معاملات کو سیاسی تنہائی میں دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نوجوان طالب علم نسل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ قیام پاکستان سے لے کر طلبہ تنظیموں پر پابندی تک کے سیاسی سفر میں طلبہ تنظیموں کا کیا کردار رہا۔ نوجوان ماضی کی طلبہ سیاست کے بارے میں لاعلم ہیں۔ ہمارے طالب علم اس بات سے اس لیے لاعلم ہیں کہ وہ اس حوالے سے معلومات کے حصول میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ طلبہ سیاست نے قومی سطح پر نہ صرف انمٹ نقوش چھوڑے بلکہ نظریاتی طور پر رائیٹ اور لیفٹ کی اس سرد جنگ میں بھی ان تنظیموں کا اہم کردار تھا جس نے قومی سیاست کے عمل کو فروغ دیا اور معاشرے پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔ اگرچہ طلبہ تنظیموں میں کچھ خامیاں تو موجود تھیں مگر حالات اتنے خراب نہیں تھے کہ ان پر پابندی لگا دی جائے۔ لیکن جنرل ضیاالحق نے اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ایسا کر دکھایا۔ ایک طرف طلبہ تنظیموں پر پابندی لگائی گئی اور دوسری طرف اس سے پیدا ہونے والے سیاسی خلا نے طلبہ تنظیموں کے ہاتھوں میں اسلحہ تھما دیا۔ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا جس میں طلبہ تنظیمیں تو نشانہ بنیں ہی، ان کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتیں بھی لاشعوری طور پر اس مہم کا حصہ بن گئیں۔ جنرل ضیاالحق کو اس بات کا خوف تھا کہ تعلیمی اداروں اور ان کی تنظیموں میں ان کے خلاف ایک خاص ردعمل ظاہر ہو رہا ہے، اس لیے ان کی آواز جو سیاسی جماعتوں کی طاقت ہے، کو دبانا ضروری تھا۔ اس غیر سیاسی سوچ نے اور اس کے تحت اٹھائے گئے اقدامات نے، سب سے پہلے تعلیمی اداروں اور طلبہ گروپوں میں تشدد کے عنصر کو فروغ دیا اور اسی کے نتیجے میں غیر طالب علم عناصر بھی یونیورسٹی کی سیاست کا حصہ بن گئے اور اس میں سیاسی جماعتوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جنہوں نے سیاسی مصلحتوں کے باعث بہت سے نامناسب اقدامات پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ضیاالحق مرحوم کے دور سے قبل طلبہ میں ایک کشمکش بھی موجود تھی اور ان میں زوردار انداز کی سیاست بھی تھی مگر پرتشدد واقعات کبھی کبھار ہوتے تھے اور اس میں بھی اسلحہ کا استعمال نہیں تھا۔ بدقسمتی سے افغان جنگ نے جس طرح سے ملک میں اسلحے کو عام کیا اور جس طرح نوجوانوں کو مخصوص مقاصد کے تحت جہاد کی طرف راغب کیا گیا، اس نے بھی طاقت کے استعمال کو تقویت دی۔

طلبہ تنظیموں نے ووٹ کی بنیاد کی بجائے طاقت اور اسلحہ کو بنیاد بنا کر تعلیمی اداروں کا کنٹرول سنبھالنے کی کوشش، جس کے خوف ناک نتائج برآمد ہوئے اور اس میں ریاستی اداروں اور بعض خفیہ جماعتوں کا کردار بھی شامل تھا۔ امیر العظیم سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان اپنے ایک انٹرویو میں تسلیم کرتے ہیں کہ ''بعض اوقات ہم کسی جگہ عصبیت کا شکار ہو جاتے ہیں، لوگوں کے ساتھ مکالمہ بند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں رکھتے اور میں یہ کہتا تھا کہ نہ تو ہمارے مخالفین سرتاپا غلط ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ہم فرشتہ ہیں۔ ہمیں اپنے مخالفین کو مکمل طور پر رَد کرنا چاہیے اور نہ ہی خود کو غلطیوں سے مبرا سمجھنا چاہیے۔ ہمیں تشدد، رعب اور تنظیم کی طاقت کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ میں اپنے خیالات کو تنظیم میں بہت زیادہ منوانے میں کامیاب نہیں رہا۔'' وہ عمران خان کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ پر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ''میں نے میڈیا کے سامنے کہا کہ عمران خان والا واقعہ جمعیت کی تاریخ کا بدنما داغ ہے۔ اس پر جمعیت کے اندر سے میری بہت مخالفت ہوئی۔ میں نے کہا کہ یہ میری رائے ہے کہ جو کچھ پنجاب یونیورسٹی میں عمران خان کے ساتھ ہوا وہ غلطی نہیں بلکہ گناہ تھا، اس پر عوامی سطح پر معافی مانگنا چاہیے۔ میرے نزدیک یہ گناہ صغیرہ نہیں بلکہ گناہ کبیرہ تھا۔'' اچھی بات ہے کہ امیر العظیم اپنی سابقہ غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ افراد نے تنظیم کی حمایت یا اپنی مرضی کرتے ہوئے اپنے پلیٹ فارم سے بعض ایسی روایات کو جنم دیا جو نہ صرف عدم برداشت اور تشدد کے زمرے میں آتی ہیں بلکہ انہوں نے اپنے تعلیمی ماحول میں اپنے سیاسی مخالفین کے لیے بھی ایسے طرزِ عمل اختیار کیے جس کی کسی بھی طور پر حمایت نہیں کی جا سکتی۔ اچھا ہو کہ اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ موجودہ قیادت اور کارکن بھی سابق رہنما امیر العظیم کی طرح سیاسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھلے ذہن کے ساتھ نہ صرف اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں بلکہ جمعیت کو بھی نئے خطوط پر استوار کریں۔ مزید جہاں ان کی طاقت ہے وہاں سب کو کام کرنے کا بلکہ آزادانہ اور بغیر کسی جھجک اور خوف موقع دیا جائے تو یہ ایک اچھی پیش رفت ہو سکتی ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ تعلیمی اداروں میں تشدد، مار پیٹ اور اسلحہ کے استعمال میں جہاں جمعیت کے لوگ شامل رہے ہیں دیگر طلبہ تنظیموں سے وابستہ افراد اور ان کے رہنماؤں اور ان کی سیاسی جماعتوں کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جن میں پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، قائداعظم سٹوڈنٹس فیڈریشن، مہاجر سٹوڈنٹس فیڈریشن، بلوچ سٹوڈنٹس فیڈریشن جیسے گروپ بھی شامل رہے۔ سب کو اپنے اپنے ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کے طرزِ عمل نے طلبہ سیاست کو بہر حال کسی نہ کسی حد تک نقصان پہنچایا ہے۔

جنرل ضیاالحق کے دَور میں اور اس کے بعد جو خرابیاں طلبہ تنظیموں نے اپنائیں، اس میں کوئی ایک فریق ذمہ دار نہیں کیوں کہ اس دَور کے سبھی فریقوں نے مل کر تعلیمی اداروں کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اس لیے یہ کہنا کہ کسی ایک فریق کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے، مناسب نہیں ہوگا۔ طلبہ تنظیموں اور ان سیاسی کردار پر جب ہم تنقید کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ وہی طلبہ تنظیمیں ہیں جنہوں نے اس ملک کی تاریخ کے متخالف ادوار میں جنرل یحییٰ خان، جنرل ایوب خان، جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف کی آمریت کا مقابلہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ سول ڈکٹیٹر شپ یعنی ذوالفقار علی بھٹو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرحوم، نواز شریف، بے نظیر بھٹو اور شوکت عزیز جیسے حکمرانوں کے آمرانہ اقدامات پر بھی خاموشی اختیار نہیں کی۔ آپ ان کے نقطہ نظر اور طریقہ کار سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کی سیاسی جدوجہد سے انکار ممکن نہیں۔

اسلامی جمعیت طلبہ کی اسلامی جماعت سے وابستگی ہے اور جماعت میں ایک بڑا گروپ ضیاالحق مرحوم کا حامی تھا مگر پنجاب کی سڑکوں پر اسلامی جمعیت طلبہ ہی نے اپنے مشہور نعرہ ''ضیا، جونیجو دوشیطان۔۔۔۔ جاگ رہا ہے پاکستان'' کے نعرے سے مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس پر جماعت اسلامی کی قیادت جمعیت کے بعض رہنماؤں سے نالاں بھی رہی۔ خود سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان امیر العظیم تسلیم کرتے ہیں کہ ''اسلامی جمعیت طلبہ نے اس بات کو کبھی پسند نہیں کیا کہ جماعت اسلامی جمعیت بالواسطہ طور پر جنرل ضیاالحق کی حمایت کرے۔ جماعت اسلامی میں دو طرح کے رجحانات رہے۔ یعنی کراچی میں الگ رائے تھی، طلبہ تنظیموں میں رائے مختلف تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ یہ سمجھتی تھی کہ ہمیں سب سیاسی قوتوں کے ساتھ مل کر ضیا آمریت کے خلاف مزاحمت کرنی چاہیے۔ جماعت کے امیر میاں طفیل محمد کی رائے اور اسلامی جمعیت طلبہ کی رائے میں ایک واضح فرق موجود تھا۔''

اسی طرح جب ان طلبہ تنظیموں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ غیر سیاسی صورتِ حال کا شکار رہیں اور ملک پر سول حکمرانی کے نام پر فوجی حکمرانی کا غلبہ رہا۔ اس صورتِ حال میں جن کی تربیت رائٹ اور لیفٹ کی سیاست پر ہوئی ہو وہ کیسے سیاسی تنہائی کا شکار ہو سکتے تھے اور ان کو ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیوں کہ ملک میں جو کچھ بگاڑ ہو رہا تھا، اس میں طلبہ کا اپنا مستقبل بھی پنہاں تھا اور صورت حال کو جمہوری بنانا ان کی بھی ذمہ داری تھی۔ طلبہ تنظیموں نے اپنے دور میں ڈٹ کر شریف کمیشن رپورٹ میں دی گئی نیشنل ایجوکیشن پالیسی کی مخالفت کی۔ اسی طرح بعض تنظیموں، جن میں اسلامی جمعیت طلبہ بھی شامل تھی، اس پابندی کے باجود تعلیم کی نجکاری کی شدید مخالفت کی۔ یہ مخالفت آج بھی جاری ہے۔ طلبہ اور طالبات کے مسائل حل کرنے میں ان تنظیموں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اسی وجہ سے لوگ ان تنظیموں سے وابستہ بھی ہوتے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ سیاسی مسائل کے حل کے برعکس تعلیم کی بہتری میں طلبہ تنظیموں کی جدوجہد وہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی۔

اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ طلبہ کو سیاسی جماعتوں کی جانب سے کی جانے والی قومی سیاست اور چلائی جانے والی سیاسی تحریکوں کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ تو سوال اُٹھایا جا سکتا ہے کہ پھر طلبہ و طالبات کیا کریں۔ یعنی محض تعلیم حاصل کریں اور تعلیمی اداروں کے باہر حکومت، ریاست اور اس کے ادارے جو کچھ کر رہے ہیں، اس پر خاموشی اختیار کر لیں۔ یہ منطق سمجھ سے بالاتر ہے اور آج کے طلبہ و طالبات کی غیر سیاسی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ یہ بھول رہے ہیں کہ اگر طلبہ نے بھی تعلیم کی بہتری کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عام پر تحریکیں چلاتا ہیں تو سیاسی جماعتوں کی مدد کے بغیر ایسا ممکن نہیں کیوں کہ ان کے مسائل خالصتاً سیاسی ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک خاص سیاسی سوچ کا شاخسانہ ہے۔ حکومت اور ریاستی ادارے تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ طلبہ و طالبات ان کے خلاف مزاحمت کرنے کی بجائے صرف اور صرف اپنی توجہ تعلیم پر مرکوز رکھیں اور انہیں اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے دیں۔ طلبہ و طالبات میں جو کچھ غیر سیاسی ذہن تیار ہوا ہے، وہ فوجی آمروں اور غیر سیاسی عناصر کے لیے اطمینان بخش ہوگا اور وہ خوش ہوں گے کہ طلبہ کی نئی سوچ ان کی پالیسی سے ہم آہنگ ہے، طلبہ و طالبات اگر کسی سیاسی جماعت سے وابستگی رکھتے ہیں تو یہ کوئی بُری بات نہیں بلکہ سب کو اپنی اپنی پسند کی جماعتوں میں جانا چاہیے اور ان میں شمولیت اختیار کرنی چاہیے۔ یہ ان کا حق ہے۔ سیاسی قیادتیں اگر معاشرے میں تقویت حاصل کریں گی اور انہیں مجموعی سطح پر قبولیت ملے گی تو اس سے طلبہ سیاست کا ایجنڈا بھی مضبوط ہوگا۔ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ طلبہ نہ سیاست کریں۔ انہیں خود کو کیمپس تک محدود رکھنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پابندی ان پر کیوں لگائی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ضروری ہے تو اس کا فیصلہ طلبہ تنظیموں اور طلبہ کو خود کرنا چاہیے کہ سیاسی جماعتیں تعلیمی اداروں اور طلبہ تنظیموں کے معاملات میں مداخلت اس حد تک نہ کریں جس سے ان تنظیموں کی اپنی آزادی پر سوالیہ نشان لگ جائے۔ سیاسی جماعتوں کو طلبہ تنظیموں کے انتظامی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور ان تنظیموں کو آزادانہ بنیادوں پر کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ البتہ سیاسی جماعتوں سے وابستہ طلبہ تنظیمیں سیاسی جماعتوں سے رہنمائی ضرور حاصل کر سکتی ہیں۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ لسانی فرقہ وارانہ اور لسانی تنظیموں پر پابندی عائد ہونی چاہیے تو سوال یہ ہے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کیا ریاست کو اس بات کا حق دیا جانا چاہیے کہ وہ ان تنظیموں پر پابندی عائد کر دے یا طلبہ کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے ووٹ کے ذریعے ان تنظیموں کا مسترد کر دیں جو اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔ کیا اس طرح کی رائے کا مقصد میدان میں مخصوص تنظیموں کو برقرار رکھنا تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو یہ کام پہلے ہی ریاست بہت اچھی طرح سے کرتی رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ پہلے کی طرح اچھا نہ ہوگا۔

میرے نزدیک ان تنظیموں پر پابندی لگانے کی بجائے کہ مقابلہ سیاسی انداز میں ہو اور طلبہ کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ ان تنظیموں کے تشدد پر مبنی ایجنڈے کو ووٹ کے ذریعے مسترد کر دیں تو صورت حال مناسب انداز میں بہتر ہو سکتی ہے ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ آج کے طالب علموں کو باقی کی نسبت اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں طلبہ کیمپس سیاست کا حصہ نہ بھی بنتے تو وہ انٹرنیٹ پر بنائے گئے مختلف کمیونٹی گروپس اور ایس ایم ایس کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ طبقہ طلبہ سیاست اور ان کی یونین کا متبادل انٹرنیٹ گروپس کو سمجھ رہا ہے۔ ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے سے طلبہ کی رابطہ کاری بُری نہیں۔لیکن یہ ذرائع کس طرح سے طلبہ سیاست کا متبادل ہو سکتے ہیں۔اگر یہ گروپس اتنے ہی مؤثر ہیں تو پھر طلبہ تنظیموں کی بھی کیا ضرورت ہے اور یہ جو غیر نصابی سرگرمیاں ہیں یہ نوجوان یونیورسٹیوں سے باہر بھی کر سکتے ہیں۔اس کے لیے تعلیمی اداروں کی ضرورت پلیٹ فارم سے ایسے پروگرام کا انعقاد کرتی رہے اور اسلامی جمعیت طلبہ کے کتاب میلے کو، ملکی سطح پر بڑی پذیرائی بھی ملی مگر یہ جو خیال ہے کہ اس طرح کے غیر سیاسی گروپس بنا کر طلبہ تنظیموں اور سیاست میں ان کے کردار کو محدود کیا جا سکتا ہے، تو یہ ٹھیک نہیں۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح طلبہ و طالبات کو غیر سیاسی کی سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح انہیں سیاسی و سماجی حقوق اور سیاسی تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ریاست کس طرح ان کا استحصال کرتی ہے اور انہیں استحصالی قوتوں کا مقابلہ کیسے کرنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ کام طلبہ کی سیاست میں شمولیت کے بغیر ممکن نہیں۔آج تعلیمی اداروں کا ماحول اس قدر غیر سیاسی بنا دیا گیا ہے کہ طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی سیاست اور اس سے متعلقہ مسائل اور ریاست، حکومت کے کردار پر بات چیت کر سکتے ہیں اور نہ تنقید کر سکتے ہیں، اور اگر کوئی ایسا کرنے کی جسارت کرے تو تعلیمی اداروں کے سربراہوں، اساتذہ اور طالب علموں کی ریاست کی جانب سے جواب طلبی ہوتی ہے۔ابھی حال ہی میں بعض اساتذہ کو وکلا تحریک میں حصہ لینے پر ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا ہے۔اس طرح کا غیر سیاسی انداز ان ریاستوں یا حکومتوں کا ہوتا ہے جو لوگوں کو ان کے حقوق دینے سے ڈرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب یہ نوجوان طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر کے باہر نکلتے ہیں تو ان کے سامنے محض ان کا اپنا ذاتی ایجنڈا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سماج میں تبدیلی کے عمل سے لاتعلق رکھتے ہیں۔اس میں ان کا قصور نہیں بلکہ ان کے ذہنوں کی تشکیل اس انداز میں کی گئی ہے کہ وہ غیر سیاسی رہیں۔حال ہی میں مختلف یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز کی ایک ٹیلی فونک کانفرنس ہوئی، جس میں طلبہ تنظیموں کے انتخابات اور ان کی بحالی کی شدید مخالفت کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ طلبہ تنظیموں کی بحالی اور ان کے انتخابات سے اجتناب کرے تاکہ تعلیمی ماحول خراب نہ ہو۔یہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے تعلیم کے نام پر یونیورسٹیوں کو کاروباری اداروں میں تبدیل کر دیا ہے اور یہ کسی کے سامنے جواب دہ ہونے کو تیار نہیں۔ انہیں خدشہ ہے کہ اگر طلبہ تنظیمیں بحال ہوں گی تو یہ نہ صرف ہم پر دباؤ ڈالیں گی بلکہ اپنے اور طالب علموں کے مفادات کی جنگ میں ہمارے خلاف مزاحمتی کردار بھی ادا کریں گی۔فی الحال تمام انتظامی عہدے داران اپنی اپنی یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں یک طرفہ ٹریفک چلا رہے ہیں اور ان کے سامنے طلبہ و طالبات عملاً بے بس نظر آتے ہیں۔اسی طرح سوال یہ ہے کہ طلبہ تنظیموں کے انتخابات کا فیصلہ کس نے کرنا ہے کیوں کہ ہمارے خیال میں اس کی اجازت یونیورسٹی کے انتظامی سربراہ نے دینی ہے تو یہ ممکن نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یوں کہ یہ ایک خالصتاً سیاسی فیصلہ ہے اور اس پر سیاسی حکومتوں کو ہی ایک بڑا فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ غیر سیاسی ذہن کبھی ایک اچھا سیاسی معاشرہ نہیں بنا سکے گا۔

مثال کے طور پر حکومت نے جب اٹھارہ سال کے افراد کو ووٹ کا حق دیا تو یہ خیال تھا نوجوان ان کا خیر مقدم اس لیے کریں گے اور انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ نوجوان کل اس وقت ووٹ ڈالنے کے لیے بھی ذہنی طور پر تیار نہیں یا ان کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کہ تبدیلی کے لیے ووٹ کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ طلبہ سیاست سے تعلیم کی کوالٹی متاثر ہوتی ہے اور طالب علم اچھی تعلیم سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ عجیب منطق ہے کیوں کہ یونیورسٹی انتظامیہ جب یہ کہتی ہے کہ اگر طلبہ تنظیمیں بحال ہو گئیں تو اس سے تعلیم کا مکمل متاثر ہوگا تو کیا ہماری یونیورسٹیاں ایسا کوئی عملی ثبوت دے سکتی ہیں کہ طلبہ تنظیموں پر پابندی کے بعد تعلیمی اداروں میں تعلیم کی کوالٹی خاطر خواہ حد تک بہتر ہوئی ہو تو یقیناً اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ اس کا ثبوت اہم تعلیمی ماہرین کی مختلف رپورٹوں سے ملتا ہے جہاں ہائیر ایجوکیشن میں مسلسل گراوٹ کی کہانی پیش کی جا رہی ہے۔

ہمارے ہاں بعض طبقات میں اس بات پر بھی ابہام ہے کہ ملک میں اس وقت جو تعلیمی بیکاری بڑھ رہی ہے، اس پر بھی طلبہ تنظیمیں خاموش ہیں۔ اس طرح یہ درست نہیں کہ طلبہ تنظیموں نے سیلف فنانس سکیم اور تعلیم کی بیکاری پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اخبارات کے صفحات اور کالم گواہ ہیں کہ اسلامی جمعیت طلبہ، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن سمیت متحدہ طلبہ محاذ جس میں تمام طلبہ تنظیمیں شامل ہیں، نے ان مسائل پر بھرپور آواز اُٹھائی مگر انتظامیہ کی اور ریاست کی گٹھ جوڑ کی وجہ سے یہ احتجاج دب کر رہ گیا۔ حال ہی میں ہم نے کیڈٹ کالج کی طالبات کو سڑکوں پر دیکھا ہے جو اپنے اداروں میں بے جا فیسوں میں اضافہ کے باعث مہم چلا رہی تھیں۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ بڑے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے تعلیمی اداروں میں بھی تعلیم کی بیکاری ایک اہم مسئلہ بن کر سامنے آ رہی ہے۔

تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں آپ کو طلبہ سیاست کا اہم تحریکوں میں ایک افادیت کا کردار ملے گا، چاہے ان کا تعلق قومی و صوبائی و علاقائی مسائل سے ہو یا جمہوری جدوجہد سے ہو یا اپنے تعلیمی مسائل کا انبار ہو، آپ کو ہر سطح پر طلبہ کا کردار نظر آئے گا۔ مثلاً 1948ء میں قومی زبان کے مسئلے پر کھڑی ہونے والی طلبہ مزاحمت اور شہید مینار کی تعمیر کے تناظر میں اُٹھنے والی تحریک۔ اسی طرح کراچی میں 1953ء کی طلبہ تحریک بھی اہم حصہ ہے جس میں کراچی اور سندھ کے طلبہ نے فیسوں میں بے جا اضافہ، بنیادی سہولتوں کے فقدان، ہاسٹل کی کمی، معاشی بدحالی کے خلاف بھرپور تحریک چلائی، جس میں ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اہم کردار تھا۔

پروفیسر عزیز الدین اپنی کتاب ''پاکستان میں طلبہ سیاست'' کے صفحہ نمبر 77 پر 1953ء کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اس جدوجہد میں جن طلبہ نے نمایاں طور پر حصہ لیا ان کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔ ان میں سے کئی بعد میں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونین اور پروفیشنل تنظیموں کے رہنماؤں کے طور پر مشہور ہوئے، جن میں عابد حسن منٹو، ذکی عباس، ڈاکٹر رحمان ہاشمی شامل ہیں۔ اسی طرح پنجاب میں تحریک ایک ایوب دور میں چلی جب تین سالہ ڈگری کورس اور یونیورسٹی آرڈیننس کے خلاف صوبہ بھر کے طلبہ نے جلوس نکالے اور 1968ء میں راولپنڈی کے طالب علم عبدالحمید کی ہلاکت ایوب خان کے خلاف آخری ہلے کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ اس سانحہ کے خلاف رائیٹ اور لیفٹ دونوں طرز کے طبقات میں شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔ اس واقعہ نے پنجاب میں طالب علموں کی ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جو صوبے کے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں پھیل گئی۔'' پروفیسر عزیز الدین اپنی اسی کتاب میں رقم طراز ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جولیڈر صحافتی میدان میں آمریت اور فرقہ واریت کے رجحانات کے خلاف جنگ آزما رہے ہیں، ان میں حمید نظامی کا نام قابل ذکر ہے۔ 1953ء میں ختم نبوت کے نام پر مذہب کو جس طرح سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس کی مخالفت میں حمید نظامی پیش پیش تھے۔ ان کے اس کردار کو منیر رپورٹ میں سراہا گیا۔ اسی طرح عبداللہ ملک، جو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں خاصے سرگرم عمل تھے، قیام پاکستان کے بعد عمر بھر اپنے قلم کے ذریعے جمہوریت اور سماجی انصاف کی خاطر جنگ لڑتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد طالب علموں نے اہم ترین جنگیں امریکی سامراج اور اس کی جانب سے پاکستان پر حکمرانی کرنے والے آمروں کے خلاف لڑیں۔ اس دور میں سامراجی بالادستی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں طلبہ کا کردار بہت اہم ہے۔''

معروف تاریخ دان اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کے نئے زوایے'' میں شامل مضمون ''طلبہ اور سیاست'' میں لکھتے ہیں:

> ''برصغیر میں جب طلبہ میں نظریاتی سیاست کا آغاز ہوا تو ابتدا میں نیشنل ازم کا جذبہ تھا کہ اس نے طلبہ تحریک کو دائیں اور بائیں بازو کی تحریک میں تقسیم کر دیا۔ اس نظریاتی تصادم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ میں اپنے نظریات کے دفاع کے لیے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا کہ نظریہ کی بنیاد پر سماج اور اس کی ساخت کا تجزیہ کیا جائے۔ اس عمل نے طلبہ کو ذہنی طور پر پختہ بنایا اور جب وہ تعلیم مکمل کر کے زندگی کے عمل میں آئے تو سیاسی جماعتوں کی رہنمائی انہوں نے ہی کی۔ اس نے اس تسلسل کو قائم رکھا جو انہوں نے نوجوانی میں شروع کیا تھا۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری ملکوں میں طالب علموں کے اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ انہیں سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ لیکن آمرانہ اور جابرانہ ادوار میں کوشش کی جاتی ہے کہ طالب علموں کو سیاست سے دُور رکھا جائے تاکہ انہیں کوئی چیلنج نہ کر سکے۔ اگر طالب علموں کی جانب سے کوئی تحریک اُٹھتی ہے تو اس صورت میں یہ حکومتیں اسے سختی سے کچل دیتی ہیں اور اس صورت حال سے پاکستان کے طالب علم ابتدا ہی سے دوچار ہیں۔'' صفحہ نمبر (154-155)

کچھ لوگ یہ موقف بھی پیش کرتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل غیر سیاسی نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں لوگ اب روایتی سیاست کو پسند نہیں کرتے اور انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کیمپس کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ وہ صرف اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اگر واقعی قوم غیر سیاسی نہیں اور اس کا سیاسی مزاج باقی ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہاں سیاسی عناصر کے مقابلے میں غیر سیاسی عناصر کو بالادستی ہی ہے اور آج بھی سیاسی لوگوں کے مقابلے میں فوج اور اسٹیبلشمنٹ ہی مضبوط عنصر کے طور پر موجود ہیں۔ بعض لوگ گورنمنٹ کالج، ایچی سن کالج، کنیئرڈ کالج کی مثال دیتے ہیں، جہاں کئی سوسائٹیاں ہیں اور وہ مختلف شعبوں میں فعال کام کر رہی ہیں۔ مگر کیا بتایا جا سکتا ہے کہ ان کالجوں سے کون سی قومی و علمی تحریکوں نے جنم لیا ہے اور انہوں نے کہاں طلبہ کے مفادات میں ریاست کے خلاف مزاحمت کی اور آج ان کا قومی وجود کیوں نظر نہیں آتا۔ ان سوالوں کا جواب نفی میں ملے گا۔ مجھے ان سوسائٹیوں کی افادیت سے انکار نہیں بلکہ ان کے غیر سیاسی کردار کا ناقد ہوں جس سے کوئی بڑے نتائج نہیں مل سکتے۔ آج ملک میں تعلیمی اداروں میں جو کچھ ہو رہا ہے جس میں انتظامیہ مضبوط اور طلبہ کمزور پوزیشن میں ہیں، تو اس سے تعلیم اور طلبہ کی کیا خدمت ہوئی؟ اس کا ذکر بھی کر لیا جائے تو اصل صورت حال سامنے آسکتی ہے اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ طلبہ کے مفادات کے برعکس ہوگئی۔ یونیورسٹی کیمپس سے باہر کیا ہو رہا ہے، اگر طلبہ نے اس پر اپنا ردِعمل نہیں دکھانا تو پھر کیمپس میں کیا ہو رہا ہے، اس کا سماج سے کیا تعلق باقی رہ جاتا ہے، اس پر بھی ذرا غور کر لیا جائے۔

جہاں تک یونین کے حوالے سے ضابطۂ اخلاق کا تعلق ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، یہ پہلے بھی موجود رہا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس پر عمل کون کرے گا۔ اس کے لیے لائحہ عمل بننا چاہیے اور اس کی ذمہ داری صرف طلبہ تنظیموں کی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ حکومت اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں کی ہے۔ حکومت بدلتے ہی حکمران اپنی سیاسی طاقت کے حصول کے لیے تعلیمی اداروں کا رخ کرتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے سربراہ ان حکومتوں کی خوشنودی کے لیے وہ کچھ کرتے ہیں جو حکومت ان سے چاہتی ہے اور اس کے بعد کوڈ آف کنڈکٹ بے معنی بن کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے لوگ یہ مثالیں بھی دیتے ہیں کہ طلبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست سے تعلیم کا نظام اچھا نہیں بلکہ بگاڑ کا شکار ہوا ہے، اس لیے ان پر پابندی ہونی چاہیے۔ حیرت ہے کہ تعلیمی نظام کی ذمہ داری ہم صرف طلبہ سیاست پر ڈال کر بہت سے بڑے ریاستی، حکومتی مجرموں کو بچانا چاہ رہے ہیں کیوں کہ جب ریاست ہی کے لیے تعلیم بنیادی ترجیح نہیں تو پھر طلبہ کیا کریں گے۔ میں معروف معاشی و سیاسی امور کے دانشور ڈاکٹر قیصر بنگالی کے تجزیے سے اتفاق کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں:

''پابندی کے باوجود تعلیمی نظام مسلسل تنہائی کی طرف جا رہا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ تعلیم کی تنہائی میں اور بھی بہت سے عوامل ہیں۔ بالخصوص ہماری ریاست کی ترجیح میں تعلیم شامل ہی نہیں۔ طلبہ سیاست کو محض قربانی کا بکرا بنا کر سارا ملبہ ان پر ڈالا جا رہا ہے۔''

ڈاکٹر بنگالی کے اس تجزیے سے نئی نسل کے ان طالب علموں کو ضرور استفادہ کرنا چاہیے، جو سارا الزام طلبہ سیاست پر لگا کر لاشعوری طور پر ریاست کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں ان طبقوں کو بھی غور کرنا چاہیے جو طلبہ و طالبات کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں کہ وہ کس انداز میں نئی نسل کو شعور دے رہے ہیں۔ انہیں اپنی سمت کا دوبارہ جائزہ لینا چاہیے کیوں کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سماجی اور علمی ادارے خود بھی طلبہ سیاست کے بارے میں مختلف تضادات کا شکار ہیں یا وہ اس کو سیاسی تنہائی میں دیکھ رہے ہیں۔

معروف تاریخ دان اور دانشور ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کے نئے زاویے'' میں شامل ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ طلبہ کو سیاست سے دور رہ کر صرف تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے، ان میں سے اکثریت ریاست یا حکومت کے نقطہ نظر کو پیش کرتے ہیں کیوں کہ جب طلبہ سیاست کے میدان میں آتے ہیں تو وہ ریاست کی اتھارٹی کو چیلنج کرتے ہیں، حکومت کے طور طریقوں اور حکمران طبقوں کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور عوامی مسائل سے جڑ کر ایک ایسے نظام کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں لوگوں کو ان کے حقوق ملیں۔ لہٰذا ایک لحاظ سے یہ تسلسل کی قوتوں اور تبدیلی کے عناصر کے درمیان تصادم ہوتا ہے۔ اور جو لوگ حالات کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے اور تبدیلی کے خواہش مند نہیں، وہ اس کے حامی ہوتے ہیں کہ طلبہ سیاست سے دور رہیں اور تعلیمی اداروں سے باہر آ کر عملی دنیا میں قدم نہ رکھیں۔'' (صفحہ 153)

ڈاکٹر مبارک علی نے بہت اچھے انداز میں ریاست اور حکومت کی اس سوچ کا اظہار کیا ہے کہ وہ کیوں طلبہ کے سیاسی عمل میں شمولیت کے مخالف ہیں اور یہ نقطہ نظر ریاست کے اس غیر سیاسی ذہن کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نشان دہی کرتا ہے جو آج ہمیں ایک بڑے بحران کی صورت میں درپیش ہے۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں:

''طلبہ بھی سماج کے دوسرے طبقوں کی طرح ایک اہم طبقہ ہیں جو نوجوانوں پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں توانائی اور جذبات ہوتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں یہ نئے خیالات وافکار سے متاثر ہوتے ہیں اور ان میں یہ ذوق شوق بڑی شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کو بدلنا چاہیے۔ جب انہیں حقیقی طور پر تضادات نظر آتے ہیں تو یہ جذبہ اور زیادہ شدت سے ابھرتا ہے۔ اس لیے سیاست انہیں وہ میدان نظر آتا ہے، جہاں وہ اپنے خیالات وافکار اور نظریات کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں اور یہ سوچ انہیں ایسی تحریکوں میں لی جاتی ہے جو تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی جذبہ کے تحت وہ نوآبادیاتی دور میں قومی جدوجہد کا حصہ رہے اور اپنی توانائیاں اسی میں استعمال کیں۔ آزادی کے لیے انہوں نے خود کو عوام سے جوڑ کر سماج کو بدلنے میں حصہ لیا۔''

طلبہ تنظیموں کے سیاسی کردار اور ان کی سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستگی کا سوال ہمارے ہاں فرد ایک ایسے موقع پر اٹھا رہے ہیں جب ہمارا تعلیمی نظام مکمل طور پر بین الاقوامی دھڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیمی پالیسوں پر بھی انہی کا کنٹرول ہے۔ تعلیمی شعبہ میں وزرائے انتخاب سے لے کر اہم عہدوں پر تقرری تک بین الاقوامی رضامندی کے ساتھ مشروط ہے۔ اس وقت نصاب کی تبدیلی اور تعلیم کی نجکاری کا عمل عروج پر ہے اور تعلیمی ادارے بالخصوص یونیورسٹیاں تعلیم سے زیادہ کاروبار کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود طلبہ وطالبات کو قوم کے سامنے جاہل بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور ڈسپلن کے نام پر اُن طلبہ وطالبات کو باہر نکال دیا جاتا ہے، جو استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ایسے میں ریاست اور بین الاقوامی ادارے سمجھتے ہیں کہ طلبہ سیاست ان کے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے تو یہی وجہ ہے اب تک طلبہ تنظیموں پر سے پابندی اٹھانے کا اعلان کرنے کے باوجود حکومت اس کا نوٹیفکیشن جاری نہیں کر سکی۔

ہماری یونیورسٹیاں یقیناً اس ملک میں اچھے پروفیشنل چاہتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک ان کی تعریف یہ ہے کہ یہ پروفیشنل افراد ہر سطح پر ریاست کی ترجمانی کا کردار ادا کریں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر تعلیمی اداروں نے طلبہ کا ذہن سیاسی نہیں بنانا تو یہ کام کون کرے گا۔ جو اہم اور بڑے بڑے سیاسی رہنما اور دانشور آج ملکی سیاست اور دیگر شعبوں میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں، وہ اسی طلبہ سیاست کی پیداوار ہیں جن میں منور حسن، لیاقت بلوچ، فرید احمد پراچہ، امیر العظیم، خواجہ سعد رفیق، حسین حقانی، ریاض فتیانہ، سید ہاشمی، احسن اقبال، جہانگیر بدر، اعجاز شفیع گیلانی، امتیاز عالم، وکیل انجم، شیخ رشید، الطاف حسین،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر غفور جیسے کئی اہم لوگ شامل ہیں۔ ان ناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ یہ لوگ اپنی تنظیموں کے فعال کردار کے نتیجے میں سامنے آئے۔ ویسے بھی سیاسی تنظیمیں اپنا کیڈر کہاں سے پیدا کریں گی، اور کیا یہ کیڈر پیدا کرنے کے لیے تعلیم اداروں کے کردار کی ضرورت نہیں؟ ایک اور سوال یہ ہے کہ پھر ان کی سیاسی تنہائی کا ذمہ دار کون ہوگا اور ملکی سیاست میں نئی قیادت کہاں سے آئے گی۔ اور کیا ملک کو مصنوعی قیادت اور نااہل لوگوں پر چھوڑ دیا جائے جو قیادت کے نام پر سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال کریں۔

مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ماضی میں اور بالخصوص ضیاالحق کے دور میں اور اس کے بعد بھی ان تنظیموں میں بہت خرابیوں نے جنم لیا ہے اور اس کا شکار کوئی ایک تنظیم نہیں بلکہ سب ہی ہوئی ہیں۔ ان تنظیموں میں اب بہت اصلاحات کی ضرورت ہے۔ خود طلبہ تنظیموں اور ان کی حمایت یافتہ جماعتوں کو ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اسی طرح ریاست کو بھی اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ بھی خرابی کے عمل میں شامل رہی ہیں۔ مثلاً پروفیسر عزیز الدین نے اپنی کتاب ''پاکستان میں طلبہ سیاست'' میں لکھتے ہیں:

> جنرل ضیاالحق کی جانب سے متعدد تنظیموں کو کھلی چھٹی دینے کی پالیسی کے نتیجے میں طالب علم راہنماؤں کی ایسی نسل وجود میں آ گئی تھی۔ جس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ کھیپ مکمل طور پر پیشہ وارانہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ نام نہاد طالب علم رہنما کسی اعلیٰ آدرش کی خاطر طلبہ سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کو متحرک کرنے والا جذبہ ان کی کسی آئیڈیالوجی سے وابستگی نہیں تھی اور نہ یہ کسی قسم کی قربانی کے جذبے سے آشنا تھے۔ اُن کا مطمع نظر مادی مفادات کا حصول تھا جس کے لیے وہ ہر طرح کے جرم کا ارتکاب کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ان کی نظر میں طالب علم لیڈری ایک پیشہ تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی کاروبار یا وکالت مختلف پیشے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ لیڈری کے کاروبار میں نہ سرمایہ کاری کی ضرورت تھی اور نہ ڈگریوں کے حصول کی۔ یہاں سرکاری سرپرستی اور طاقت کا استعمال بنیادی اہمیت رکھتے تھے اور ان کے ذریعے سے تھوڑے سے وقت میں کروڑوں روپوں کی جائیداد بنائی جا سکتی تھی۔'' (صفحہ 159-158)

پروفیسر عزیز الدین کا تجزیہ بالکل بجا ہے اور ہم نے وہ دور بھی دیکھا ہے جب 1984ء میں طلبہ تنظیموں پر پابندی لگی تو اس کے بعد طلبہ سیاست اور تنظیموں کی آڑ میں ان لوگوں نے ٹرانسپورٹروں سے غنڈہ ٹیکس وصول کیے، تاجروں سے زبردستی امداد حاصل کی، پلاٹوں کے قبضوں میں شامل ہوئے، گاڑیاں چوری کرنے کے واقعات سامنے آئے، طالبات کی بے حرمتی کی گئی، طلبہ کو اغوا کر کے ان پر بے جا تشدد کیا گیا اور سیاسی جماعتوں نے انہیں باقاعدہ آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ طلبہ تنظیموں اور ان کی سیاست میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بھی خرابیاں سامنے آئیں، ان کو ختم کرنے کے حوالے سے کچھ نہیں کیا گیا بلکہ جو حکمت عملی اختیار کی گئی، وہ یہ تھی کہ ان تنظیموں کے وجود کو ہی ختم کر دیا جائے کہ اس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر یہ منطق مان لی جائے تو پھر جمہوریت نے بھی بہت سی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ خرابیوں کو بھی جنم دیا ہے۔ اس کا بھی خاتمہ کر دینا چاہیے اور ملک کو متبادل کے طور پر آمروں اور آمریتوں کے سائے میں دھکیل دینا چاہیے کیوں کہ سیاست سمیت تمام ادارے کرپٹ اور مفلوج ہو گئے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ طلبہ تنظیموں میں اصلاحات نہیں ہو سکتیں، اگر تمام فریقین چاہیں تو اصلاحات مکمل ہو سکتا ہے اور ہم طلبہ کی سیاست میں شمولیت کے ساتھ ساتھ اس میں تعلیم کی اچھائی کے پہلو بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا طالب علم جو اس وقت عملی طور پر غیر سیاسی ہے اور مسائل کو سیاسی تنہائی میں دیکھ رہا ہے، اسے اپنے اردگرد ہونے والی قومی اور بین الاقوامی سازشوں کو سمجھنا ہوگا اور یہ ادارک کرنا ہوگا کہ وہ کس طرح سے ایک آزاد اور بہتر زندگی گزار سکتا ہے اور اس کے لیے اس پر جہاں کچھ انفرادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہاں ریاست اور معاشرے کی بھی اجتماعی ذمہ داریاں ہیں کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کس طرح معاشرے کی تشکیل میں کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس کردار کے لیے طلبہ و طالبات کے لیے تعلیمی ادارے ایک بہتر جمہوری نرسری کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بہ شرط یہ کہ ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ طلبہ سیاست ہمارے خلاف نہیں بلکہ ہمارے مفاد کے لیے کام کرتی ہے اور اگر اس میں کچھ خرابیاں ہیں بھی تو ان کو ہم مل کر دُور کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ سیاست اور تعلیم کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور انہیں علیحدہ علیحدہ خانوں میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہمیں مغرب کے ایجنڈے سے گریز کرتے ہوئے قومی ایجنڈے کی طرف آنا چاہیے، جہاں نوجوان ایک بہتر سیاسی کردار ادا کرنے کے لیے ہر وقت ذہنی طور پر تیار ہوں اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنے ذہنوں کو سیاسی انداز میں تبدیل کریں اور جانیں کہ کون لوگ ان کے حقوق کے محافظ ہیں اور کون دشمن۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزاد الیکشن کمیشن اور شفاف انتخابات کا بحران

پاکستان کی سیاسی اشرافیہ میں آزاد الیکشن کمیشن کا مطالبہ ہمیشہ سے سرفہرست رہا ہے کیوں کہ کسی بھی جمہوری معاشرے میں اگر اس کے ادارے آزادانہ حیثیت میں کام نہ کریں تو اس نظام کی شفافیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں الیکشن کمیشن کی آزادی ہمیشہ سے ایک سوالیہ نشان بنی رہی ہے۔ اس بحران کی وجہ سے اس ملک میں جب بھی انتخابات ہوئے اس کی شفافیت پر چاروں اطراف سے انگلیاں اٹھائی گئیں۔ پہلے یہ معاملہ محض اندرونی سطح پر موجود تھا لیکن اب بیرونی دنیا اور اس کی سیاسی اشرافیہ میں بھی ہمارے انتخابات کئی حوالوں سے متنازع سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ انتخابات میں شکست تسلیم کرنے کا کوئی جمہوری رجحان نہیں اور ہر جیتنے والی جماعت کے لیے انتخابات شفاف اور ہارنے والی کے لیے غیر شفاف ہوتے ہیں۔ ہماری ریاست اور حکومتیں ہمیشہ سے آزاد الیکشن کمیشن کی باتیں کرتی رہی ہیں لیکن عملاً ان کے اقدامات ان اداروں کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر مرضی کے نتائج حاصل کرنے پر نظر مرکوز ہوتی ہے۔

میثاق جمہوریت کے معاہدے میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان طے ہوا تھا کہ وہ برسر اقتدار آ کر اس ادارے کو آزاد اور شفاف بنائیں گے تاکہ شفاف جمہوری نظام کو انتخابات کے ذریعے آگے بڑھایا جا سکے۔ لیکن تاحال اس پر کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی۔ حکومت نے اٹھارہویں ترمیم کی منظوری میں قوم کو یہ خوش خبری دی تھی کہ ہم نے الیکشن کمیشن کو آزاد کر دیا ہے لیکن اس کے بعد اب تک جو ضمنی انتخابات ہوئے ہیں، وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے جمہوری رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ سیاست پر گہری نظر رکھنے والے اکثر اہل دانش اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ اس ملک میں 1970ء کے بعد کوئی بھی شفاف انتخابات نہیں ہوئے اور ان انتخابات کے نتائج نے ہماری پس پردہ قوتوں کو یہ پیغام دیا تھا کہ ملک میں اس طرز کے شفاف انتخابات دوبارہ نہیں ہونے چاہئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد 1985ء، 1990ء، 1993ء، 1997ء، 2002ء اور 2008ء میں ہونے والے تمام انتخابات ایسے ہیں جس پر کئی حوالوں سے بات کی جا سکتی ہے۔ ان انتخابات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ں پردہ قوتوں کی مداخلت کے باعث اپنی شفافیت سے محروم رہے۔ یہی حال ملک میں مقامی اداروں یا مستوں کے انتخابات کا بھی رہا ہے، جہاں ہمارا یہ ریاستی ادارہ اپنی شفافیت کو برقرار نہیں رکھ سکا۔ جب یہ ارے مکمل طور پر ریاست کے کنٹرول میں ہوں گے اور اس میں اہم تقرریاں انہی کے ماتحت ہوں گی تو وہ انہی لوگوں کو جواب دہ ہوں گے جو ان کے اصل وارث ہیں۔

معروف مؤرخ احمد سلیم نے اپنی کتاب ''ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول بیوروکریسی'' میں 199ء کے انتخابات کے بارے میں لکھا ہے:

''انتخابی نتائج کا بغور جائزہ بہت سارے معاملات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ صدر لغاری لاکھ تردید کریں لیکن وہ زیادہ دیر تک اس حقیقت کو چھپا نہیں سکیں گے کہ مسلم لیگ کی متوقع 90 سے 95 نشستوں سے زیادہ نشستیں اسے اس منصوبہ کے تحت ملی ہیں جس کے مطابق اسے 85 سے 90 سیٹیں دینا مقصود تھا۔ ایوانِ صدر کے منصوبہ پر عمل کرنے والوں نے مقررہ نشستوں پر ہاتھ دکھایا تو صورتِ حال خود ان کے لیے غیر متوقع نکلی۔ اب وہ حیران ہیں کہ یہ سب کیسے ہوا۔ حسین حقانی کی حیرت بھی قابلِ فہم ہے کہ 1997ء کے انتخابات میں پاکستان کی تاریخ میں سب سے کم ووٹ پڑے لیکن ووٹنگ کی شرح کم رہنے کے باوجود قومی تاریخ کا سب سے بڑا پارلیمانی مینڈیٹ وجود میں آیا۔ اس صورتِ حال سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت انتخابی عمل کے ذریعے اپنی زندگیوں میں کسی مثبت تبدیلی کا خواب دیکھنا چھوڑ چکی ہے۔''

(صفحہ 460)

اسی طرح معروف مصنف منیر احمد اپنی کتاب ''پرویز مشرف --- فوجی آمریت سے جمہوریت تک'' میں لکھتے ہیں:

''10 اکتوبر 2002ء کو ہونے والے عام انتخابات سے پہلے سابق صدر پرویز مشرف نے نہ صرف بے نظیر بھٹو کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی اور نواز شریف کی سیاسی جماعت پاکستان مسلم لیگ (ن) کے خلاف ایک نیا سیاسی گروپ قائم کیا بلکہ انہوں نے ہر اس سطح پر اپنے جماعتی سیاست دانوں کی کامیابی کو یقینی بنانے کی کوشش بھی کی جہاں انہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلے میں انہوں نے الیکشن کمیشن کے سربراہ کے طور پر ایک ریٹائرڈ جج جسٹس ارشاد حسن خان کا بطور چیف الیکشن کمشنر تقرر کیا جو متنازع شخصیت تھے اور ان کی پرویز مشرف کے ساتھ وفاداری ہر طرح کے شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ لیکن یہ معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں تھا بلکہ حکومت نے خفیہ اداروں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی مدد سے PML(Q) کے مدمقابل موجود ممکنہ امیدواروں کے بارے میں کوائف حاصل کیے اور ان میں جو مشکوک کردار کا حامل تھا، اسے مقدمات سے ڈرا کر اسے PML(Q) کے پلیٹ فارم پر پہنچا دیا گیا۔''

دراصل ہمارے ہاں انتخابات کے دوران اور الیکشن شیڈول کے آنے کے بعد بھی مرکزی اور صوبائی حکومتیں براہِ راست نظام میں مداخلت کرتی ہیں، جن میں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں کا اعلان، سرکاری افسران کی اپنی مرضی اور منشا کے مطابق تقرریاں، ترقیاتی فنڈز کا اجرا، حلقہ بندیوں کا تعین، بیوروکریسی اور عدالتی نظام میں اکھاڑ پچھاڑ شامل ہیں۔ اس سارے کھیل میں الیکشن کمیشن بے بس ہوتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھنے اور غیر قانونی اقدامات کے باوجود مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں تک کہ حکومت اور ریاست میں شامل بڑے افراد اپنے مخصوص حلقوں میں انتخابی عملہ تک تو خود تعینات کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں الیکشن کا عمل مذاق نہیں تو اور کیا بنے گا اور لوگ کیوں اس پر اعتبار کریں گے۔ الیکشن کمیشن کے ضابطۂ اخلاق میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ کوئی سرکاری فرد انتخابی مہم میں حصہ نہیں لے سکتا اور ترقیاتی کاموں اور اس کے منصوبوں کا اعلان تو دُور کی بات ہے۔ اسی تناظر میں حکومت کا کوئی بھی فرد سرکاری وسائل اور اپنے اختیارات کا استعمال کرے گا تو وہ بھی غیر قانونی ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر ملک کا وزیراعظم بھی اپنے منصب کو غیر قانونی طور پر انتخابات کے تناظر میں استعمال کرے گا تو اس کے خلاف بھی کارروائی ہو سکتی ہے اور الیکشن کمیشن وزیراعظم کو اظہار وجوہ کا نوٹس بھی جاری کر سکتا ہے۔ اگر وزیراعظم اس نوٹس کی وضاحت نہ کر سکے تو اس معاملے میں وہ نااہل بھی قرار دیے جا سکتے ہیں کیوں کہ یہ الزامات کرپشن کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس معاملے کی سنگینی کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں نگران حکومتیں ہوں یا منتخب حکومت کے دور میں ہوئے ضمنی انتخابات کی کہانی ہو، ان میں آپ کو وزیراعظم، صدر، وزرا اور دیگر حکومتی مشیروں سمیت سرکاری اہلکاروں کی بھرمار نظر آتی ہے جو ان انتخابات میں کھلم کھلا اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ تمام واقعات میڈیا کی رپورٹنگ کا حصہ بنتے ہیں اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر انتخابات کو مانیٹر کرنے والے اداروں کی رپورٹس بھی ان واقعات کی نشاندہی مع ثبوت سب کے سامنے فراہم کرتی ہیں۔ الیکشن کمیشن میں اس پر باقاعدہ رپورٹس داخل ہوتی ہیں اور کئی کئی ماہ گزرنے کے باوجود کمیشن کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی الیکشن کمیشن کے سامنے ایک بڑا معاملہ ارکان اسمبلی کی جعلی ڈگریوں کا ہے اور اس پر بھی کمیشن 2002ء کے انتخابات سے لے کر اب تک خاموش رہا ہے۔ انتخابات 2002ء میں بہت سے لوگوں نے عدالتوں اور کمیشن کے سامنے ارکان اسمبلی کی جعلی ڈگریوں پر درخواستیں دائر کیں۔ اسمبلی کی مدت پوری ہو گئی لیکن کچھ بھی نہیں ہو سکا کیوں کہ کمیشن اس وقت کے فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف کے سامنے بے بس تھا۔ اسی طرح 2008ء کے انتخابات کے بعد جب ملک میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوبارہ جعلی ڈگریوں کا معاملہ سامنے آیا، تو اب تک حکومت کی مدت کو ڈھائی سال گزر گئے ہیں لیکن معاملے کا ابھی تک مکمل طور پر حل نہیں ہو سکا۔

دراصل یہ سب کچھ وہیں ہو سکتا ہے جہاں ہماری طرز حکمرانی جمہوری بھی ہو اور شفافیت پر مبنی بھی لیکن جہاں جمہوریت محض ایک تماشا ہو اور ادارے افراد کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوں تو وہاں حکومت کی شفافیت کا سوال بہت دُور چلا جاتا ہے۔ سابق دور میں فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف بطور صدر پورے ملک کے دورے کرتے رہے، انتخابی جلسوں سے خطاب کرتے رہے اور ترقیاتی منصوبوں کا بڑھ چڑھ کر اعلان کرتے رہے لیکن کمیشن نے اس سارے معاملے میں آنکھیں بند کیے رکھیں۔ جنرل مشرف نے اپنی کتاب ''ان دی لائن آف فائر'' میں اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے 2002ء میں جمہوریت کی بحالی سے قبل اپنی مرضی کی سیاسی جماعت بنائی تاکہ اپنی مرضی کے نتائج حاصل کریں اور اپنے اقتدار کو مضبوط کر سکیں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، ''جب ملٹری سیکریٹری طارق عزیز نے چوہدریوں کا مجھ سے تعارف کروایا تو میں نے ان سے دوبارہ مسلم لیگ کو منظم کرنے میں پیش رفت کے لیے کہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ انہوں نے میرے مؤقف سے مکمل اتفاق کیا اور عوامی سطح پر اس کو منظم کرنے میں کافی پرجوشی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے دوبارہ مسلم لیگ میں جان ڈال دی اور نواز شریف کی مسلم لیگ کے بیشتر ارکان نے چوہدری شجاعت کی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگ میری تائید اور حمایت کی وجہ سے چوہدری شجاعت کی پارٹی میں شامل ہوئے۔'' یہ اعتراف فوج کے سربراہ کا ہے، اس کے بعد آپ کو انتخابات کی شفافیت کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ایک عام خیال لوگوں کے ذہنوں میں یہ ہے کہ 2008ء کے انتخابات بہت شفاف تھے اور اس میں مسلم لیگ (ق) کی جو شکست اور حکومت مخالف جماعتوں کی جو جیت ہے، وہ شفاف تھی۔ دراصل ہمارے لوگ بھول جاتے ہیں کہ 2008ء کے انتخابات کا ایک بین الاقوامی پس منظر بھی تھا۔ بے نظیر جیسے سب زندہ تھیں اور ایک مجوزہ ڈیل کے تحت واپس آئیں تو خیال تھا کہ ان انتخابات میں مسلم لیگ (ق) و پیپلز پارٹی کامیابی حاصل کر کے ایک مخلوط حکومت بنائیں گی۔ اسی ڈیل کے تحت بے نظیر نے انتخابات کے بعد واپس آنا تھا اور اس کا اعتراف جنرل پرویز مشرف نے یکم اکتوبر 2010ء کو اپنی نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کا اعلان کرتے ہوئے لندن میں کیا۔ لیکن چوں کہ بے نظیر انتخابات سے پہلے تشریف لائیں اور مجوزہ ڈیل کی خلاف ورزی کی تو مجبوراً جنرل پرویز مشرف کو نواز شریف کے معاملے میں بھی سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ان کے لیے انتخابات سے قبل واپسی کا راستہ ہموار کیا گیا۔ انتخابات سے پہلے بے نظیر جیسے اور نواز شریف کی آمد نے جنرل مشرف اور خود مسلم لیگ (ق) کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ بے نظیر جیسے قتل کے بعد جو منظر نامہ بنا، اس میں پہلے سے طے شدہ اور تیار شدہ ساری انتخابی صورت حال تبدیل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا پڑا کیوں کہ بے نظیر کے بعد مسلم لیگ (ق) کا واضح اکثریت سے انتخاب جیتنا مشکل ہو گیا تھا۔ ر انتخابات کی کریڈیبلٹی اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد معاملات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اکثریت پیپلز پارٹی کو ملے۔ اس کے باوجود جو منظر نامہ بنایا گیا، اس میں مخلوط حکومت کی تشکیل شامل تھی۔ نواز شریف کی واپسی نے بھی مسلم لیگ (ن) کو نئی طاقت دی اور اسے خلافِ توقع کامیابی بھی ملی۔ مسلم لیگ (ق) جس کے لیے یہ سارا اسٹیج سجایا گیا تھا اس کو بھی اس حد تک ضرور حصہ ملا کہ وہ پارلیمنٹ کا باعزت حصہ بن سکے۔ میرے اپنے خیال میں مسلم لیگ (ق) کے جو بڑے نام انتخابات میں شکست کھا گئے، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان بڑے ناموں کی شکست سے انتخابات کی شفافیت کے تاثر کو برقرار رکھا جا سکا۔

فوجی دور کے بعد جب جمہوریت کا دور آیا تو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے بھی وہی طرزِ عمل اختیار کیا ہوا ہے جو فوجی آمر کا تھا۔ وہ بڑی شان و شوکت سے انتخابی جلسوں میں جاتے ہیں اور کھل کر اپنے امیدوار کی حمایت کے ساتھ ساری سرکاری مشینری کا بے دریغ استعمال بھی کیا جاتا ہے اور بے تحاشا ترقیاتی فنڈ کا اعلان کر کے الیکشن کے ضابطۂ اخلاق کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے تو اپنے بھائی مجتبیٰ گیلانی کی انتخابی مہم میں بھی جو کچھ کیا، وہ سب انتخابات کو مانیٹر کرنے والے اداروں کی رپورٹس میں شامل ہے۔ یہ سارا طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ ہم کس حد تک جمہوریت اور جمہوری اداروں پر یقین رکھتے ہیں۔ اصل بحران یہ ہے کہ الیکشن کمیشن کا ادارہ کیوں کر آزاد ہو اور وہ تمام پس پردہ قوتیں، جو یہاں پر ہونے والے انتخابات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اپنی مرضی اور منشا کے نتائج چاہتی ہیں وہ کیوں چاہیں گی کہ یہاں ادارے آزاد ہوں۔

جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے انتخابات میں سرکاری ایجنسیاں وسیع پیمانے پر ملوث ہوتی ہیں تو پھر اس طرز کے اداروں کی آزادی کا سوال کہاں رہ جاتا ہے۔ معاملہ محض ریاست کے اداروں کی مداخلت ہی کا نہیں، آپ دیکھیں کہ پورے انتخابی نظام میں ہمیں الیکشن کمیشن بے بس نظر آتا ہے۔ الیکشن میں امیدواروں کی جانب سے کھلم کھلا ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزیاں، بے تحاشا اخراجات، ہورڈنگز کا بے جا استعمال، ٹرانسپورٹ، دھونس اور دھاندلی جیسے معاملات پر بھی الیکشن کمیشن کوئی زیادہ موثر نظر نہیں آتا۔ جو ادارہ اپنے ہی بنائے ہوئے ضابطۂ اخلاق پر عمل درآمد کروانے کی صلاحیت سے محروم ہے اور اس تناظر میں وہ آزاد ہی نہیں کہ اس پر عمل درآمد کرا سکے تو پھر انتخابات کا معاملہ لازماً کرپشن اور بددیانتی کی نظر ہو جاتا ہے۔ معاملہ محض ریاست اور اس کے اداروں کا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اور بالخصوص بڑی جماعتیں جو اقتدار اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا حصہ ہیں وہ بھی نہیں چاہتیں کہ یہاں الیکشن کمیشن آزاد ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری حکومتوں میں جب یہ جماعتیں برسر اقتدار آئیں تو انہوں نے کمیشن کو کیوں آزاد نہیں کیا۔ اسی طرح ہمیں ...

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الیکشن کمیشن کی آزادی کو کسی بڑی سیاسی تنہائی میں نہیں دیکھنا چاہیے کیوں کہ جب پورے کا پورا سیاسی نظام پس پردہ قوتوں اور مافیا کے ہاتھوں قید ہے تو محض الیکشن کمیشن پر ہی تنقید کیوں۔ پاکستان تو اس وقت ایک مشکل ادارہ جاتی بحران سے گزر رہا ہے، جہاں تمام ادارے ابتری کا منظر پیش کر رہے ہیں اور اس میں الیکشن کمیشن بھی شامل ہے۔

معروف دانشور صفدر صدیقی اپنی کتاب ''پاکستان کی تعمیر نو'' میں انتخابات کی شفافیت اور اس کی اہمیت کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک سب سے اہم مسئلہ جس پر دوسرے تمام مسائل کا حل اور ملک کی ترقی کا انحصار ہے، وہ انتخابات کا یقینی طور پر آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانب دارانہ انعقاد ہے۔ ہماری سیاست اور انتظام حکومت میں جو خرابیاں در آئی ہیں، وہ انتخابات کو منصفانہ بنانے میں ہماری ناکامی کی وجہ سے ہیں اور ہمارے ملک کی بقا کا انحصار بھی منصفانہ انتخابات پر ہے۔'' (صفحہ 218)

صفدر صدیقی کی یہ بات بجا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا اور کون کرے گا کیوں کہ یہاں جو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، اس میں یہ کام بغیر کسی سیاسی کمٹمنٹ کے ممکن نہیں۔ محض ریاست اور حکومت ہی منصفانہ انتخابات میں رکاوٹ نہیں بلکہ یہاں سیاسی جماعتوں کے جو رویے ہیں اور ان میں موجود غیر جمہوری اور آمرانہ مسائل خود بھی منصفانہ انتخابات میں رکاوٹ ہیں۔ محلوں، گلیوں کی سطح پر ڈیرے، جاگیردار اور مافیا پر مبنی عناصر عام لوگوں کو یرغمال بنا کر، دھونس اور لالچ دے کر، پیسے کی تقسیم کے ذریعے پورے انتخابی نظام کو اپنے مفادات کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ ووٹرز کو بھی اس بات سے بری نہیں اور نہ ہی پارٹیوں کے ورکروں کو، وہ خود بھی انتخابی نظام میں کھل کر دھاندلی کرتے ہیں اور جہاں ان کو موقع ملتا ہے وہ انتظامی اور سیاسی و سماجی طاقت کی بنیاد پر انتخابات کو شفاف بنانے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اور ان کی قیادت، شناختی کارڈز کو اپنی اپنی تحویل میں لے کر خود لوگوں کے بجائے ووٹ کاسٹ کرتی ہیں اور پورے کے پورے انتخابی عمل کو مقامی طاقت کی مدد سے یرغمال بنا لیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں تبدیلی کے لیے جب تک ٹھوس اقدامات عمل میں نہیں لائے جائیں گے، اس وقت تک حالات میں بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں محروم طبقے کی سیاست اور اس کی ناکامی

پاکستان میں محروم طبقے کی سیاست ہمیشہ سے ایک سوالیہ نشان کے طور پر موجود رہی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مخصوص طبقہ کی سیاست کو ہمیشہ بالادستی رہی ہے۔ اگرچہ ہماری سیاسی قیادت اور جماعتیں محروم طبقے کی باتیں سب سے زیادہ کرتی ہیں لیکن یہی طبقہ ان کی سیاست میں نظرانداز بھی ہوتا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ملک میں طبقاتی تقسیم جو پہلے سے موجود تھی، اب اور بھی واضح ہو چکی ہے اور ریاست، حکومت کی مختلف پالیسیوں نے اس خلیج کو کافی گہرا کیا ہے۔ حکومت کے پیش کردہ اعداد و شمار کو دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ہم کس تیزی سے ترقی کی منازل سے دور ہوتے جا رہے ہیں، محض ایک ہی طبقہ ترقی اور خوش حالی کے عمل میں نظر آئے گا جو پہلے بھی بالادست تھا اور اب اُسے اور بھی زیادہ بالادست بنایا جا رہا ہے۔ اس طرزِ عمل نے معاشرے کے اندر غریب اور محروم طبقوں جن میں مڈل اور لوئر مڈل کلاس طبقہ شامل ہے، میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ وہ ریاست اور حکومت کے لیے غیراہم ہیں اور وہ ان کی ترجیحات کا حصہ نہیں ہیں۔

پاکستان کا ترقیاتی منظر نامہ دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ ہم ابھی تک زندہ رہنے کے لیے ضروری ڈھانچے سے بھی محروم ہیں اور عام آدمی کو تعلیم، روزگار، نقل و حمل کی سہولیات، سیکیورٹی، علاج معالجے کی سہولیات، سر چھپانے جیسی بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں ہیں۔ پاکستان کا ترقیاتی ماڈل شہری ترقی پر کھڑا ہے اور دیہی ترقی ہماری ترجیحات کا حصہ نہیں جب کہ شہروں میں بھی ہم نے صرف چند بڑے شہروں پر توجہ دی ہے۔ باقی تمام اضلاع میں شہری علاقے اور اس کے مکین تا حال ابتری کی زندگی گزار رہے ہیں کیوں کہ عام لوگ ہماری حکومتوں کی ترجیحات کا حصہ نہیں۔ اسی لیے وہ اُن کے مسائل سے زیادہ ان لوگوں کے معاملات پر توجہ دیتے ہیں جن سے ہمارے براہِ راست مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں حکومت کیوں کہ عام آدمی کی نہیں ہوتی اور اس کے مقابلے میں پس پردہ قوتیں اور کچھ بالادست طبقات حکومت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اس لیے حکومت میں شامل افراد کمزور اور محروم طبقوں کی سیاست کو اپنے ایجنڈے کا حصہ بنانے کو تیار نہیں ہوتے۔ کمزور طبقوں کی سیاست اسی صورت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مضبوط ہوسکتی تھی جب عام افراد ہماری سیاست میں کلیدی حیثیت رکھتے اور سیاسی جماعتوں کو اس امر کا ادراک ہوتا کہ اصل میں عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں اور انہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح ہمارے سیاسی رہنماؤں اور جماعتوں کا رویہ یقیناً عوام کے حق میں ہوتا لیکن چوں کہ ایسا نہیں ہے لہٰذا سارا خمیازہ اور محرومی کی سزا یہاں موجود محروم طبقات کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔ محروم طبقہ ریاست اور حکمرانوں کے طرزِ عمل کے باعث مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور اس محرومی کے باعث اس کی زندگی مختلف طرز کی مشکلات کا شکار رہتی ہے۔ یہ طبقہ عمومی طور پر حکومت اور معاشرے سے اُمیدیں وابستہ کرتا ہے۔ اس کی پہلی اُمید ریاست اور حکمران طبقات ہوتے ہیں اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ ریاست اس کے بنیادی حقوق پورے کرنے کی ضمانت دے گی بلکہ اس کے لیے عملی کوشش بھی کرے گی۔ اس کی دوسری بڑی امید معاشرے کے اس بڑے طبقے سے وابستہ ہوتی ہے، جو ایک طرف تبدیلی کے ایجنڈے پر کام کرتا ہے تو دوسری طرف اس کے ایجنڈے میں محروم طبقوں کی سیاست ہوتی ہے۔ اس میں محض سیاسی جماعتیں ہی نہیں بلکہ معاشرے کے دیگر طبقات بھی شامل ہوتے ہیں، جو عموماً ریاست اور حکومت پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ ریاست اور حکمرانوں کی کوتاہی کے باوجود یہ طبقہ حقوق کی جدوجہد میں عملاً اس کے ساتھ کھڑا ہوگا لیکن اس میں بھی مایوسی کے شکار عوامی طبقے کو کئی حوالوں سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ طبقہ جس سے مایوس طبقے کو اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں بھی طاقت کے مراکز کی سیاست کا حصہ بن کر ان لوگوں کی ترجیحات کو یکسر نظرانداز کردیتا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرے میں موجود ان محروم طبقوں کی سیاست اور ان کے حقوق دونوں اطراف سے یعنی ریاست وحکومت اور سیاسی جماعتوں اور سیاسی اشرافیہ کی طاقت کے حصول کی سیاست کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ کمزور طبقات جو پہلے ہی کمزور ہوتے ہیں، انہیں اور زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان کے سیاسی معاملات پر نظر ڈالیں تو یہ عملاً power pocket کی سیاست کے گرد گھومتے ہیں اور یہاں جو بھی فیصلے ہوتے ہیں، وہ اسی طاقت کے مراکز کے گرد گھومتے ہیں کیوں کہ کمزور طبقات زیادہ منظم نہیں ہوتے اور ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دُور دراز علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا غیر منظم ہونا ان کی سیاست کو بھی کمزور کرتا ہے۔ اب تو شہروں میں رہنے والے مڈل اور لوئر مڈل کلاس طبقہ بھی تیزی سے بری گورننس کا شکار ہوکر اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتا ہے۔ ریاست اور حکومت نے جس طرح اس معاشرے میں اپنی بنیادی ذمہ داری سے علیحدہ ہوکر بنیادی معاملات میں نج کاری کے عمل کو فروغ دیا ہے، اس کا براہِ راست اثر کمزور طبقوں پر ہوا ہے۔ اب لوگوں کا بنیادی حق یعنی اچھی تعلیم اور اچھی صحت کا حصول سب کے لیے ممکن نہیں رہا اور جو لوگ وسائل رکھتے ہیں وہ تو ان کے حصول کو ممکن بنا سکتے ہیں لیکن کمزور طبقوں کے پاس اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان معاملات میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سمجھوتوں کی سیاست کا شکار ہوں اور اچھی تعلیم و صحت کو بھول جائیں۔ جب یہاں کمزور طبقوں کی سیاست کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد ان کی زندگیوں میں بہت بڑی خوش حالی نہیں بلکہ انہیں زندہ رہنے کے لیے جن بنیادی ضرورتوں کی احتیاج ہوتی ہے، انہیں پورا کرنے کی بات کی جاتی ہے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ یہاں ان کمزور طبقات کو وہ بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں، جو ان کا اوّلین حق ہے اور ریاست، حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں اور دانشور طبقہ بدلتے ہوئے سیاسی تقاضوں میں طبقاتی سیاست اور طبقاتی مسائل کو یکسر نظر انداز کر رہا ہے۔ بعض اوقات، ان کی سیاست میں اس سے وابستہ نعرے ضرور سنائی دیتے ہیں لیکن وہ بھی انتخابات کی سیاست تک محدود ہوتے ہیں، عملاً ان کی سوچ اور پالیسیوں میں اب طبقاتی سیاست کا نعرہ کہیں کھو گیا ہے۔ طبقاتی سیاست کی خلیج اس قدر گہری ہو گئی ہے جس سے لوگوں میں یہ احساس اُجاگر ہوا ہے کہ ریاست، حکومت اور معاشرہ مخصوص لوگوں کا ہے اور صرف ان کی خوش حالی ہی ان کے ایجنڈے کا اہم حصہ ہے۔

یہ نہیں کہ یہاں کمزور طبقات سیاسی اور سماجی جدوجہد کے لیے تیار نہیں، اگر آپ ماضی کی سیاست اور اس سے وابستہ سیاسی تحریکوں پر نظر ڈالیں تو اس میں کمزور طبقات پیش پیش تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں تو روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ ہی ان کمزور طبقات کی سیاست کا اہم نعرہ تھا۔ پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کی سیاست کی فکر کے گرد جو لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہوا، اس میں بالا دست طبقہ کے لوگ کم اور شہری علاقوں میں موجود کمزور یا متوسط طبقات زیادہ تھے۔ اسی طرح ایم کیو ایم نے جب کراچی سے اپنی سیاست کا آغاز کیا تو ان کے گرد بھی جو لوگ جمع ہوئے، وہ کراچی کا لوئر اور مڈل کلاس طبقہ تھا، جو سمجھتا تھا کہ ان کے حقوق غصب ہو رہے ہیں اور انہیں اپنی سیاست کو مضبوط کرنا ہے۔ اسی طرح اگر آپ تمام سیاسی جماعتوں کی جانب دیکھیں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ یہ کمزور طبقات کسی نہ کسی شکل میں سیاسی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادت سے توقعات وابستہ کر کے سامنے آئے۔ انہی کمزور طبقات میں ایسے ہزاروں سیاسی کارکن موجود تھے جنہوں نے اس سیاسی جدوجہد میں بے شمار قربانیاں بھی دیں جس میں جیلوں کی قید، تشدد، ہاتھا پائی اور اپنی جان کی قربانیاں دینے جیسے عوامل بھی شامل تھے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ان کمزور طبقات کو وہ کچھ نہیں مل سکا، جو ان کا بنیادی حق تھا۔ اس ناکامی کا اصل ذمہ دار کون ہے؟

آج اس معاشرے میں کروڑوں لوگ ریاست اور حکومت کی بے حسی کے باعث تعلیم، صحت، روزگار، سیکیورٹی اور خوراک جیسے بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔ آپ کو اس معاشرے میں مختلف صوبوں، علاقوں، دیہاتوں اور شہروں میں زندہ رہنے کے لیے جو بنیادی ڈھانچا نظر نہیں آتا، اس کی ذمہ داری کون لے گا؟ اس ملک میں لاکھوں خواتین طبی سہولیات اور بنیادی صحت کے مراکز نہ ہونے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باعث دورانِ زچگی ہلاک ہو جاتی ہیں۔ ہسپتال اور تعلیمی اداروں کا فقدان اور اس میں موجود تعلیمی سہولیات کا نہ ہونا اور لوگوں کی تعلیم اور صحت تک رسائی کے کم مواقع ایسے سنگین مسائل ہیں جن پر ہم ابھی تک آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ یہاں روزگار کے مواقع بڑی تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں اور معاشی بدحالی کا جو خطرناک منہ سامنے آ رہا ہے، اس میں لوگ اب زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بحران کی وجہ سے اس معاشرے میں خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں سے مراد یہ ہے، ایسے عناصر جنہیں زندہ رہنے کے لیے اُن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے جن میں علاج اور خوراک جیسے امور پیش پیش ہیں اور وہ بھی انہیں بری گورننس کے باعث میسر نہیں۔

یہاں جب یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ اس بحران کی وجہ یہ ہے کہ یہ کمزور طبقات منظم نہیں، لہٰذا حقوق کے حصول کے لیے ہونے والی جدوجہد میں انہیں بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا قصور ان کمزور طبقات کا ہے یا ان لوگوں اور گروہوں کا ہے جو اس ملک میں کمزور طبقوں کی سیاست کے اصل دعوے دار ہیں۔ بیشتر کمزور طبقات تو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی معاشی جدوجہد میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اگر وہ محض اس طرز کی جدوجہد کا حصہ بن جائیں تو پھر ان کی زندگیوں میں اس سے بھی زیادہ معاشی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ کام سیاسی طبقات اور اہلِ دانش کا ہوتا ہے کہ وہ ریاست اور حکمران طبقے پر دباؤ ڈال کر ان کی اصل نمائندگی کا حق ادا کریں۔ اگر ان کمزور طبقات کو محسوس ہوا کہ کچھ لوگ ان کے حقوق کے لیے کوشاں ہیں تو وہ ضرور ان کی تحریکوں کا حصہ بن سکتے ہیں لیکن چوں کہ ہم اعتمادسازی کے شدید بحران کا شکار ہیں، لہٰذا کوئی یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ جو لوگ یہاں سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں، وہ ان کے حقیقی نمائندے یا قیادتیں ہیں۔ اگر کمزور طبقات یہاں منظم نہیں ہو سکے اور انہیں سیاسی طاقت نہیں مل سکی تو اس کی اصل ذمہ داری جہاں ریاست اور حکومت پر عائد ہوتی ہے، وہیں سیاسی جماعتیں بھی برابر کی قصوروار ہیں، جو ان کمزور طبقوں کو چھوڑ کو پس پردہ قوتوں کی سیاست کا شکار ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں معاشرے کے کمزور محروم طبقات کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے بالادست طبقہ انہیں یہی درس دیتا ہے کہ یہ سب کچھ جو ان کے ساتھ ہو رہا ہے اس میں خدا کی مرضی شامل ہے۔ یعنی تم پر جو بھی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں یا تم جن محرومیوں کا شکار ہو، ان کی وجہ ہم نہیں، تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے بعض مذہبی رہنما بھی اپنے درس و وعظ میں ان کمزور طبقوں کو یہی پیغام دے رہے ہوتے ہیں کہ خدا تم سے ناراض ہے اور تم اس کے لیے توبہ کا راستہ اختیار کرو تاکہ تمہاری حالت زار تبدیل ہو جائے۔ ہم بڑی ہوشیاری سے افراد کے بنائے ہوئے ظالمانہ نظام اور سسٹم کی ناکامی کو خدا پر ڈال کر نعوذ باللہ اسی کو ظالم ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہ بالادست طبقے، اہلِ دانش اور مذہبی رہنما

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کو منظم کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں اصل حقائق سے آگاہ کرتے ہیں کہ تم پر جو مصیبت نازل ہو رہی ہے اس کے اصل ذمہ دار حکمران ہیں، جو ان کے لیے زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں اصل حقائق سے آگاہ کرتے ہیں کہ ان کے اصل مجرم کون ہیں اور ان کا مقابلہ کیے بغیر ہماری زندگیوں میں خوش حالی نہیں آسکتی۔ اس نتیجے میں ایسے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں جو ہمیں ایک نیا سیاسی راستہ تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ہم جب تک طرزِ حکمرانی کے مسائل اور سسٹم کی ناکامی کا تجزیہ نہیں کریں گے، ہمارے حالات جوں کے توں ہی رہیں گے اور ہم بلاوجہ خدا کی قدرت کو اس صورتِ حال کا ذمہ دار قرار دے کر ان ظالم افراد اور اداروں کو تقویت دیں گے، جو ہمارے سب سے بڑے مجرم ہیں۔

ہم اگر اس ملک میں وسائل کی تقسیم اور انہیں مختلف طبقوں کو مختص کرنے کے نظام کا ہی جائزہ لے لیں تو ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ کمزور طبقوں کی سیاست اور اُن کی ترجیحات ان بالادست طبقوں کی نظر میں کیا ہیں۔ وسائل کی تقسیم کا معاملہ اس ظالمانہ حد تک غیر منصفانہ ہے کہ اس میں کمزور طبقوں کو کہیں بھی شامل نہیں کیا جاتا بلکہ ایسے طبقوں کو نوازا جاتا ہے جو پہلے ہی سے کافی حد تک خوش حال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ شعبۂ تعلیم کو ہی دیکھ لیں تو ہر وزیرِ اعظم، صدر اور گورنر سمیت وزرا اور مشیروں کی فوج آپ کے شہر میں موجود بڑے بڑے تعلیمی اداروں میں جا کر اور گاؤن پہن کر ڈگریاں بانٹتی ہے لیکن کبھی کسی نے ان تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کا نوٹس نہیں لیا۔ سوال یہ ہے کیا کبھی ان بالادست طبقوں نے ان تعلیمی اداروں کو جو شدید خستہ حالت اور بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں، فنڈ جاری کیے تو آپ کو اس کا جواب نفی میں ملے گا، یقین نہ آئے تو سرکاری تعلیمی اداروں کا خود معائنہ کر لیں اگر ایسا ہوتا تو آج اس ملک میں تعلیمی اداروں کا ڈھانچا ایسا خوف ناک نہ ہوتا۔ ضلعوں اور تحصیلوں میں موجود سرکاری ہسپتالوں کو دیکھ لیں تو وہاں مریضوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے اور علاج معالجے کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں، پورے ضلعی ہیڈ کوارٹر اور تحصیل ہیڈ کوارٹر میں ایک ہسپتال ہوتا ہے اور جہاں مریضوں کو ڈاکٹروں اور علاج کے حصول کے لیے گھنٹوں خجل خوار ہونا پڑتا ہے۔ نقل و حمل کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں اور پبلک ٹرانسپورٹ کا معاملہ تو تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے، اس کے مقابلے میں آپ بالادست طبقوں کے مجموعی کردار پر نظر ڈالیں تو آپ کو چاروں اطراف میں شاہانہ معاملات نظر آئیں گے۔ یہ لوگ تعلیم اور علاج کی سہولتوں کے لیے اپنے ملک پر انحصار نہیں کرتے بلکہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر بیرونِ ملک علاج کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایوانِ صدر، وزیرِ اعظم، گورنر ہاؤسز، ایوان ہائے وزیرِ اعلیٰ سمیت بیوروکریسی کے رہن سہن دیکھیں اور وہ بھی سرکاری وسائل پر تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس طرح کے بڑے بڑے تضادات کا شکار ہیں۔ ہمارا غیر ترقیاتی اخراجات کا معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ اس میں کمزور طبقوں کے وسائل کو کم کر کے بالادست طبقوں کے معاملات کو فوقیت دی جاتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہاں موجود کمزور طبقات اسی شکل میں رہیں گے اور کیا ان کی تعداد میں یونہی مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا؟ اگر ایسا ہوا تو اس کا حل کیا ہے اور کیسے یہاں کمزور طبقوں کی سیاست مضبوط ہوگی۔ اصل میں کمزور طبقوں کی سیاست میں بڑا معاملہ ریاست اور حکومت کی بنیادی کمٹمنٹ کی کمی اور ترجیحات کے نہ ہونے کا ہے کیوں کہ اگر ریاست اور حکومت اپنی کمٹمنٹ دکھائے تو یقیناً اس کا براہ راست اثر ان کمزور طبقوں کے حقوق اور اُن کے حصول پر ہوگا۔ لیکن یہ کام ایسے نہیں ہوگا کیوں کہ اس کے لیے معاشرے اور اس میں موجود طبقات کے اندر ہر سطح پر سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس میں اہم کردار سیاسی جماعتوں اور اہل دانش کا ہے، جو اپنی حکمت عملی کے تحت ریاست اور حکومت پر دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کر سکتی ہیں کہ وہ اپنے طور طریقوں کو اس انداز میں بدلیں کہ اس کا مثبت اثر ان کمزور طبقوں کی سیاست پر پڑے۔ لیکن یہ کہنا بھی کافی نہیں کہ سیاسی جماعتیں اس میں بنیادی کردار ادا کر سکتی ہیں بلکہ ان سیاسی جماعتوں کے اندر بھی بڑی اصلاحات کی ضرورت ہے اور ان کا موجود طریقہ کمزور طبقوں کی سیاست کے برعکس ہے۔ ان کمزور طبقوں کو بھی سمجھنا ہوگا کہ کوئی انہیں آگے بڑھ کر حقوق نہیں دے گا جب تک وہ خود ان معاملات پر آواز نہیں اُٹھائیں گے۔ اگر وہ واقعی اپنی سیاست کو منظم کریں گے تو اس سے ان بالادست طبقوں اور سیاسی جماعتوں سمیت دیگر طبقوں کو اپنا رویہ بدلنے میں خاصی مدد ملے گی، بالخصوص ان کمزور طبقات کو سمجھنا ہوگا کہ ان کے اصل دشمن کون ہیں اور دوست کون کیوں کہ اس بات کی تمیز کیے بغیر وہ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دانشورانہ اور فکری کرپشن کا بخار

پاکستان میں سیاسی اشرافیہ اور عام لوگوں کی سطح پر کرپشن کی باتیں بہت کی جاتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ کرپشن پر باتیں کرنا اس قوم کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی باتیں کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے اپنے دامن کرپشن اور بدعنوانی سے پاک نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں کرپشن کا ناسور ایک تلخ حقیقت کے طور پر موجود ہے اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں کیوں کہ جب معاشرے شفافیت اور خود احتسابی کے نظام سے آزاد ہوں، تو وہاں کرپشن کا ہونا ایک معمولی بات بن جاتی ہے۔ بدقسمتی سے یہاں اب کرپشن اور مالی بدعنوانی کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی جواز پیش کیے جاتے ہیں اور سماج میں اب اس کی عملاً قبولیت بھی ہوگئی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو کہ فلاں لوگ یا فلاں شخص کرپٹ اور بدعنوان ہے تو اس کے باوجود سب ان کی سماجی حیثیت کی وجہ سے ان سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ مالی کرپشن کے اس کھیل میں ہمارے ہاں کبھی لوگوں کے ذہنوں میں دانشورانہ اور فکری سطح پر پھیلی ہوئی کرپشن پر توجہ نہیں دی گئی اور لوگوں میں غالباً اس کرپشن اور بے ضمیری کی کوئی اہمیت نہیں۔ دانشورانہ اور فکری کرپشن سے مراد یہ ہے کہ معاشرے میں اہل دانش جان بوجھ کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا ان کے فکری کھیل کا حصہ بن گیا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں بہتر تبدیلی میں اس کے اہل دانش کا سب سے زیادہ اور اہم کردار ہوتا ہے کیوں کہ وہ لوگوں کے نہ صرف شعور کو اُجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کی فکری بنیادوں پر ذہنی تشکیل اس انداز میں کرتے ہیں کہ وہ اپنے اچھے اور برے کے درمیان بہتر انداز میں تمیز کر سکیں۔ کرپشن کی یہ شکل اس وقت سامنے آتی ہے جب اہل دانش کا ایک مخصوص گروپ اپنے یا دیگر اداروں کے ہاتھوں آلے یا tool کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور لوگوں کو عملی بنیادوں پر گمراہ کرنا اس کی دانش کا سب سے اہم پہلو ہوتا ہے۔ لوگوں میں چوں کہ اس کرپشن کی کوئی خاص اہمیت نہیں اور نہ ہی لوگوں نے کبھی اس پر بہت زیادہ سوچ بچار کی ہے، لہٰذا ہمارے اس طرز عمل نے ایسے دانش وروں کو، جو اپنے علم اور صلاحیتوں کی بنیاد پر بے ضمیری کے کھیل کا حصہ بن جاتے ہیں، ہماری نظروں سے ہمیشہ اوجھل رکھا ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناصر کی کرپشن اور مالی بدعنوانی اور فکری دانش کے جعلی کردار کو سامنے لایا جاتا ہے تو ان لوگوں کے خلاف یہ نام نہاد دانش ور طبقہ ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیتا ہے۔ معاشرے میں سنجیدہ طبقہ ایسی آوازوں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے جو ان جعلی فکری لوگوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے لوگوں کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی لوگ ان نام نہاد فکری لوگوں کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ اس طرز کے اہل دانش آپ کو ریاست، حکومت اور بالا دست طبقوں کے سب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں اور یہ عوام سے زیادہ ان بالا دست طبقوں کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لوگوں پر یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ اہل دانش اس ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ان کی دانش اس معاشرے کے لیے بہت ضروری ہے جب کہ اس کے برعکس یہ کھوکھلے لوگ ہوتے ہیں اور معاشرے کی سوچ کو جان بوجھ کر گمراہ کرنا ان کی سیاسی مجبوری ہوتی ہے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ معاشرتی سطح پر اس معاملے کو مؤثر اور بلند آواز میں اٹھایا جاتا تاکہ سیاسی و سماجی، مذہبی اور صحافتی سمیت علمی شخصیات اور دیگر شعبوں کے اہل دانش کے حقیقی چہروں کو بے نقاب کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ یہ لوگ عوام کی ترجمانی کرنے کی بجائے ایک ایسے مخصوص گروپ کی ترجمانی کرتے ہیں جو عوامی مفادات کے برعکس کام کر رہے ہیں۔ آج کے اہل دانش ریاست یا حکمرانوں کے درمیان تقسیم ہیں یا پھر مختلف سیاسی گروپوں اور شخصیات سمیت بہت سے اداروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم اور صلاحیتوں سے ان لوگوں کے مفادات کے لیے کام کریں اور سماج میں ان کو بہتر بنا کر پیش کریں۔ اس کام کے عوض انہیں مختلف طریقوں سے نوازا جاتا ہے اور اب اس طبقہ کے نزدیک ان کا فکری کھیل ایک کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ایسے سماج میں، جو فکری طور انحطاط پذیر ہوں، جعلی طرز کے فکری رہنما اور اہل دانش سب سے زیادہ ہوں گے۔ آپ کو لگے گا کہ یہ ملک محض دانش وروں ہی کو پیدا کرتا ہے اور ہر کوئی اپنے آپ کو دانش ور کہلوانا پسند کرتا ہے تاکہ اس کے سماجی رتبے میں اضافہ ہو۔ ان جعلی دانشوروں نے جس انداز میں اپنے قلم، آواز، لفظوں، تقریروں اور پُراثر تحریروں کے ذریعے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے میں جس طرح اپنی ذہنی صلاحیتوں اور ذہنی و فکری توانائیوں کو خرچ کرتے ہوئے پورے معاشرے کو گمراہ کیا، اس پر وہ قومی مجرم کے زمرے میں آتے ہیں جب کہ اس کے برعکس ہماری ریاست، حکومت اور بالا دست طبقات ان جعلی دانش وروں کو اعلیٰ ترین اعزازوں سے نوازتی ہے۔ جب لوگوں کے سامنے ان جعلی دانش وروں کی حوصلہ افزائی ہوگی تو معاشرہ بھی مستقبل کے تناظر میں ایسے ہی جعلی دانش وروں کو پیدا کرے گا جو ریاست اور حکومت جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی ہو، وہاں سچائی پر مبنی دانش ور گمنامی کی زندگی گزارتا ہے اور لوگوں میں اس کی وہ پذیرائی نہیں ہوتی جس کا وہ اصل میں حق دار ہوتا ہے۔ سچائی پر مبنی اہل دانش ریاستی اور حکومتی جبر کی وجہ سے سخت معاشی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدحالی کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ ملک کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ معاشرے میں بھی ایسے سچے لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ کمزور ہیں اور ہمیں طاقت کے ساتھ کھڑے ہونا ہے۔ یہاں ایسے اہل دانش بھی ہیں جن کے ناموں کے ساتھ واضح طور پر لکھا جانا چاہیے کہ ترجمان فلاں فلاں گروپ تاکہ لوگوں کو پتا چل سکے کہ یہ لوگ اصل میں کن لوگوں کے پس پردہ رہ کر ملازمتیں کرتے ہیں۔

نام نہاد دانشوروں کا یہ کھیل آج بھی پہلے ہی کی طرح بڑی شدت کے ساتھ جاری ہے اور مختلف گروپس ان لوگوں کی سرپرستی کر کے ہمارے معاشرے کو فکری طور کمزور کر رہے ہیں۔ اس لیے اس ملک کو اصل خطرہ مالی بدعنوانیوں اور کرپشن سے نہیں بلکہ ہمارا اصل خطرہ اور مرض دانشوروں کی سطح پر موجود فکری بددیانتی کا ہے۔ مالی کرپشن کا راستہ اسی وقت روکا جا سکتا ہے جب معاشرے میں اہل دانش اپنا حقیقی کردار ادا کریں لیکن اس کے برعکس ہمارے دانشوروں کی اکثریت نے قوم کی اصل ترجمانی کرنے کی بجائے ذاتی مفادات اور خواہشات کی تکمیل کے لیے فکری بددیانتی کا راستہ اپنا لیا ہے۔ اس کے عوض انہیں ریاست اور حکومت سمیت ان بالادست طبقات سے پلاٹوں اور روپے پیسے سمیت دیگر مراعات سے نوازا جاتا ہے۔ یاد رہے جب ہم ان نام نہاد دانشوروں کی فکری بددیانتی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد واضح طور پر ان لوگوں کی نشاندہی کرنا مقصود ہے جو جان بوجھ کر اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے سچ کو چھپاتے ہیں۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے لوگوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے شعوری جھوٹ کو سچ مان کر اپنی رائے قائم کر لیتا ہے جس کا خمیازہ اس کے ساتھ ساتھ پوری قوم کو اجتماعی طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کی آگاہی'' میں شامل مضمون ''ہمیں ہیروز کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟'' میں لکھتے ہیں:

> ''سیاست دانوں، نوکر شاہی کے عہدے داروں اور قدامت پسند حلقوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہیرو کی شخصیت کو بنانے اور اس کو پُراثر انداز میں ڈھالنے کے لیے دانشوروں کی مدد حاصل کریں۔ یہ اپنی تحریروں اور پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں میں ان خیالات کو اجاگر کرتے ہیں کہ ہیرو میں عام انسانوں سے زیادہ صلاحیت و طاقت تھی، وہ غلطیوں سے پاک تھا اور اس میں حالات کو سمجھنے کا شعور تھا۔ جب کسی شخصیت کے بارے میں یہ خیالات رائج ہو جائیں تو پھر لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس کے افکار و خیالات کو بلا کسی تنقید کے تسلیم کر لیا جائے۔'' (صفحہ 47)

یہ ہے وہ کھیل جو یہاں کا بالادست طبقہ اور اہل دانش کی اکثریت کھیل رہی ہے اور ایک خاص منصوبہ کے تحت لوگوں کو گمراہ کر کے اندھیروں میں رکھا جا رہا ہے۔ بدقسمتی سے لوگوں کو اندھیرے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برقرار رکھنے کے لیے یہی اہل دانش طبقہ اپنا سہارا مخصوص مفادات کے حصول کی خاطر پیش کرتا ہے۔

ہمارے اہل دانش کا ایک اور بڑا مسئلہ شخصیت پرستی کے بخار کا بھی ہے جس میں وہ خود بھی مبتلا رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی اسی بیماری میں مبتلا کر کے انہیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتے ہیں کیوں کہ شخصیت پرستی میں مبتلا فکری طبقہ جھوٹ اور سچ کی تمیز نہیں کر سکتا۔ ان کا قلم اور دانش اپنے ہیروز کے سیاسی مخالفین کی کردار کشی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ جس بھی صورتِ حال کا تجزیہ کرتا ہے، وہ تعصب اور پسند و ناپسند کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو نواز شریف اور پیپلز پارٹی کے نام پر ایک ایسا دانشور طبقہ ملے گا جس کے نزدیک ان کی جماعت یا ہیروز ہی ملک کی بقا کے ضامن ہیں۔ یہ لوگ، جو اہل دانش کہلوانا پسند کرتے ہیں، کبھی اپنے ہیروز پر تنقید نہیں کرتے بلکہ ان کے غلط اور غیر جمہوری اقدامات کا بھی بڑی ڈھٹائی سے دفاع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں ان کے ہیروز بدل جاتے ہیں بلکہ آپ یوں کہیں کہ جو بھی طاقت اور اقتدار میں ہوتا ہے، یہ لوگ اسی کے گن گاتے ہیں اور اس کے قریب پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی سیاسی قلابازیاں سنجیدہ لوگوں میں ایک تماشے کا سماں پیدا کر دیتی ہیں۔ آپ اگر مختلف ادوار میں ان اہل دانش کے مؤقفات کو جمع کریں تو ان میں آپ کو تضادات کی ایک بھرمار ملے گی۔ معاشرے کے سنجیدہ افراد میں ان کا طرزِ عمل طرفہ تماشا ہوتا ہے لیکن ان جعلی دانش وروں کو اپنے ان رویوں اور سوچ کے تضادات پر کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ یہ ڈھٹائی کی انتہا ہے۔ نظریۂ ضرورت کا اصول جیسے ریاست اور حکمران طبقات اپناتے ہیں، اسی طرح اہل دانش بھی نظریۂ ضرورت کے اصول پر ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ مخصوص بھٹو دشمنی اور اس کی محبت میں گرفتار اہل دانش نے جس طرح خود پارٹی بن کر غیر جمہوری طرزِ عمل کا جواز پیش کیا وہ قومی سانحہ سے کم نہیں۔ اس سے نہ صرف ان دونوں بڑی قوتوں کو ملک میں سیاسی استحکام کے مقابلے میں منفی کھیل کھیلنے کا موقع ملا بلکہ ان عناصر کو بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جو سماج میں سچ اور حقائق کو پھیلانے میں مصروف عمل تھے۔ اہل دانش کی ان فکری گمراہیوں پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

ایک اور بڑا مسئلہ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں پر مشتمل دانشور طبقے کا ہے، جو ہر دور میں حکمران کے قریب پائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے خود حکمرانوں نے مختلف دانش وروں کے گروپ بنا رکھے ہیں جو ایسے افراد پر نوازشوں کی بارشیں کرتے ہیں اور نئے لوگوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اگر اہل دانش کا کھیل کھیلنا ہے تو اسی راستے کو اختیار کرو جو ان لوگوں نے اپنا رکھا ہے۔ ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ہمیں ان معاملات میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس قسم کے نام نہاد فکری طبقے کو عوامی سطح کوئی بڑی پذیرائی نہیں ملتی، اس لیے ہمیں ان عناصر کے بارے میں زیادہ فکرمندی نہیں کرنی چاہیے۔ دراصل جب دانش نایاب ہو جائے تو جعلی دانش کا کھیل عروج پر ہوتا ہے اور اس کی نام نہاد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فکری صلاحیتوں کو بہت سے جعلی گروپ بھی نوازنے میں سامنے آتے ہیں تاکہ ان کی مدد سے وہ اپنے کاروبار کو بھی وسعت دے سکیں۔ پاکستان ایسے جعلی دانشوروں کے لیے ایک سازگار زمین ہے۔ اگر آپ پچھلے تیس برسوں میں ان اہل دانش کے سرمائے، طاقت اور مراعات پر نظر ڈالیں تو یہ سوال ضرور پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ انہوں نے کیسے حاصل کر لیا اور کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ جائز طریقے سے اس قدر سرمایہ اکٹھا کر لیں تو زیادہ تر کے بارے میں اس سوال کا جواب ہمیں نفی میں ملے گا۔ اس لیے اس سوچ کے حامل لوگوں کے بارے میں ہمیں زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ عملاً غلطی پر ہیں اور سماجی اخلاقیات کے کسی معیار پر پورا نہیں اترتے ہیں۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ یہ لوگ جیسے بھی ہیں عوامی سطح پر اپنی رائے عامہ کے تناظر میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی طرف سے کہی گئی باتوں اور تحریروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس لیے اس عمل کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ قلم اور زبان کا سودا کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ وہ پوری قوم کا سودا ہوتا ہے۔ اس مرض کے پھیلاؤ کی ایک بڑی وجہ چند برسوں میں اس جعلی دانشور طبقے کا تیزی سے پھیلاؤ ہے۔ ہمارے ہاں حقیقی دانشور بہت کم ہیں لیکن ہم نے ایسے دانشور ضرور پیدا کیے ہیں جن میں دانش سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور وہ حکمرانوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے زندہ ہیں۔ تاہم اب الیکٹرانک میڈیا کے پھیلاؤ کے بعد جعلی دانشوروں کے کھیل کا بازار اور شدت کے ساتھ سامنے آیا ہے، جس پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ سے آگاہی'' میں شامل مضمون ''شخصیتیں اور افکار'' میں لکھتے ہیں:

> ''کسی بھی سماج کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں میں علم و دانش اور آگاہی ہو تاکہ وہ شخصیتوں کے سہاروں پر نہ رہیں اور اپنے فیصلے خود کر سکیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ فلاں شخصیت نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سیکولرازم اچھا ہے، اس لیے ہم سب کو سیکولر ہو جانا چاہیے یا کسی دوسرے موقع پر کہہ دیا کہ سرمایہ دارانہ نظام سب سے بہتر ہے تو ہمیں اس کی حمایت کرنی چاہیے۔ یہ طریقہ لوگوں کو پابند کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل نہیں رہتے کہ کسی فکر یا نظام کے بارے میں پوری معلومات حاصل کریں، اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ یہ ان کے لیے مفید ہے یا نہیں، یہ اسی وقت ممکن ہوگا کہ جب افکار و خیالات و نظریات اور کسی بھی نظام کو ان کی اصل بنیادوں کے مطابق سمجھیں گے۔ اس عمل کے نتیجے میں وہ جس فیصلہ پر پہنچیں گے وہ شعوری ہوگا اور اس پر معاشرہ پوری طرح سے عمل پذیر ہوگا۔'' (صفحہ 61)

معروف دانشور، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار عبدالکریم عامد نے اپنی کتاب ''پہلی بات'' میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شائع مضمون ''متوازن ذہن کیسے پیدا ہوگا؟'' میں لکھا ہے:

''زندگی کے عملی رویے اصل میں فکر ونظر کی درستی سے متعین ہوتے ہیں لیکن جہاں فکر ونظر پر مردنی طاری ہوگی وہاں ضمیر بھی مردہ ہوتے جائیں گے اور لوگوں کے مزاج بھی فاسد ہوں گے، ان میں توازن نہیں ہوگا۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلی ضروری چیز فکر ونظر کی طاقت ہے جو ہمیں دانشور فراہم کرسکتے ہیں۔'' (صفحہ 35)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مرض کا علاج کیا ہے۔ دراصل اس مرض کا علاج خود لوگوں اور بالخصوص سیاسی اشرافیہ میں موجود سنجیدہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یعنی جب خود لوگ ایسے لوگوں کا احتساب نہیں کریں گے جو فکری بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہیں تو پھر اس کو روکنا ایک مشکل مرحلہ ہو جائے گا۔ اس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس معاشرے سے فکری بددیانتی کا خاتمہ ہو تو پھر ضروری ہے کہ ہم معاشرے میں موجود فکری سطح پر پھیلی ہوئی اس بددیانتی کو ضرور بے نقاب کریں اور اس کے خلاف مضبوط مزاحمت بھی کی جانی چاہیے۔ لیکن اگر اس کے برعکس ان نام نہاد اہل دانش کا راستہ نہیں روکا گیا تو یہ معاشرے میں آج سے بھی زیادہ بگاڑ کا سبب بنیں گے اور لوگ آگے جا کر جھوٹ اور سچ کی تمیز بالکل بھول جائیں گے۔ حقیقی اہل دانش سے محروم معاشرہ آج نہیں تو کل ضرور ختم ہوگا اور یہ بدنما کردار پورے معاشرے کی تباہی کے ذمہ دار قرار دیے جائیں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول سوسائٹی کا بحران

کسی بھی ملک یا معاشرے میں جمہوریت کی کامیابی کے لیے ایک بڑا چیلنج سول سوسائٹی کا مضبوط ہونا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ملک بھی اس ضرورت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہاں گزشتہ چند برسوں سے سول سوسائٹی کا ذکر بڑی شدومد کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بالخصوص وکلا تحریک کے تناظر میں ہمارے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں سیاسی اشرافیہ نے سب سے زیادہ ذکر سول سوسائٹی کے مضبوط ہونے اور اس کے متحرک و فعال کردار کا کیا ہے۔ اہل دانش میں ہر کسی کا دعویٰ تھا کہ پاکستان ایک نئے پاکستان میں تبدیل ہو رہا ہے اور اس کی امید کا پہلو سول سوسائٹی کا ابھار ہے، یعنی سوسائٹی کے شعور میں اضافہ ہے۔ سول سوسائٹی کا لفظ یہاں پاکستان میں 1990ء کی دہائی میں استعمال ہونا شروع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا استعمال بڑھ گیا۔ ترقیاتی امور سے تعلق رکھنے والے شعبے، بالخصوص غیر ممالک سے امداد حاصل کرنے والے اداروں کی زبان سے جب یہ لفظ یہاں متعارف کروایا گیا تو لوگوں کو اسے سمجھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ عام آدمی کے لیے اس بات میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کون سول سوسائٹی کا حصہ ہے اور کون نہیں۔ کچھ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خدشات بھی موجود تھے کہ اچانک لفظ سول سوسائٹی کہاں سے آ گیا اور جن لوگوں نے اسے متعارف کروایا ہے ان کا پس پردہ ایجنڈا کیا ہے۔ یہاں اہل دانش کا ایک بڑا طبقہ جو مغرب سے مرعوبیت کا شکار ہے، اس نے یہاں سول سوسائٹی کی مضبوطی کو بہت زور دے کر پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری سول سوسائٹی ماضی کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوئی ہے۔ اس خیال کو اگر درست مان لیا جائے تب بھی ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ ہماری سول سوسائٹی اور اس کے ادارے نہ صرف بحران کا شکار ہیں بلکہ ان کو مختلف سطح پر بہت سے چیلنجز کا سامنا بھی ہے۔ ہر سطح پر مزاحمت کے پہلو کمزور اور مفادات کے حصول کی سوچ زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ ماضی میں سول سوسائٹی کے اداروں کا کردار بھی شاندار رہا ہے اور اپنے اس کردار کے باعث ان اداروں نے ریاستی اداروں میں اور مختلف اوقات میں مختلف حکمرانوں کے آمرانہ مزاج اور ذہنیت کے خلاف جدوجہد بھی کی۔ ان اداروں میں سیاسی و مذہبی جماعتیں، طلبہ یونینز، مزدور یونینز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ثقافتی تنظیمیں، نوجوانوں کی تنظیمیں، وکلا گروپس، اقلیتوں کی تنظیمیں، خواتین اور نوجوانوں کے گروپس شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں یہ ادارے نہ صرف مضبوط تھے بلکہ ریاست اور حکمران طبقات ان کی جدوجہد سے خائف بھی رہتے تھے۔ ان بالادست طبقوں پر دباؤ ہوتا تھا کہ وہ ایسی پالیسیوں سے اجتناب کریں جن پر عوامی سطح پر مزاحمت کا خطرہ ہو اور سول سوسائٹی کے یہ ادارے مزاحمت کی بنیاد پر عوام کی قیادت کریں۔

ماضی میں سماجی، سیاسی تبدیلی کے کارندوں اور اداروں کے کام میں کہیں لفظ سول سوسائٹی موجود نہیں تھا بلکہ انہیں تبدیلی کا کارندہ یا سماج کی تبدیلی کے بڑے فریق کے طور پر جانا جاتا تھا۔ تاریخی طور پر کہا جاتا ہے کہ سول سائٹی سے مراد ایسے ادارے ہیں جو ریاست اور حکمران طبقات کی حکمرانی میں موجود تضادات اور کمزوریوں پر ایک اصلاح کا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ انقلاب سے زیادہ اصلاحات کے قائل ہیں اور یہ رویہ ایک سطح پر ان بالادست طبقوں کے مفاد میں بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ دباؤ ضرور ڈالتے ہیں لیکن پہلے سے موجود سسٹم کو قبول کر کے آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان میں تبدیلی کے یہ عناصر اور ادارے محدود وسائل اور نامساعد حالات کے باوجود اپنی بھرپور آواز کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں ان طبقات نے محسوس کیا کہ لوگوں کے حقوق دبائے جا رہے ہیں یا ان کا استحصال کیا جا رہا ہے، وہاں ان اداروں کی آواز پیش پیش تھی۔ اس کی خاص وجہ تبدیلی کے ان ایجنٹوں کا متحرک اور فعال ہونا تھا اور وہ حقیقی طور پر اپنے اندر تبدیلی کی خواہش بھی رکھتے تھے اور اس کے لیے جدوجہد کو اپنے ایمان کا حصہ جانتے تھے۔ وہ اس بات میں خاصے واضح تھے کہ یہ تبدیلی سیاسی عمل اور لوگوں کو منظم کیے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح ان اداروں نے تبدیلی کو بالخصوص سیاسی تناظر میں دیکھا۔ ماضی میں ان اداروں نے اپنے وسائل عوام کی مدد سے خود اکٹھے کیے بلکہ اپنی پالیسیوں کو بھی خود مرتب کیا۔ یہاں یہ کہنا مقصود نہیں کہ ماضی کی سول سوسائٹی کے اداروں میں کمزوریاں نہیں تھیں۔ یقیناً ان اداروں نے مختلف سطحوں پر کمزوریاں دکھائیں لیکن انہوں نے اپنی اہمیت کو کم نہیں ہونے دیا اور ان کے ایجنڈے میں عوام اور ان کے مسائل بھی عملی انداز میں موجود تھے۔

آج جب نئی صدی کی پہلی دہائی ختم ہو چکی ہے تو سول سوسائٹی اور اس کے اداروں کی صورت حال مختلف ہے، حالاں کہ آج جو وسائل ان اداروں کے پاس موجود ہیں، وہ ماضی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اور نہ صرف مالی وسائل بلکہ بعض جگہوں پر تو انسانی وسائل بھی موجود ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ سول سوسائٹی کے اداروں بالخصوص این جی اوز کو تو امداد مل رہی ہے۔ اس میں زیادہ تر بین الاقوامی امداد بھی شامل ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہماری سول سوسائٹی ماضی کے مقابلے میں اپنی افادیت کھوتی جا رہی ہے اور لوگوں کا اعتماد بھی ان اداروں پر کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ حالاں کہ کسی معاشرے میں بہتر تبدیلی کے لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سول سوسائٹی اور ان کے اداروں کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے اور یہی ادارے کسی بڑی تبدیلی کا سبب بھی بنتے ہیں۔

بدقسمتی سے اس ملک میں سول حکمرانی کے مقابلے میں فوجی حکمرانی مضبوط رہی ہے جس سے سول سوسائٹی کے یہ ادارے اپنی جدوجہد کے تسلسل کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں، کیوں کہ ہمارے ان اداروں نے بھی جدوجہد کا راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ کا انداز اختیار کرلیا ہے اور ان کے نزدیک بھی فوری مفادات کا حصول اہم ہوگیا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے سول سوسائٹی کے بیشتر گروپ بھی تبدیل ہو چکے ہیں اور عوام کے مفادات اب ان کے ایجنڈے کا حصہ نہیں رہے۔ جب یہ ادارے بھی اپنے کردار کو طاقت کے مراکز کی سیاست کے تحت ڈھالیں گے تو ان کی اہمیت معاشرے میں خود بخود کم ہوتی چلی جائے گی۔ اگرچہ وہ لوگوں کی باتیں کرتے ہوئے سب سے آگے نظر آئیں گے لیکن عملی اقدامات میں وہ کافی پیچھے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے ہاں رائٹ اور لیفٹ دونوں اطراف کی سول سوسائٹی نظریاتی تضادات کا شکار ہے۔ یعنی ان کے قول اور فعل میں اس قدر تضادات ہیں کہ لوگوں میں ان اداروں کی مجموعی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ مثلاً یہ ادارے پاکستان میں سماجی انصاف و برابری، جمہوریت اور انسانی حقوق، خواتین اور بچوں کے حقوق، آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، آمریت کے خلاف جدوجہد، شفافیت پر مبنی نظام اور خود احتسابی والے معاشرے کی باتیں بڑے زور شور سے کرتے ہیں لیکن عملاً بہت سے اداروں میں وہ خود ان پر عمل درآمد کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم مجموعی طور پر ایک زوال پذیر معاشرے میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے معروف دانشور صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار عبدالکریم عابد مرحوم اپنی کتاب ''پہلی بات'' میں شامل مضمون ''متوازن ذہن کیسے پیدا ہوگا؟'' میں لکھتے ہیں:

> ''معاشرے میں اجتماعیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگوں میں احساس ہو، ان کا ضمیر زندہ ہو، وہ ظلم کو دیکھ کر تڑپ اٹھیں، کسی کو تکلیف میں دیکھ کر دکھ محسوس کریں، جہاں تک ممکن ہو وہ برائیوں کے خلاف جہاد کریں اور ان کے خلاف متحد ہو کر آواز اٹھائیں، تمام چھوٹے اور بڑے معاملات میں وہ تڑپ جانے والا دل اور اثر کرنے والا دماغ رکھتے ہوں۔ زوال پذیر قوم کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے افراد عملی طور پر صفر ہوتے ہیں لیکن باتیں بنانے میں تیز ہوتے ہیں۔ بڑے مقرر، انشا پرداز، جوشیلی تقریریں کرنے والے، عالم، لیڈر، بڑ ہانکنے والے حکمران، سب زوال پذیر معاشرے میں زیادہ ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اس معاشرے میں ادب، شاعری، فن اور آرٹ کا بڑا چرچا ہوتا ہے لیکن اس سب کچھ کا کوئی ہدف نہیں ہوتا، یہ ایک ذہنی عیاشی ہوتی ہے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی برتری دوسروں پر ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے میں بڑی بڑی باتوں کا بہت شور ہوتا ہے لیکن اصلی جذبات اور اصلی فکرمندی نہیں ہوتی۔ قوم کے رہنما قوم کو دھوکا دیتے ہیں اور قوم اپنے رہنماؤں کو دھوکا دیتی ہے۔'' (صفحہ 34-33)

اگلے صفحے پر وہ مزید لکھتے ہیں:

''زندگی کے عملی رویے اصل میں فکر و نظر کی درستی سے متعین ہوتے ہیں لیکن جہاں فکر و نظر پر مردنی طاری ہوگئی ہو، وہاں ضمیر بھی مردہ ہوتے جائیں گے اور لوگوں کے مزاج بھی فاسد ہوں گے، ان میں توازن نہیں ہوگا۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلی ضروری چیز فکر و نظر کی طاقت ہے جو ہمیں دانشور فراہم کر سکتے ہیں۔''

عابد صاحب نے بہتر تجزیہ کیا ہے اور اس میں سول سوسائٹی یا اہل دانش سمیت اشرافیہ کے طبقے کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے میں سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی طور پر بحران اور انتشار کی کیفیت نمایاں ہے۔ اس کو ایک طرف جہاں سیاسی نظام کی ناکامی کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، وہیں انہیں سول سوسائٹی کے اداروں کی ناکامی کے زمرے میں بھی دیکھا جانا چاہیے۔ یہ سوال بھی اہم ہے کہ یہ ادارے لوگوں میں اپنا مضبوط اثر رکھتے ہیں تو پھر ان اداروں کا اثر کہاں ہے اور بحران میں وہ کیوں نہیں نظر آتے جن کا ہر سطح پر دعویٰ کیا جاتا ہے۔ سول سوسائٹی میں شامل این جی اوز کا کام دو طرح سے نظر آتا ہے؛ اول وہ سروس ڈلیوری کے تناظر میں کام کر رہی ہیں، جہاں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات فراہم کریں اور دوم ایسی این جی اوز ہیں جو شہریوں کے حقوق اور ایڈووکیسی پر کام کرتی ہیں۔ یہاں چوں کہ سروس ڈلیوری یعنی سہولیات کی فراہمی پر زیادہ کام ہو رہا ہے، اس لیے عملاً یہ ادارے اپنے آپ کو ریاست کے نعم البدل کے طور پر پیش کر رہے ہیں حالاں کہ سول سوسائٹی کے ادارے کبھی ریاست کا نعم البدل نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کو ریاست بننے کے اس بخار سے باہر نکلنا چاہیے۔ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ریاست، حکومت اور اس کے اداروں کو پابند کریں یا ان پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنی اصل ذمہ داری ادا کریں کیوں کہ لوگوں کو بنیادی ضروریات کی فراہمی کی اصل ذمہ داری ریاست اور اس کے اداروں کی ہے۔ اگر ہم یہ کام کریں گے تو ہم ایک محدود طبقے کو تو یہ سہولتیں دے سکتے ہیں لیکن ایک بڑے طبقہ کو نہیں۔ دوسرا ہماری رسائی سب لوگوں تک ممکن نہیں، یہ کام ریاست کا ہے اور اس کو کرنا چاہیے کیوں کہ ہم ریاست اور حکومت کو ٹیکس دیتے ہیں اور وہ اگر یہ چیزیں ہمیں فراہم کرتی ہے تو ہم پر احسان نہیں کرتی بلکہ ان کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کو ان کے مختلف امور پر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا کہنے کی بجائے خود ان کی ذمہ داریاں سنبھالنا سول سوسائٹی کا کام نہیں کیوں کہ اگر سب پرائیویٹ سیکٹر میں ہونا ہے تو اس سے ریاست کا کردار محدود ہو جائے گا اور لوگوں کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاست اور حکومت کے فرائض سے نکال کر نجی شعبہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا جو کہ سود مند عمل نہیں ہوگا۔

یہ بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ آج جو بڑی سول سوسائٹی اور اس سے متعلق ادارے ہیں۔ انہوں نے ملک میں رضا کارانہ عمل کو کمزور کیا ہے اور اب ایسے لوگ کم ملیں گے جو ان کاموں یعنی سماج کی تبدیلی کے عمل میں رضا کار کے طور پر کام کریں۔ یہ سمجھ لینا کہ ملک میں تبدیلی پروجیکٹ چلا کر لائی جا سکتی ہے تو یہ غلط فہمی ہوگی۔ بعض اوقات سول سوسائٹی سے وابستہ اداروں میں بے جا مداخلت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اس میں وہ ایسے لوگوں کو لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے جو در پردہ انہی کے ایجنڈے پر کام کرتے ہیں۔ دوسری طرف سول سوسائٹی سے وابستہ اداروں اور ان کارکنوں کو سماجی سطح پر جاگیردارانہ، قبائلی ذہنیت اور آمرانہ طرزِ عمل کے ساتھ بعض اوقات ڈر اور خوف کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ادارے جو فعال اور بہتر کام کر رہے ہیں اور ریاست ان کے کاموں کو اپنے مفادات کے برعکس سمجھتی ہے تو انہیں جان بوجھ کو سماج میں متنازع بنایا جاتا ہے اور بعض اوقات ان کی حب الوطنی پر شک بھی کیا جاتا ہے جو لوگوں میں ان کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ ملک میں آپ کو غیر ملکی ثقافتی یلغار اور بیرونی سیاسی یلغار کا بھی سامنا ہے لیکن اس پر ہماری سول سوسائٹی مجموعی حیثیت سے خاموش ہے اور وہ مغرب کو ناراض کرنے کی بجائے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کی خواہش مند ہے۔

پاکستان میں تیزی سے معاشی، سیاسی اور سماجی ناہمواریوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ بری طرزِ حکمرانی کے باعث مشکل میں ہیں اور انہیں ان اداروں کے تناظر میں کوئی بہت زیادہ امید بھی نہیں۔ ایسے میں لوگوں میں ایک امید سول سوسائٹی کے یہ ادارے بن سکتے ہیں۔ اگرچہ اصل تبدیلی اور انقلاب یا اصلاحات سیاسی جماعتیں لاتی ہیں لیکن سول سوسائٹی ان سیاسی جماعتوں کو ان کے اصل کردار میں لانے میں معاونت کر سکتی ہے۔ اگر ہماری سول سوسائٹی کے ادارے موجودہ صورتِ حال میں کوئی مشترکہ حکمت عملی اپنائیں اور باہمی رابطوں کے ذریعے کوئی بڑی حکمت عملی سامنے لائیں تو واقعتاً سول سوسائٹی کے یہ ادارے مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان اداروں کو چاہیے کہ وہ اپنا موجودہ طرزِ عمل چھوڑ کر لوگوں کو منظم کریں اور اپنے اندر جمہوری قدروں کو بحال کریں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی سیاست کی ناکامی؟

پاکستان کی سیاست میں مذہبی سیاست کی اہمیت اور اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ مذہب کے نام پر سیاست کرنے کے حوالے سے ہمارے ہاں دو نقطہ نظر موجود ہیں، اول یہ کہ ملک کو مذہبی سیاست کے مقابلے میں سیاست کی ضرورت ہے کیوں کہ مذہب کے نام پر کی جانے والی سیاست لوگوں میں مذہبی تفرقہ اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف تقسیم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامی ملک میں مذہبی ریاست کے مقابلے میں سیکولر ریاست کے حامی ہیں اور اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اس کے کردار کو مذہب کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے جب کہ اس کے برعکس ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف مذہب کے نام پر سیاست کرتا ہے بلکہ عام لوگوں میں بھی یہ احساس موجود ہے کہ یہ ملک چوں کہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا، اس لیے یہاں ہماری جدوجہد اسلامی نظام کے نفاذ کے ساتھ منسلک ہے۔ اس خیال کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد ملک میں مذہبی سیاست کے ساتھ منسلک ہے اور اسے ہی وہ اپنی سیاست کا محور سمجھتی ہے۔ اگرچہ پاکستان میں مذہبی سیاست کرنے والے عناصر اور جماعتوں کو انتخابی سیاست میں ہمیشہ سے ناکامی کا سامنا رہا ہے اور محض چند نشستوں کے ساتھ اسمبلی میں ان کا وجود اس بات کی علامت بھی ہے کہ یہاں عام ووٹر مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں کے مقابلے میں سیاسی عناصر کے ساتھ کھڑے ہیں۔ صرف 2002 کے عام انتخابات جو فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف کی نگرانی میں ہوئے تھے، ان میں مذہبی جماعتوں کے ایک نئے اتحاد ''متحدہ مجلس عمل'' کو صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں شان دار کامیابی ملی اور اس کامیابی نے انہیں صوبہ سرحد میں حکومت بنانے کا موقع بھی فراہم کیا اور اس طرح قومی اسمبلی میں بھی ان کا ایک مضبوط پارلیمانی کردار موجود رہا۔ مذہبی جماعتوں کی 2002 کے انتخابات میں کامیابی پر بھی لوگوں میں خاصے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں اور ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اس کامیابی کے پیچھے دراصل اسٹیبلشمنٹ کا ہاتھ تھا جو ان کو کامیاب کروا کر ایک طرف قومی سیاسی جماعتوں کے کردار کو محدود کرنا چاہتی تھی تو دوسری طرف امریکہ کے ساتھ بارگیننگ سیاست میں متحدہ مجلس عمل کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی خواہش مند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خدشہ درست ہو لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے کہ یہ انتخابات 9/11 کے بعد ہوئے اور امریکہ کے افغانستان پر حملے کے بعد جو یہاں ان کے خلاف ردِعمل کی سیاست غالب ہوئی اور جس انداز سے ہم نے امریکی جنگ میں اتحادی بننے کا فیصلہ کیا اس نے بھی ان مذہبی جماعتوں کی مزاحمتی سیاست کو پذیرائی ملی۔ جہاں تک انتخابات کی شفافیت کا تعلق ہے اور کسی کے لیے اسٹیبلیشمنٹ کی حمایت کا سوال ہے تو یہ ہمیشہ سے یہاں موجود رہا ہے۔ مذہبی جماعتوں سے ہٹ کر جو سیاسی جماعتیں بھی غالب ہوئیں وہ بھی اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کی مرہون منت رہی ہیں۔

البتہ یہاں اس سوال پر تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان میں موجود مذہبی سیاست کی ضرورت کیوں کر پیش آئی اور اس کا جو مجموعی کردار ہے اس کو کس تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ دراصل ہمیں یہ ضرور تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستان بننے کی جو تحریک تھی جس میں مسلم لیگ سب سے زیادہ پیش پیش تھی اس نے اپنی تحریک میں لوگوں کو ساتھ جوڑنے اور جذباتی سیاست کو غالب کرنے میں جس انداز سے مذہب کے نام کو استعمال کیا اور پاکستان کا مطلب کیا ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے نعرے لگائے تو ایک لوگوں میں فطری سوچ بھی غالب آئی کہ ہم اسلام کے نام پر ایک نیا ملک حاصل کر رہے ہیں۔ اس لیے قیام پاکستان کے بعد یہاں جن لوگوں نے مذہب کے نام پر سیاست کی بنیاد ڈالی اور سیاست کی انہوں نے اسی نعرے کو بنیاد بنایا کہ ہم اسلامی نظام کے لیے ہندوستان سے الگ ہوئے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی طبقہ یا کوئی جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ہمیں اس ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنی ہے اور وہ اپنی اس جدوجہد کو ایک جمہوری دائرہ کار میں چلانے کے لیے تیار ہیں تو یہ ان کا سیاسی و جمہوری حق ہے اور اسے ہر سطح پر تسلیم کیا جانا چاہیے کیوں کہ اگر یہاں ووٹر اس بات کا حامی ہے تو ہم ڈنڈے کی بنیاد پر اس کی خواہش کو ختم نہیں کر سکتے۔ لیکن کیوں کہ یہاں ایک سیاسی اور جمہوری انتخابی تجربہ بھی موجود ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ ان مذہبی جماعتوں کی سیاست کو یہاں زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی اور یہ اس بات کی علامت بھی ہے کہ لوگوں میں مذہبی سیاست کے حوالے سے کافی تحفظات ہیں، مثلاً جب مذہب کے نام پر سیاست کی بات کی جاتی ہے اور اس کام کے لیے مذہبی سیاسی جماعتوں کی تشکیل کی جاتی ہے تو ایک سوال یہ ضرور ذہن میں آتا ہے کہ کیا وہ جماعتیں ہی جو براہ راست مذہبی جماعتیں نہیں اور نہ ہی وہ اپنی سیاست کی بنیاد میں مذہب کو بنیادی فوقیت دیتی ہیں، وہ مذہب کے خلاف ہیں؟ کیا مسلم لیگ (ن)، مسلم لیگ (ق)، پیپلز پارٹی، تحریک انصاف سمیت دیگر جماعتیں غیر مذہبی جماعتیں ہیں؟ کیا یہ جماعتیں اس ملک میں اسلام کے بارے میں غیر سنجیدہ ہیں اور کیا ان کی ترجیحات میں اسلامی نظام کہیں نہیں آتا؟ حالاں کہ ان جماعتوں کے منشور اٹھا کر دیکھیں تو اس میں بھی آپ کو ان کی اسلام سے گہری وابستگی کا اظہار نظر آتا ہے۔ اگر اس مذہبی سیاست کے فلسفہ کو مان لیا جائے تو یہاں اس خیال کے حامی عناصر یہ بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہہ سکتے ہیں کہ دیگر جماعتوں میں جو خالصتاً مذہبی جماعتیں نہیں ان کے سیاسی کارکن غیر اسلامی ہیں۔اس لیے جب ہم سیاست میں اسلام اور غیر اسلام کی تفریق کرتے ہیں تو یہاں مسائل کو ضرور جنم دینے کا باعث بنے گا۔

پاکستان میں جو مذہبی جماعتیں ہیں، ان کی اکثریت سیاسی جماعتوں سے زیادہ فرقہ پرست جماعتوں کی ہے جو محض اپنے مخصوص فرقہ کی بنیاد پر نہ صرف سیاست کرتے ہیں بلکہ اسلامی نظام کے نفاذ کی جس جدوجہد کا وہ حصہ ہیں، وہ بھی محض ان ہی کے فرقے تک محدود ہے، مثلاً جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمٰن گروپ یا مولانا سمیع الحق گروپ دیوبندی مکتب فکر کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ جمعیت اہل حدیث پروفیسر ساجد میر اور ابتسام الٰہی ظہیر گروپ اہل حدیث فکر، تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پروفیسر ساجد نقوی اہل تشیع اور جمعیت علمائے پاکستان بریلوی یا اہل سنت گروپ کی نمائندگی کرتے ہیں۔یعنی ان جماعتوں میں کوئی دوسرے مکتب فکر کا مرد یا خاتون شامل نہیں ہو سکتے اور یہ صرف اپنے مخصوص نظریات کے حامل لوگوں کا گروہ ہے جس کی مجموعی قومی پذیرائی ممکن نہیں۔البتہ اس کے برعکس جماعت اسلامی براہ راست کسی ایک مخصوص فرقہ کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ اس میں آپ کو ہر فرقہ کی کسی نہ کسی سطح پر نمائندگی ضرور نظر آتی ہے۔اس لیے مذہبی جماعتوں کی سیاست پر یہ تنقید ضرور کی جا سکتی ہے اور بلکہ کی بھی جانی چاہیے کہ یہ مذہب کے نام پر فرقہ ورانہ سیاست کی ترویج میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ان فرقہ پرست جماعتوں میں شامل مولانا حضرات، ملک میں جو فرقہ ورانہ معاملات میں شدت آئی، اس کے کسی حد تک ذمہ دار بھی ہیں اور انہوں نے یہ جو سمجھ لیا ہے کہ محض ان کا فرقہ اسلامی ہے اور باقی تمام فرقہ کے لوگ کافر ہیں یا خالص اسلامی نہیں، اس نے اس ملک میں مذہبی تقسیم کو پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

پاکستان میں مجموعی طور سیاسی جماعتوں کے بارے میں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے عوام کے مقابلے میں اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کی ہے۔لیکن یہ کہنا کہ مذہبی سیاسی جماعتیں اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست سے پاک رہی ہیں یہ بھی ایک مکمل طور پر غلط تجزیہ ہے۔ہمارے مذہب کی سیاست کے خلاف عناصر محض اسلامی جماعتوں پر یہ الزام شدت کے ساتھ لگاتے ہیں کہ یہ اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کے مہرے ہیں اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے پیچھے ان کے اصل سرپرست اسٹیبلیشمنٹ ہی ہوتی ہے۔یہ تجزیہ مکمل طور پر غلط نہیں لیکن اس میں ہمارے ان دوستوں کو یہ بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ محض مذہبی جماعتیں ہی نہیں بلکہ یہاں پر تمام بڑی جماعتیں یا بالخصوص وہ جماعتیں جو اقتدار کی سیاست کا حصہ رہی ہیں یا ہیں سب ہی نے در پردہ اسٹیبلیشمنٹ ہی کی سیاست کی ہے۔اس لیے محض مذہبی جماعتوں پر ہی تنقید کیوں کی جائے اور باقی جماعتوں کو اس الزام سے کیوں بری کیا جائے؟ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاسی جماعتوں کی طرح مذہبی سیاسی جماعتوں نے بھی اپنی سیاست کا محور اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کو بنایا۔اسلامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوری اتحاد میں ان کی شمولیت بھی اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کے ساتھ منسلک رہی ہے اور متحدہ مجلس عمل کی پوری سیاست کو دیکھیں بالخصوص جب وہ صوبہ سرحد میں اقتدار کی سیاست کا حصہ بنے اور جو کردار انہوں نے سترھویں ترمیم کے تناظر میں ادا کیا، وہ سب اسٹیبلیشمنٹ ہی کی سیاست کے مرہون منت رہا ہے۔ افغانستان اور کشمیر کی سیاست میں جو بڑا کردار جماعت اسلامی سمیت دیگر مذہبی جماعتوں نے ادا کیا، اس میں بھی وہ اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ حالاں کہ اس کام کے عوض ان کو اقتدار کی سیاست میں کوئی بہت بڑا کردار نہیں ملا، ماسوائے 2002ء کے انتخابات میں صوبہ سرحد کی حکومت کے، لیکن کیوں کہ انہوں نے اسٹیبلیشمنٹ کی سیاست کو بنیاد بنا کر اپنا وزن ان قوتوں کو facilitate کرنے میں لگایا جو اسٹیبلیشمنٹ کی مدد سے اقتدار میں آتی رہی ہیں۔ اسی طرح ہماری ان مذہبی جماعتوں کا جو فہم اسلام ہے اس میں بھی مجموعی طور پر ایک مخصوص فرقہ کا اسلام غالب نظر آتا ہے اور دوسرے فرقہ کے لوگوں کو ان کے اسلام پر تحفظات موجود ہیں۔ اگر ان تمام فرقوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں کے فرقوں میں اسلام کے نفاذ کے طریقہ کار پر کوئی اختلاف نہیں تو پھر یہ الگ الگ کیوں ہیں اور اگر ہے تو پھر کیسے یہ لوگ ایک اسلام کے طریقہ کار پر متفق ہوسکیں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ یہ لوگ تو ایک نماز پر بھی متفق نہیں باقی معاملات تو اپنی جگہ۔ جنرل ضیاالحق کے دور میں جب بہت زیادہ اسلامائیزیشن کی بات ہوئی تو انہوں نے علمائے کرام کو دعوت دی کہ وہ ایک اسلامی چارٹر بنا کر دیں لیکن سب لوگ نہ تو کسی ایک چارٹر پر متفق ہوئے اور نہ ہی ان میں کوئی مذہبی اور سیاسی ہم آہنگی نظر آئی کہ یہ لوگ مل کر اسلامی نظام کے لیے کام کرسکتے ہیں۔

پاکستان میں مذہب کے نام پر جو تشدد کا کھیل شروع ہوا اور یہ خیال مضبوط ہوا یا درپردہ قوتوں نے انہیں ان حالات میں جانے پر مجبور کیا کہ مسائل کا حل ووٹ کی طاقت نہیں بلکہ بندوق کی طاقت ہے۔ میں نے بہت سی جگہوں پر یہ بحثیں سنی ہیں کہ اسلامی انقلاب ووٹ کے ذریعے نہیں بلکہ بندوق کی مدد سے آئے گا اور اسلحہ مومن کی پہچان اور اس کا زیور ہے۔ بدقسمتی سے اس کھیل کو تقویت دینے یا اس کو طاقت دینے میں جنرل ضیاالحق کی افغان پالیسی کا بڑا عمل دخل ہے جو امریکی دباؤ پر اختیار کی گئی۔ اس افغان پالیسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں معصوم لوگوں کو جہاد کے نام پر حقیقی معنوں پر گمراہ کیا گیا اور ان کے ہاتھوں میں بندوق تھما کر ان کے اندر جذبہ جہاد اجاگر کیا گیا۔ سب کو معلوم ہے کہ ریاست نے ان مذہبی جماعتوں کی مدد کے ساتھ اسلحہ کی سیاست کی اور لوگوں کو ترغیب دی کہ افغان جہاد ان پر فرض ہے۔ حالاں کہ یہ سارا جہاد امریکہ کی مدد سے کھیلا گیا اور روس کو تباہ کرنے میں اس کے سیاسی اور مالی مفادات پنہاں تھے۔ لیکن ہماری اسلامی جماعتوں نے روس کو ختم کرنے اور امریکہ کو مضبوط کرنے کے کھیل کو سمجھنے کی بجائے وہی کچھ کیا جو امریکہ کا ایجنڈا تھا اور اس میں ہماری ریاست نے ان کی مدد کرنی تھی۔ اگرچہ ہماری بہت سی مذہبی جماعتیں ووٹ کی سیاست کرتی رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہے لیکن جنرل ضیاالحق کے دور میں ان مذہبی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتوں کے اندر سے نئے گروپ تشکیل دیئے گئے جنہوں نے فرقہ وارانہ اور جہادی سیاست کے بیج بوئے اور اسلحہ کو ہتھیار کے طور پر تھام لیا۔ اس سارے عمل نے سیاسی مذہبی جماعتوں کی سیاست کو کمزور کیا اور ان کے مقابلے میں ایسے لوگوں کو طاقت دی جو مذہب کے نام پر تشدد کی سیاست کے علم بردار بن گئے۔ ہمارے ہاں بہت سی مذہبی جماعتیں اگرچہ جمہوریت کی بہت زیادہ بات کرتی ہیں اور اپنی وابستگی کو بھی جمہوری قوتوں کے پلڑے میں ڈالتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ایک خرابی یہ بھی رہی ہے کہ یہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلے میں ایک اچھی کوشش ملی یکجہتی کونسل کی شکل میں سامنے آئی اور ان تمام مذہبی جماعتوں یا گروہوں نے ایک چارٹر پر دستخط کیے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام اور برداشت کے کلچر کو فوقیت دیں گے۔ اس کے اچھے نتائج بھی نکلے لیکن یہ عمل زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا اور آگے جا کر فرقہ وارانہ مسائل کم نہیں بلکہ مزید بڑھ گئے۔

مذہبی جماعتوں کے اپنے درمیان ہونے والے سیاسی وانتخابی اتحاد کا معاملہ بھی بڑا دلچسپ ہے اور یہ اتحاد ظاہر کرتا ہے کہ ایک طرف اسلامی قوتیں ہیں تو دوسری طرف غیر اسلامی قوتیں ہیں، حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ جماعت اسلامی ہمیشہ اس طرز کے اتحادوں کی حامی رہی ہے حالاں کہ ایک طرف وہ خود دعویٰ کرتی ہے کہ وہ فرقہ پرست جماعت نہیں اور نہ فرقہ پرستی کی حمایت کرتی ہے، لیکن جب یہ اتحاد کرتی ہے یا اس میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتی ہے، تو ان ہی فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ وہ شامل ہوتی ہے جو مخصوص فرقہ کی بالادستی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ طرز عمل پاکستان میں سیاست کو مضبوط کرنے کی بجائے فرقہ پرست جماعتوں کو مضبوط کرتا ہے اور ان کو اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں ایک سیاسی طاقت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ خود ہماری سیاسی جماعتیں جن میں دونوں بڑی جماعتیں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ شامل ہیں اپنے وقتی سیاسی مفادات کے حصول کے لیے ان مذہبی سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کرتی رہی ہیں۔ مولانا فضل الرحمن ہمیشہ سے پیپلز پارٹی کے قریب رہے ہیں اور اب بھی ان کی مخلوط حکومت کا حصہ ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن کی جماعت، 2002ء میں بننے والی متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت میں اہم حصہ کے ساتھ صوبہ سرحد میں رہی ہے۔ لیکن وہاں جس انداز میں حکومت کی گئی، اس نے اس خیال کو بھی نقصان پہنچایا کہ اگر مذہبی جماعتیں اقتدار میں آ جائیں تو صورت حال کو وہ بہت انداز میں تبدیل کر سکتی ہیں۔

مذہبی سیاست کا ایک بحران یہ بھی رہا ہے کہ یہ لوگ اسلامی نظام اور اسلامائیزیشن کی تو بہت بات کرتے ہیں لیکن اپنے اندر بھی سیاسی عناصر ہی کی طرح بے پناہ تضادات کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ تمام خرافات جو ہمیں سیاسی عناصر میں نظر آتی ہیں، اب وہ بدقسمتی سے مذہبی سیاست کا بھی حصہ بن گئی ہیں۔ بعض مذہبی جماعتیں اب نظریاتی سیاست سے عملاً لاتعلق ہو گئی ہیں اور ان کی پوری توجہ دیگر جماعتوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرح اقتدار کی سیاست پر مرکوز نظر آتی ہے۔ اس کھیل میں مولانا فضل الرحمٰن مذہبی سیاست کے ہیرو بن کر سامنے آئے ہیں اور اب وہ ہر حکومت کے ساتھ اقتدار کے حصول کی جوڑ توڑ میں نظر آتے ہیں۔ مذہبی سیاست کے حوالے سے لوگوں کے اندر عملاً ایک خوف بھی موجود ہے اور جس انداز میں اسلام کی تشریح کرتے ہیں اور بنیادی انسانی حقوق کی حق تلفی کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو اس سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ یہ لوگ اقتدار میں آ کر کہیں طالبان فہم اسلام کی ترجمانی نہ کریں۔ انسانی حقوق، خواتین کے حقوق کے حوالے سے ان لوگوں میں ایک واضح تضاد موجود ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ جو خواتین ان کے دائرہ کار کے مطابق نہیں زندگی گزارتیں، وہ اسلام کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ جس انداز میں ہماری سیاسی جماعتوں کے اپنے اندر جمہوری کلچر کا فقدان ہے تو مذہبی جماعتیں بھی اس ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔ یہاں بھی موروثی سیاست کو غلبہ ہے، ماسوائے جماعت اسلامی کے دیگر جماعتیں ایک ہی فرد کے گرد گھوم رہی ہیں۔

ہمارے یہاں مذہبی سیاسی جماعتوں نے دو طریقے اختیار کیے، ایک جمہوری راستہ تھا یعنی ووٹ اور انتخاب کی بنیاد پر اقتدار کا حصول اور اس کے تحت نظام میں تبدیلی جب کہ اس کے برعکس ایک دوسرا راستہ بھی اختیار کیا گیا جس میں جہاد اور لشکر کی سیاست تھی۔ ان دونوں طرز کی سیاست میں مذہبی جماعتوں کو سوائے ناکامی کے کچھ اور نہیں ملا بلکہ یہ نقصان محض ان تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ملک کو بھی اس سیاست کا نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ ہمارے ہاں جن لوگوں نے مذہب کے نام پر تشدد کا راستہ اختیار کیا ان کی مکمل طور پر سرکوبی کرنے کی بجائے مذہبی جماعتیں ان کے اقدامات کا جواز پیش کرتی رہی ہیں جس نے ان قوتوں کو مضبوط ہونے میں تقویت دی، مثلاً طالبان کی طرزِ فکر اور ان کے اقدامات کو بہت سے لوگوں نے یہاں جواز بنا کر پیش کرنا اور یہ کہنا کہ چوں کہ امریکہ غلط کر رہا ہے تو ان لوگوں کو مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے، ٹھیک حکمت عملی نہیں۔ اس تاثر کی وجہ سے بعض اوقات مذہبی جماعتوں کے بارے میں یہ تاثر بھی مضبوط ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی اس طرز کے اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں اور یہ سوچ لوگوں میں کئی نئے خطرات کو جنم دیتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا بحران

پاکستان کی ریاست اور جمہوریت کو اس وقت سب سے زیادہ خطرہ ملک کے اندر بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی اور اس کے تناظر میں پیدا ہونے والی دہشت گردی سے ہے۔ اگرچہ پاکستانی معاشرے میں انتہا پسندی کی نوعیت سیاسی ہے اور دہشت گردی کا عمل بھی کوئی نیا نہیں لیکن مذہب کے نام پر پیدا ہونے والی انتہا پسندی اور دہشت گردی کی کہانی کافی خوف ناک ہے۔ پاکستان میں پہلی افغان جنگ کے تناظر میں سیاسی عمل میں مذہب کی سیاست کا بہت عمل دخل رہا۔ اس وقت کی حکومت کا یہی ایجنڈا تھا کہ سیاست میں مذہب کو داخل کیا جائے تاکہ افغان جہاد میں ہونے والے عمل کو ایک وسیع پیمانے پر ریاست اور حکومت کی جانب سے سیاسی جواز فراہم کیا جا سکے۔ اگرچہ پاکستان کی سیاست میں مذہب کا استعمال ابتدا ہی سے تھا اور خود پاکستان بننے کی تحریک میں بھی ہمیں ایسے نعرے نظر آتے ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم جس الگ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ نظریاتی اور اسلامی ریاست ہوگا۔ بدقسمتی سے یہاں اسلام تو نافذ نہیں کیا جا سکا، البتہ ہماری پس پردہ قوتوں اور بالادست طبقوں نے ابتدا ہی سے میں سیاست میں مذہب کو بطور ہتھیار ضرور استعمال کیا۔ اس طبقہ کا خیال تھا کہ مذہب وہ واحد بنیاد ہے جس کے تحت وہ لوگوں کے جذبات کو ابھار کر انہیں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور اپنے سیاسی مفادات کو بھی پورا کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی اگرچہ پہلے بھی تھی لیکن اس میں اصل شدت جنرل ضیا الحق کے دور میں آئی۔ آمرانہ دور میں کراچی کی سطح پر قوی جماعتوں؛ پیپلز پارٹی، جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان کے مقابلے میں لسانی جماعت کا بیج ایم کیو ایم کی شکل میں بویا گیا۔ علاوہ ازیں پنجاب میں بالخصوص مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ جماعتوں کی نہ صرف سرکاری سرپرستی کی گئی بلکہ ریاستی اداروں کی مدد سے ان جماعتوں کے اندر نئے گروپس تشکیل دیئے گئے۔ ان میں سپاہ صحابہ، سپاہ محمدی، لشکر طیبہ، لشکر جھنگوی اور سنی گروپ کی تشکیل کر کے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ، جمعیت العلمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت الحدیث کو عملاً کمزور کیا گیا۔ یہ مذہبی جماعتیں اگرچہ ایک مخصوص فرقہ سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق رکھتی تھیں لیکن انہوں نے مجموعی طور پر تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ لیکن جب ان کے مقابلے میں جنرل ضیاالحق نے لشکر تشکیل دیئے تو انہوں نے سیاسی اور جمہوری راستہ اختیار کرنے کی بجائے بندوق کا راستہ اختیار کیا۔ اسی طرح جہادِ کشمیر میں حزب المجاہدین کے مقابلے میں لشکر طیبہ تشکیل دی گئی۔ آپ اعداد و شمار اُٹھا کر دیکھ لیں 1990ء سے 1999ء تک کے دور میں پورے پاکستان میں بالخصوص پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات عروج پر تھے۔ سرکاری اداروں کی مدد سے ان تنظیموں نے اپنے اپنے مسلح لشکر تشکیل دیئے اور اپنے مخالف فرقوں کے بارے میں شر انگیز تحریری مواد شائع کیا اور ایک دوسرے کے فرقے اور افراد کو کافر اور واجب القتل قرار دیا۔ سرکاری ایجنسیوں نے ان افراد کی نہ صرف سرپرستی کی بلکہ ان کو یہاں کام کرنے کا ایسا موقع فراہم کیا کہ وہ جب چاہیں اور جیسے چاہیں اپنا کام کر سکتے تھے۔ ہزاروں افراد اس فرقہ وارانہ جنگ کا شکار ہوئے اور ملک کا منظر نامہ مذہب کے نام پر ایک پرتشدد معاشرے کی صورت میں سامنے آیا۔ ان فرقہ وارانہ جماعتوں نے معاشرے کے اندر عام لوگوں بالخصوص چھوٹے اور متوسط طبقے کے علاقوں اور اس میں موجود نوجوانوں کو خصوصی ٹارگٹ کرتے ہوئے ان کے اندر ایک دوسرے کے بارے میں نفرت کے بیج بوئے۔ مسلمان معاشرے کے افراد ہونے کے باوجود ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر قرار دیا۔ ان لوگوں کے پاس سرکاری سرپرستی میں جدید ترین اسلحہ آیا اور انہوں نے اپنے مخالفین کے خلاف خوب استعمال کیا۔ معاشرے میں فرقہ وارانہ گفتگو ہر جگہ سننے کو ملی۔ محلوں کی سطح پر موجود مساجد سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت بھری تقریریں کی گئیں۔ فرقہ واریت کے اس کھیل میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ بعض جرائم پیشہ افراد نے ان گروپوں میں عملی طور پر شمولیت اختیار کر کے اپنے برے اور غیر قانونی کاموں کو تحفظ دیا۔ اس عمل کے باعث فرقہ پرست جماعتوں کی اپنی قیادت بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یرغمال ہو گئی جو کرپٹ اور مافیا کے عناصر تھے۔ اس کام کے لیے مدارس کو خاص طور پر استعمال کیا گیا اور یہاں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو فرقہ واریت اور جہاد پر مبنی تعلیم دی گئی۔ اس تعلیم کی بنیاد یہ تھی کہ ہم اچھے ہیں اور باقی سب لوگ برے ہیں اور ان کے خلاف جہاد کرنا افضل ہے۔ اسی دور میں بیرونی دنیا کی مدد سے کافی بڑی تعداد میں نئے مدارس کھولے گئے۔ ان میں دیوبندی اور اہل حدیث کے مدارس بہت زیادہ تھے۔

معروف دانشور آئی اے رحمان نے کتاب ''پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری'' میں شامل اپنے مضمون ''مذہبی تعصب'' میں لکھا ہے: ''جنرل ضیاالحق کی حکومت نے جمہوری سیاست اور مذہبی جنون کے درمیان میں ایک واضح فرق پیدا کیا۔ اس سے پہلے جو حکمران آئے وہ فرقہ پرستوں کو خوب صورت الفاظ میں دلاسہ دیتے رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ مراعات بھی، جس کا نقصان عام لوگوں کو خاص طور پر غیر مسلم اقلیتی فرقوں کو ہوتا تھا۔ یہ مراعات ملک کے لیے خاصی خطرناک ثابت ہوئیں۔ ضیاالحق نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاست کو عملاً فرقہ پرستوں کے مسلک کا پابند بنا دیا اور ایسا کرتے وقت مذہبی سیاست کے نہایت کاری حربے استعمال کیے۔ جمہوری سیاست میں ضیاالحق کے انحراف کا لازمی نتیجہ فرقہ وارانہ لہر کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ فرقہ واریت کی اس آگ پر وہی عناصر تیل چھڑک رہے ہیں، جو بڑی حد تک پاکستان میں غیروں کی طرف سے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یعنی بعض ملکوں کے متمول فرقے اپنی لڑائی پاکستان میں یہاں کے جنونیوں کی مدد سے لڑ رہے ہیں۔

''وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں فرقہ پرستی پھیلنے کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ یہاں مسلمانوں میں عقلی سطح پر آپس میں تبادلہ خیال کا کوئی معمول نہیں۔ ایسی مطبوعات کا طومار موجود ہے جس سے فرقہ پرستی اور عدم رواداری کو تقویت ملتی ہے۔ حالاں کہ اسلام میں رواداری کی روح پوشیدہ ہے۔ یہاں سادہ لوح لوگوں کے سامنے بلکہ نوجوانوں اور تعلیمی اداروں کے اندر بھی اسلام کا مسخ شدہ مرقع پیش کیا جاتا ہے اور اسی سے ان کو ذہنی غذا فراہم کی جاتی ہے۔'' (صفحہ 35)

نوجوان دانشور ازہر منیر اپنے ایک مختصر کتابچہ ''بنیاد پرستی'' میں لکھتے ہیں:

''بنیاد پرستی کا کوئی مذہب نہیں بلکہ یہ مذہب کی تشریح کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ کسی مخصوص مذہب پر یقین رکھنے سے کوئی شخص بنیاد پرست نہیں بن جاتا بلکہ وہ بنیاد پرست اس وقت بنتا ہے جب وہ ایک خاص طریقے سے عمل کرتا ہے۔ ایسا شخص درج ذیل خاموش قوانین کے تحت عمل کرتا ہے، مثلاً صرف اس کے پاس سچائی ہے کسی اور کے پاس کوئی سچائی نہیں، اس کے خیالات سے اختلاف کرنے والا جھوٹا اور غلط ہے، اس کی سچائی پر شک نہیں کیا جا سکتا اور نہ تنقید کی جا سکتی ہے۔ یہ سچائی قوت، جبر اور طاقت کے ذریعے پھیلائی جانی چاہیے اور جبری تبدیلی مذہب کے عقیدے کا حصہ ہے۔ اس سچائی سے انکار کرنے والے زندیق اور واجب القتل ہیں، ریاست کے قوانین، اس کی کارروائیاں، تقریریں اور اس کی سماجی تقریبات کو ان لوگوں کے خیالات کے تابع ہونا چاہیے۔ جمہوریت، آزاد خیالی، مساوات، سیکولرازم اور جدت پسندی، شیطانی تصورات ہیں۔ آزادی کو مشروط ہونا چاہیے، ہر کسی کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی نہیں ہونی چاہیے۔''

ازہر منیر کی بہت سی باتوں سے اتفاق کیا جا سکتا ہے اور جس انداز سے یہاں مخصوص سوچ کے حامل گروہوں نے اسلام اور دین کی تشریح کی ہے اس نے بہت سے لوگوں میں غلط تصورات کو جنم دیا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب محض جبر کی بنیاد پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور اسلام اس خیال کو تقویت دیتا ہے، ٹھیک نہیں۔ لیکن اس بات سے ضرور اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اس خیال کے حامی لوگ جو بندوق کی نوک پر اسلام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نافذ کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے اسلام کا صرف سیاسی فلسفہ پیش کیا۔ طالبان کا اسلام بھی اسی اندازِ فکر کی عکاسی کرتا ہے جس کی کسی بھی طور پر حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کا دوسرا حصہ جہادی تنظیموں کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ جب جنرل پرویز مشرف کے دورِ اقتدار میں 9/11 کا واقعہ رونما ہوا تو وہ امریکہ کے شدید دباؤ کے باعث عالمی سطح پر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے اتحادی بن گئے۔ افغانستان میں جاری امریکہ اور طالبان جنگ نے سب سے زیادہ ہمیں متاثر کیا اور جن طالبان کی پہلے ہم سرکاری سرپرستی کرتے رہے بعد میں امریکہ ہی کے دباؤ پر ہم نے ان طالبان کو مارنے کا ٹھیکہ لیا۔ افغانستان میں جاری جنگ ہمارے اپنے ملک کے صوبے خیبر پختونخوا میں داخل ہوئی تو ہمیں ابتدا میں اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا کہ اس جنگ کی ہمیں کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جنگ جو قبائلی علاقہ جات افغانستان سے شروع ہو کر صوبہ خیبر پختونخوا کے بعض علاقوں تک ہی محدود رہی، اب پاکستان کے دیگر علاقوں تک پھیل چکی ہے اور اس نے ایک خطرناک بم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں جب افغانستان پر امریکی حملے کا ردِعمل سامنے آیا تو اس نے ابتدا میں طالبان کے لیے ہمدردی اور امریکہ کے خلاف نفرت کا سماں پیدا کر دیا۔ امریکہ کے خلاف اس نفرت نے طالبان کی جدوجہد کو عملاً ایک سیاسی ساکھ بھی فراہم کی۔ سب کا خیال تھا کہ یہ لوگ امریکہ کے خلاف جنگ میں حصہ لے رہے ہیں اور ہمیں ان کی حمایت کرنی چاہیے۔

پاکستان میں بیشتر مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے طالبان کی بھرپور حمایت کی اور یہاں کا بڑا اہل دانش گروپ طالبان کی حمایت میں لوگوں کے ذہنوں کی فکری تشکیل کرتا رہا۔ تحریک طالبان پاکستان جب سامنے آئی تو اس میں پہلی افغان جنگ کے اثرات نمایاں تھے۔ بعدازاں ایسے جرائم پیشہ افراد بھی اس تحریک کا حصہ بن گئے جن کا اسلامی نظام کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بیشتر افراد ایسے تھے جو منشیات، ہیروئن، اسلحہ، گاڑیوں کی چوری وخرید وفروخت اور بچوں کی سمگلنگ میں ملوث تھے اور ان گروپوں کے ساتھ مل کر انہوں نے اپنے جرائم کو تحفظ دیا۔ افغانستان میں جب طالبان کی حکومت نے اقتدار سنبھالا تو اس کا سب سے زیادہ شکار خواتین اور مخالف گروپس بنے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کو بنیاد بنا کر پہلے وہاں موجود بتوں کو توڑا گیا۔ خواتین اور دیگر طبقوں پر زبردستی اپنے اصولوں کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو لوگ طالبان کے فہم اسلام سے انکار کرتے تو ان کو سرِعام سخت سزائیں دی جاتیں اور جواز یہ پیش کیا جاتا کہ اسلامی شریعت اس کی انہیں اجازت نہیں دیتی۔ مردوں کو زبردستی ڈاڑھی رکھنے اور لڑکیوں کی تعلیم روکنے، کلچر اور ثقافتی سرگرمیوں پر پابندی، خواتین کے اکیلے گھر سے نکلنے پر پابندی، شیو کرنے والے اور کروانے والوں کو سزائیں جیسے اقدامات کیے گئے۔ معلوم نہیں یہ کون سا فہم اسلام تھا جس میں لوگوں پر زبردستی اپنے اصول نافذ کیے جاتے تھے۔ یہی طرزِ عمل ہم نے پاکستان میں تحریک طالبان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کے نام پر دیکھا۔ صوبہ خیبر پختونخوا کے بعض علاقوں، بالخصوص مالاکنڈ، وزیرستان، سوات، میں ہم نے یہ تمام مناظر دیکھے، جہاں اسلامی شریعت کے نام پر خواتین اور لوگوں پر تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا۔ لڑکیوں کے سکولوں کا خاتمہ، پردے کی پابندی، خواتین کے کام اور روزگار پر پابندی اور سرعام تشدد اور قتل وغارت کا بازار دیکھنے کو ملا۔ اس سارے کھیل نے پاکستان سمیت دنیا بھر میں اسلام اور مذہب کی ایک بدنما تصویر پیش کی اور اقوام عالم نے سمجھا کہ اسلام ایک تشدد کی ذہنیت کا نام ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے اور اسلامی تعلیمات اور فہم اسلام کی کوئی بھی تصویر کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اسی تناظر میں پاکستان کے اندر جس بدترین انتہا پسندی نے جنم لیا اس میں خودکش حملے بھی شامل تھے۔ مختلف انتہا پسند تنظیموں نے اپنے فدائی دستے تشکیل دیے اور نوجوانوں اور بچوں کو اس انداز میں تربیت دی گئی کہ وہ جہاں بہت سے لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیلتے ہیں وہیں اپنے آپ کو بھی موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان خودکش حملوں کا نشانہ بننے والے صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ مسلح افواج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بھی شامل تھے۔ ان حملوں کا سیاسی، مذہبی اور قبائلی رہنما بھی نشانہ بنے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ افغانستان اور عراق میں جو خودکش حملے ہوئے، وہ اپنی زمین پر قابض غیر ملکی طاقتوں کے خلاف ردعمل کا نتیجہ تھا۔ دونوں ملکوں میں امریکی حملوں یا قبضوں سے پہلے خودکش حملوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔

امریکہ نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو بہت سے لوگوں نے پاکستان اور اس کے سرحدی علاقوں کا رخ کر لیا۔ اس طرح طالبان کا نیا مرکز پاکستان اور اس کے سرحدی علاقے بنے۔ امریکہ کا مؤقف ہے کہ یہاں القاعدہ اور طالبان دونوں مل کر اس خطے اور امریکہ کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ امریکہ نے جب اس تناظر میں پاکستان پر براہ راست ان لوگوں کو نشانہ بنایا اور ڈرون حملے کیے تو اس کا ردعمل ہونا فطری امر تھا۔ اس ردعمل کا ایک اظہار ہم نے سرحدی علاقوں میں ان طالبان قوتوں کی جانب سے حملوں کی صورت میں دیکھا۔ ابتدا میں کہا گیا کہ ہم حملے اتحادی افواج پر کریں گے لیکن بعد میں معصوم شہری بھی اس کا نشانہ بنے۔ اس کے بعد جو کھیل پاکستان میں کھیلا گیا وہ خوف ناک تھا اور پورا ملک ہی شدید قسم کی دہشت گردی کا شکار ہو گیا۔ ریاستی ادارے، ان کے اہلکار، مساجد، عبادت گاہیں، تعلیمی ادارے، مدارس اور مارکیٹوں سمیت عوامی سطح کے مراکز دہشت گردی کا شکار بنے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس ساری دہشت گردی کا نشانہ جہاں ریاستی ادارے اور ان کی ایجنسیاں بنیں، وہیں عام افراد سمیت کئی سول اور اہم لوگوں کو بھی اس کا نشانہ بنایا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں خودکش حملے ہوئے یا اب تک جاری ہیں، اس کے محرکات کیا ہیں اور کیوں یہ عمل کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں دو پہلو جواز بنا کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ افغانستان اور عراق کی طرح چوں کہ یہاں پر بھی امریکی اور اس کی اتحادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افواج موجود ہیں اور ان کے عملی اقدامات نے یہاں کے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ ان خودکش حملوں کی شکل میں اپنا ردِعمل پیش کریں۔ دوم یہ کہا جاتا ہے کہ چوں کہ ہماری ریاست نے طاقت کا استعمال اسی انداز میں جاری رکھا ہوا ہے، اس لیے لوگ اس کے ردِعمل میں بھی خودکش حملوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس دوسرے عمل میں چوں کہ ریاست کے اداروں اور ان کے اہلکاروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ردِعمل کی سیاست میں ان خودکش حملہ آوروں کا ٹارگٹ تو محض امریکہ اور اس کی اتحادی افواج اور ریاست کے ادارے اور فوج ہونی چاہیے تھی۔ اس کے برعکس سب سے زیادہ ٹارگٹ معصوم لوگوں کو بنایا جاتا ہے جن کا اس جنگ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی انتہاپسند عناصر کو ان عام لوگوں نے کبھی نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے جب عام لوگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے تو طالبان کے ان انتہاپسند عناصر کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے کہ وہ امریکہ اور اس کی اتحادی افواج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ جب نشانہ معصوم لوگ بنتے ہیں تو طالبان یا دیگر انتہاپسند عناصر کی جدوجہد کا جواز بے معنی ہو جاتا ہے۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب ''تاریخ کی آگاہی'' میں شامل مضمون ''خودکش حملے اور خودکشی'' میں لکھا ہے:

> ''ہمیں خودکش حملوں کو محض مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، ان کے پس منظر میں جو سیاسی مقاصد ہیں، ان کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اب یہ کوششیں ہوتی ہیں کہ علما سے فتوے لے کر یہ باور کروایا جائے کہ خودکش حملے مذہب کی تعلیمات کی رُو سے غلط ہیں، یہ زیادہ مؤثر نہیں ہوگا، کیوں کہ اصل وجہ بیرونی طاقتوں کا قبضہ اور ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی ہے جب تک یہ ختم نہیں ہوگی اس وقت تک خودکش حملوں کی وجہ بھی ختم نہیں ہوگی۔ اس خاص وجہ پر اس لیے بات نہیں کی جاتی کیوں کہ غیر ملکی طاقتیں مقبوضہ علاقوں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' صفحہ (118-119)

اس میں ڈاکٹر مبارک علی نے بہت اہم بات کی ہے اور ہمارے بعض دانشور اس معاملے کو محض سیاسی، مذہبی بنیادوں پر دیکھتے ہیں جس سے اس کا سیاسی پس منظر دور ہو جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جب تک ہم ان خودکش حملوں کا سیاسی حل اور سیاسی جواز تلاش نہیں کرتے یہاں اس کا ختم ہونا ایک مشکل بات ہے۔ امریکہ اور دیگر غیر ملکی طاقتوں کی یہی کامیابی ہے کہ انہوں نے اپنی دہشت گردی کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کی ہے اور ہم ان کی معاونت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں بعض عناصر مسلمانوں ہی کو محض دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلم ذہنیت میں دہشت گردی پنہاں ہے۔ حالاں کہ امریکی دہشت گردی پر بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن ہم اس سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروف مصنف برنارڈ لیوس اپنی کتاب ''اسلام کا بحران'' میں شامل مضمون ''مسلمان دہشت گرد'' میں عراق پر امریکی حملے کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''دنیا بھر کے 600 سے زائد چھوٹے اور بڑے شہروں میں کروڑوں امن پسند سڑکوں پر نکلے اور چیخ چیخ کر پکارنے لگے کہ ''تیل، خون انسانیت کے لیے بہت مہنگا سودا ہے جو کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اب تو یہ جھوٹا بھرم بھی ٹوٹ گیا ہے کہ خونخوار مسلمان چوں کہ امریکہ کے دشمن ہیں، اس لیے وہی سڑکوں پر آ کر مظاہرے کرتے ہیں اور جس طرح امریکیوں کے پتلے نذرِ آتش کرتے ہیں اور امریکی پرچم جلاتے ہیں، اس سے لگتا ہے کہ ان کا بس چلے تو یہ پوری مغربی تہذیب کو ہی نذرِ اجل بنا ڈالیں۔ یہ بھرم ٹوٹنا ہی تھا کیوں کہ دوسری خلیجی جنگ میں پوری دنیا ہی اس رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دورانِ جنگ ایک جاپانی شہری سے ملاقات کے دوران میں نے اس سے کہا کہ آپ تو امریکہ کے ساتھ ہیں اس پر اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا امریکی پالیسیوں کے خلاف سراپا احتجاج بنی ہوئی ہے۔'' (صفحہ 144-145)

یہ خیال ظاہر کرتا ہے پوری دنیا میں ایسے لوگ حکومت، ریاست اور اس سے باہر موجود ہیں، جو دہشت گردی کا حصہ ہیں اور بالخصوص امریکہ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ دہشت گردی پھیلانے کا ذمہ دار نہیں، ٹھیک تجزیہ نہیں۔ امریکہ کے مشہور دانشور اور مصنف نوم چومسکی نے اپنی کتاب ''ریاستی دہشت گردی'' میں لکھا ہے:

''امریکہ کی بین الاقوامی دہشت گردی کا واقعہ لیبیا پر حملہ تھا۔'' مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق اس میں ایک سو لوگ مارے گئے۔ اس حملے کا جواز مکر و فریب کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ذرائع ابلاغ یہ بات جانتے تھے لیکن اسے بڑی مہارت سے چھپایا گیا۔ حملے کے وقت ریگن کے شدید ناقدین بھی اس بات کے قائل تھے کہ بے گناہ شہریوں کا قتل جائز ہے اور قاتل حکومتوں سے کسی نیکی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔''

اب جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حملے کا بہانہ سراسر فراڈ تھا لیکن اس وقت 1987ء کا پلٹزر انعام جیتنے والا چارلس کروتھا اور ان جیسے صاحب الرائے کالم نگار بھی اپنے دفاع کے لیے کی جانے والی کارروائیوں پر تعریف کے پل باندھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں امریکہ کو دنیا میں اپنا کردار ادا کرنا ہوتا۔ انہوں نے اقوامِ متحدہ کی اس جرأت کی بھی مذمت کی جس میں اس حملے کو بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا گیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ''اقوامِ متحدہ مغربی خیالات اور اداروں کی جڑیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھوکھلی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کی طرف سے ''مجرموں کی پشت پناہی'' ہمیں یہ بات سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ ادارہ اپنی افادیت کھو چکا ہے کیوں کہ یہ اب امریکی احکامات کے تابع ہوگیا ہے، اس لیے جتنی جلدی اس سے جان چھڑالی جائے اتنا ہی بہتر ہے۔'' اب جو دنیا میں اقوام متحدہ کا کردار ہے اس پر مکمل امریکی کنٹرول ہے اور جو کچھ امریکہ مسلم ملکوں میں کر رہا ہے اس پر یہ ادارہ بھی بے بسی کی ایک مکمل تصویر ہے اور اس ادارے کی بے بسی نے مسلم ملکوں کے اندر ایک منفی ردِعمل پیدا کیا ہے۔

اسی تناظر میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان طالبان کی سرپرستی کس نے کی اور کیوں؟ اس وقت جب ان کو بنایا گیا ایک سیاسی ضرورت سمجھا گیا۔ جنرل ضیاالحق کے دَور میں لڑی گئی افغان جنگ کے بعد اقتدار کی تقسیم پر جو محاذ آرائی ہوئی اس میں امریکہ کا کیا کردار تھا۔ جب ان افغان لیڈروں جن کا اس جنگ میں اہم حصہ تھا، اقتدار سے دُور رکھ کر طالبان بنانے کا فیصلہ ہوا تو اس وقت امریکیوں کے علاوہ ہماری قیادت بھی اس پر متفق تھی۔ بے نظیر بھٹو کے دَور کے وزیر داخلہ نصیراللہ بابر تو صاف اقرار کرتے ہیں کہ طالبان تحریک ان ہی کے دور میں سرکاری سرپرستی و بین الاقوامی حمایت کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ پاکستان پہلے ان تین ملکوں میں شامل تھا جس نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ افغانستان کے بعد جب پاکستان میں بھی طالبان کی تحریک زوروں پر ہوئی تو اس کے ذمہ داروں میں ہماری قیادت بھی شامل تھی۔ پینٹاگون کی بیشتر ایسی رپورٹس ہیں جن میں انہوں نے الزام لگایا جنرل پرویز مشرف دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ دہرا معیار اپنائے ہوئے تھے۔ ایک طرف وہ طالبان کو ختم کرنے کی بات کرتے تھے، تو دوسری طرف وہ پس پردہ ان گروپوں کی سرکاری سرپرستی بھی کرتے تھے۔ پاکستان میں طالبان کی سرگرمیوں کے حوالے سے لوگوں میں یہ شکوک وشبہات بھی موجود ہیں کہ کیا واقعی امریکہ یہاں انتہا پسندی کو ختم کرنا چاہتا ہے کیوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال موجود ہے کہ ان انتہا پسند عناصر کو کون سی قوتیں ہیں جو اسلحہ، بارود، پیسہ اور جدید ٹرانسپورٹ مہیا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ عالمی اداروں اور بین الاقوامی ایجنسیوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ کیا امریکہ اس سارے عمل سے بے خبر ہے کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو عالمی سطح پر انتہا پسند عناصر کی سرپرستی کرتی ہیں یا اس نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستان اگر ایک بڑی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا شکار ہے تو اس میں جہاں بڑا قصور ہمارا اندرونی بحران اور تضادات پر مبنی رویوں کا ہے وہاں ہم بین الاقوامی سیاست اور امریکہ کے کردار کو بھی کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ امریکہ نے جو حکمت عملی پہلے افغانستان اور عراق میں اپنائی اور جو طریقہ کار پاکستان میں کھیلا گیا، سب میں عملاً اس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف عام لوگوں، سیاسی اشرافیہ، سیاسی جماعتوں میں ہی اتفاقِ رائے کی کمی نہیں بلکہ بعض اوقات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاست اور حکومت بھی امریکہ کے دہرے معیار کو تنقید کا نشانہ بناتی ہے۔ البتہ ہمارے ہاں چوں کہ اس دہشت گردی کے بارے میں ایک مکمل اتفاقِ رائے نہیں، لہٰذا لوگ مختلف انداز میں اس کی تشریح کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات اس بدترین عمل کا جواز بھی سامنے آجاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے اندر ایسے بہت سے لوگ انفرادی اور اجتماعی سطح پر موجود ہیں، جو ان طاقت ور مذہبی انتہاپسند گروپوں کی مدد سے انتخابی سیاست کرتے ہیں اور اس بحران نے اس ملک میں اس تضاد کو بھی مضبوط کیا ہوا ہے کہ کیا یہ دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ ہماری ہے یا ہم امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

بدقسمتی یہ رہی کہ جب لاشعوری طور پر یہ طے کر لیا گیا کہ ہم نے اس ملک کو جمہوری انداز میں نہیں چلانا اور ایسے گروہ کی سرپرستی کرنی ہے جو سیاست کے نعم البدل ہوں گے تو اس میں لسانی اور فرقہ وارانہ سیاست کو ہی فروغ مل سکتا تھا۔ ہم نے تو جان بوجھ کر اور اپنے اقتدار کے مفادات کے حصول کے لیے ان ساری بداعمالیوں کی پرورش کی اور اب ہم اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔ طالبان اور شدت پسند عناصر کو تقویت ملنے کی جہاں اور بہت سی وجوہات تھیں، ان میں ایک معاملہ معاشرے کے اندر پھیلتا ہوا سیاسی، سماجی، اور معاشی تفریق کا تھا۔ پنجاب میں خاص طور پر جو انتہاپسندی پھیلی اس میں ایک وجہ لوگوں کی معاشی اور سیاسی پس ماندگی بھی تھی۔ معاشرے میں جو بڑا سیاسی خلا تھا، اس کو ان انتہاپسند عناصر نے اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ آپ ان کے لٹریچر کو دیکھیں تو اس میں اسلامی نظام سے زیادہ طبقاتی تحریک کے عوامل تھے۔ نوجوانوں کے ذہنوں کو اس انداز سے گمراہ کرتے ہوئے ایسی تصویر پیش کی گئی کہ اگر وہ مسائل کا حل چاہتے ہیں تو انہیں بندوق اُٹھانا ہوگی۔ ہم نے دیکھا بھی کہ جو بچے یا نوجوان اس دہشت گردی میں استعمال ہوئے ان کی عمریں 12 سے 18 سال کے درمیان تھیں اور وہ پسماندہ اور غریب علاقوں کے بچے تھے۔ البتہ یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں کہ اس دہشت گردی میں شامل بچوں کے پیچھے واحد وجہ ان کا غریب ہونا ہے۔ یقیناً غربت ایک بڑی وجہ ضرور ہے لیکن جس انداز میں ان بچوں کے ذہنوں میں زہر بھرا گیا ہے اور ان کو بھارت اور امریکہ کو دشمن بنا کر دکھایا گیا اور کہا گیا کہ یہ جو کچھ مسلمانوں پر ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ غیر ملکی طاقتیں ہیں۔ ان میں اس کے عوام بھی شامل ہیں تو اس نے ان کے اندر ایک ردِعمل کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔

اسی طرح سیاسی اتفاقِ رائے کی کمی بھی دہشت گردی کے خاتمے میں اہم رکاوٹ ہے۔ اس پر معروف صحافی عقیل یوسف زئی نے اپنی کتاب ''آپریشن ناتمام'' میں شامل مضمون ''طالبانائیزیشن پر سیاسی پارٹیوں کا ابہام'' میں لکھا ہے:

> ''مسلم لیگ (ن)، تحریک انصاف اور جماعت اسلامی سمیت تمام دینی جماعتیں پاکستان میں جاری دہشت گردی کی بدترین کارروائیوں کو امریکہ کے خلاف مزاحمت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے نتھی کر کے پاکستان کی سلامتی اور استحکام کے حوالے سے واضح مؤقف اپنانے کی بجائے بالواسطہ انتہاپسندوں کا ساتھ دینے کی غیر اعلانیہ مگر عملی پالیسی پر گامزن ہیں۔ اس صورتِ حال کا یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جو سیاسی اور مذہبی قوتیں، جہادی اور عسکری تنظیموں کے قیام اور نشوونما کو محض انٹیلی جینس اداروں یا فوج کے کھاتے میں ڈال کر خود کو اس عمل سے بری الذمہ قرار دینے میں مصروف ہیں، کسی نہ کسی حد تک خفیہ اداروں اور فوج کی یوٹرن پالیسی کے سامنے آنے کے باوجود اپنے طور پر اب بھی جہادی اور عسکری قوتوں کے ساتھ ہمدردی اور معاونت کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ وفاقی حکومت کی کمزوری یا مصلحت اندیشی کی بھی یہ حالت ہے کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ حکومت میں اگر اے این پی، ایم کیو ایم جیسی طالبان مخالف پارٹیاں بیٹھی ہیں، تو طالبان کے فکری استادوں اور پشت پناہوں کی پارٹی جے یو آئی مولانا فضل الرحمٰن بھی اس اتحاد کا ایک اہم حصہ ہیں۔" (صفحہ 155-156)

عقیل یوسف زئی نے ٹھیک تجزیہ کیا ہے۔ خود اے این پی اور پیپلز پارٹی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ذہنی طور پر طالبان کی فکر کے حامی ہیں اور انتخابی سیاست میں وہ اس حمایت کو ووٹ کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ خود بے نظیر بھٹو اور ان کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر تو طالبان کی تشکیل کا کریڈیٹ بھی لیتے ہیں اور ان کے بقول ان کو بنانا پاکستان کی سٹریٹجک ضرورت تھی۔ اسی تضاد کی وجہ سے آج بھی پاکستان کے اندر یہ بحث موجود ہے کہ جنگ ہماری نہیں بلکہ امریکہ کی ہے اور ہم اس میں کرائے کے فوجی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدلیہ کے نظریۂ ضرورت کی کہانی

پاکستان میں جمہوریت کے کمزور ہونے میں جہاں بہت سے اداروں کی ناکامی یا کمزوری کا ہاتھ ہے، وہیں ہم عدلیہ کے نظریۂ ضرورت کی کہانی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی جمہوری معاشرے کو سیاسی استحکام دینے میں عدلیہ کا کردار سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے کیوں کہ جتنی عدلیہ آزاد ہوگی اور اس کے فیصلے انصاف کے قریب ترین ہوں گے۔ اتنا ہی جمہوری نظام نہ صرف مضبوط ہوگا بلکہ خود کو جواب دہی کے تابع کرے گا۔ اسے ایک طرح کی خود احتسابی بھی قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ملکی تاریخ میں ہم جمہوری عدم استحکام کا شکار رہے ہیں اور اس میں عدلیہ بھی ایک اہم فریق کے طور پر موجود رہی ہے۔ نظریۂ ضرورت کی سیاست جہاں اہل سیاست نے کی، وہاں اعلیٰ عدالتیں بھی اس نظریۂ ضرورت کی سیاست اور سیاسی حوالوں سے کیے جانے والے بڑی عدالتی فیصلوں میں غالب نظر آتی ہیں کیوں کہ اس ملک میں عدالتیں کبھی آزاد نہیں رہیں۔ ویسے بھی ایک ایسے معاشرے میں جہاں سیاست اور ریاست و حکومت کا فیصلہ اور ان کا طرزِ عمل پس پردہ قوتوں کی مدد سے ہوتا ہو، وہاں آزاد ادارے بالخصوص آزاد عدلیہ کا تصور کرنا ان بالادست قوتوں کو قبول نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آزاد عدلیہ کبھی ہماری ریاست اور حکومت کی ترجیحات کا ایجنڈا نہیں رہا۔ ریاست میں موجود ہر فریق اور برسر اقتدار آنے والی تمام حکومتوں نے اس ادارے کا سب سے زیادہ سیاسی استحصال کیا اور کوشش کی کہ عدالتوں نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق فیصلے کروائے جائیں۔ سیاسی جماعتوں کا یہ وتیرہ بھی ہے کہ جب وہ حکومت میں ہوتی ہیں تو عدلیہ آزاد ہوتی ہے اور اگر حزبِ اختلاف کا حصہ ہوں تو انہیں عدلیہ قید نظر آتی ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دورِ اقتدار کے آخری حصہ میں اس ملک میں ایک شان دار وکلا تحریک بھی لوگوں کو دیکھنے کو ملی جس کا بنیادی نعرہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور دیگر ججوں کی بحالی اور آزاد عدلیہ کا قیام تھا۔ یاد رہے کہ 2007ء میں آرمی چیف و صدر پرویز مشرف نے پہلے چیف جسٹس آف پاکستان کو معطل کیا لیکن انہیں عدلیہ نے بحال کر دیا۔ اس کے بعد جنرل پرویز مشرف نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے متعدد ججوں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا تھا۔ پہلی بار لوگوں کے سامنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عدالتوں میں موجود اہم افراد نے آمریت اور فوجی حکمران کے خلاف ''نہ'' کہنے کی ہمت کی اور اس عمل نے ایک بڑی تحریک کا سماں پیدا کر دیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ملک میں منتخب حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد جنرل پرویز مشرف کے جلد رخصت ہو جانے کی ایک بڑی وجہ وکلا کی تحریک تھی اور اسی تحریک نے ان قوتوں کو مجبور کیا کہ وہ جنرل پرویز مشرف کی رخصتی کا سامان پیدا کریں۔ اس پوری تحریک میں آزاد عدلیہ کی بہت سی باتیں کی گئیں اور ٹی وی پر ہر دانشور اسے آزاد عدلیہ کی تحریک سے تعبیر کرتا رہا۔ یہ الگ بات ہے اور اس پر بحث کی ضرورت ہے کہ کیا یہ وکلا تحریک ایک آزاد عدلیہ کی تحریک تھی یا اس تحریک کو محض چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک تک محدود کر کے دیکھا جانا چاہیے۔ یہ کہنا کہ چیف جسٹس کی بحالی کے بعد ملک میں عدلیہ آزاد ہے ایک جذباتی خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن عملاً ہماری کہانی اس سے مختلف ہے۔ اس پر بھی بات کرنا مشکل ہوتا ہے کہ از خود چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کس انداز میں بحال ہوئے اور وہ کون سی پس پردہ قوتیں تھیں جو ان کی بحالی سے قبل بحالی کی شرائط طے کر رہی تھیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اس تحریک میں عام لوگ ایک طاقت بنے لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ آیا اس تحریک کا جو نتیجہ نکلا وہ عوامی خواہشات پر مبنی تھا یا اس میں پس پردہ قوتوں کے مفادات کو تقویت دے کر آزاد عدلیہ کے نعرے کا رُخ موڑا گیا۔

پاکستان میں جو سیاسی بحران ہے اور ہمارے سیاسی ادارے کمزور ہیں تو اس کی تاریخ عدلیہ کے نظریۂ ضرورت کے فیصلوں سے منسلک ہے۔ ہر بار جب اسمبلیاں فوجی ڈکٹیٹرشپ کی وجہ سے ٹوٹیں یا مارشل لاء لگائے گئے، تو ان غیر قانونی اقدامات کو سیاسی جواز بھی عدلیہ اور اس کے ججوں نے فراہم کیا۔ نظریۂ ضرورت عدلیہ کی ہی ایجاد ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے جب 12 اکتوبر 1999ء کو ایک منتخب حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس وقت کی عدلیہ، جس میں موجودہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بھی شامل تھے، نے ایک قدم آگے بڑھ کر نہ صرف ان کے اس غیر آئینی اقدام کو جواز فراہم کیا بلکہ ان کو موقع دیا کہ وہ تین برس تک اس ملک میں اپنی مرضی کی قانون سازی بھی کر سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ مولوی تمیز الدین کے مقدمہ میں اگر ہماری پہلی منتخب اسمبلی کو توڑنے کے عمل کو جائز قرار نہ دیا جاتا تو یقیناً آج اس ملک کی سیاسی تاریخ مختلف ہوتی اور ہم شاید ایک مضبوط سیاسی پاکستان کو دیکھ رہے ہوتے۔ جسٹس منیر کے وضع کردہ نظریۂ ضرورت کی کہانی آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ محمد خان جونیجو، نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کی حکومتوں کو برطرف کرنے کے کھیل میں جہاں فوجی حکمران صورت حال کے ذمہ دار تھے، وہیں ہماری عدلیہ بھی خود کو ان الزامات سے بری قرار نہیں دے سکتی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو جو پھانسی دی گئی، اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ان کا عدالتی قتل ہوا اور اس فیصلے نے ہماری سیاسی تاریخ پر جو منفی اثرات چھوڑے، اس کی سزا ہم آج تک سیاسی عمل کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جب جنرل یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تو سپریم کورٹ نے جنرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یحییٰ خان کے مارشل لاء کو ناجائز قرار دے دیا۔ چیف جسٹس حمود الرحمان نے دوسو کیس میں پیش کردہ کیسن کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

''میں فاضل چیف جسٹس (محمد منیر) کا مکمل احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے کیس کے نظریہ کی تاویل میں اور اپنے سامنے پیش آمدہ حالات و واقعات پر اس کے انطباق میں غلطی کی۔ انہوں نے جو اصول پیش کیا اسے بالکل حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ مارشل لاء کے اعلان کے ساتھ ہی ازخود لازماً مسلح افواج کے کمانڈر کو یہ اختیار مل جاتا ہے کہ وہ اس دستور کو منسوخ کر دے جس کا تحفظ اس کا فرض تھا۔''

اسی طرح جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کو بھی سپریم کورٹ نے جائز قرار دیا اور اعلیٰ عدالت نے 10 نومبر 1977ء کو اپنے فیصلے میں 5 جولائی 1977ء کو نافذ ہونے والے مارشل لاء کو آئینی ضرورت قرار دیتے ہوئے بیگم نصرت بھٹو کی درخواست مسترد کر دی۔ چیف جسٹس انوار الحق نے اپنے فیصلے میں لکھا:

''عدالت واشگاف انداز میں بیان کرتی ہے کہ وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اقدام کو جائز قرار دیتی ہے اور یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اس نے گمبھیر ماورائے آئین قسم کے قومی اور آئینی بحران کے موقع پر ملک کو بچایا بلکہ اس کی طرف سے ایک سنجیدہ وعدہ بھی کیا گیا کہ آئینی تعطل کو جتنی جلد ممکن ہوا، ختم کر دیا جائے گا۔''

اس فیصلے کے بعد ہم سب کو معلوم ہے کہ جنرل ضیاالحق نے 8 برس تک آئین کو معطل کیے رکھا اور سپریم کورٹ میں یقین دہانی کے باوجود آئین کچھ عرصے میں بحال نہیں ہو سکا اور اس پر عدالت خاموش رہی۔ اسی طرح عدالت کی جانب سے ایک اہم فیصلہ حاجی سیف اللہ کیس میں بھی تھا جس میں جنرل ضیاالحق کی جانب سے 1985ء کی اسمبلی کی برطرفی کا معاملہ تھا۔ اس پر عدالت نے اگرچہ جنرل ضیاالحق کے اسمبلی توڑنے کے اقدام کو ناجائز اور غیر آئینی قرار دیا لیکن ساتھ ہی نظریۂ ضرورت کے تحت اسمبلی کو بحال نہ کرنے کا اعلان کر کے فوجی اقدام کو جائز بھی قرار دے دیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے 27 ستمبر 1988ء کو فیصلہ دیتے ہوئے لکھا:

''ہم جنرل ضیاالحق کی جانب سے 29 مئی 1988ء کو اسمبلی توڑنے کے اقدام کو غیر قانونی اور بلاجواز قرار دیتے ہیں کیوں کہ اسمبلی توڑنے کے بارے میں مذکورہ حکم میں دی ہوئی وجوہات اس قدر مبہم ہیں کہ ان کی بنیاد پر اسمبلی کو توڑا نہیں جا سکتا۔''

فاضل عدالت نے اپنے فیصلے میں قرار دیا کہ متذکرہ صدارتی حکم کالعدم ہونے کے باوجود درخواست دہندگان کسی دادرسی کے مستحق نہیں کیوں کہ اسمبلی کے بحال ہونے سے ملک کو آئینی اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوری حکومت کی طرف لوٹانے کے عمل میں رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے اور یہ مقدمہ اس نوعیت کا ہے کہ آئین کی دفعہ 199 کے تحت درخواست دہندگان کی دادرسی غیر مناسب ہوگی۔ فاضل عدالت نے اپنے فیصلے میں عام انتخابات کے لیے مقرر کی گئی 16 نومبر کی تاریخ کا بھی نوٹس لیا اور قرار دیا کہ اسمبلیوں کو اس وجہ سے بھی بحال نہیں کیا جارہا کہ مقررہ تاریخ پر انتخابات منعقد کیے جاسکیں۔ اگر اس مقدمے میں اسمبلی بحال ہوجاتی تو آگے جاکر 1988ء، 1990ء، 1993ء، 1997ء اور 1999ء کی اسمبلیوں کو توڑنے کے اقدامات شاید روکے جاسکتے تھے لیکن نظریہ ضرورت کے قانون کے تحت یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوسکا۔

اسی طرح ظفر علی شاہ کیس میں جب جنرل مشرف کے فوجی مارشل لاء کے اقدام کو چیلنج کیا گیا تو اس پر بھی ہماری عدالت نے جو فیصلہ دیا، وہ بھی نظریہ ضرورت کی بدترین مثال تھا۔ اس فیصلہ میں کہا گیا:

> ''چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف کی طرف سے عوام کی بھلائی کے لیے آئین ختم کرنے اور مارشل لاء لگانے کی بجائے آئین سے وقتی طور پر انحراف کیا گیا ہے اور اسے ریاستی نظریے اور عوامی مفاد کے اصول پر جائز اور مؤثر قرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ حکومت کو اس اصول پر بھی جائز اور درست قرار دیا جاسکتا ہے کہ عوام پر حکمرانی اس کے منشا کے مطابق ہونی چاہیے، چاہے وہ ووٹ سے ہو یا بغیر ووٹ کے۔ عدالت یہ سمجھتی ہے کہ عمومی طور پر عوام نے اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بلاامتیاز شفاف انتخابات چاہتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ عدالت نے یہ کیسے جج کرلیا کہ لوگ اس اقدام پر خوش ہیں اور وہ فوجی حکمرانوں سے شفاف انتخابات کے خواہش مند ہیں اور یہ کہنا کہ اچھی حکمرانی ووٹ کے بغیر بھی ہو تو وہ سب کے لیے قابل قبول ہے، یہ ایک عجیب منطق کے زمرے میں آتا ہے۔

معروف صحافی سہیل وڑائچ اپنی کتاب ''عدلیہ کے عروج و زوال کی کہانی'' کے صفحہ 09 پر لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی عدلیہ کی 60 سالہ تاریخ قابل رشک نہیں رہی گو کہیں کہیں اندھیرے میں جگنو چمکتے رہے لیکن مجموعی طور پر اہم سیاسی فیصلوں پر مصلحت سے کام لیا گیا اور عدلیہ اسٹیبلشمنٹ کا دست و بازو بنی رہی جس کی وجہ سے آمروں اور فوجی طالع آزماؤں کے لیے جمہوری نظام کی بساط کو لپیٹنا تر نوالہ ثابت ہوتا رہا۔ عدلیہ کے فیصلوں کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اگر اہم ترین سیاسی فیصلوں میں مصلحت سے کام نہ لیا جاتا تو پاکستان کبھی جمہوریت کی پٹڑی سے نہیں اُترتا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ 60 سال جمہوریت چلتی رہتی تو آج کے پاکستان کی روایات کچھ اور ہوتیں اور ہم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم اسلام میں پہلے جمہوری ملک کی حیثیت سے نئی روایات کی داغ بیل ڈال چکے ہوتے۔ لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکا اور ہم ہر چند سال بعد جہاں کئی سیاسی آزمائشوں سے گزرتے ہیں، وہاں کسی نہ کسی عدالتی بحران کا بھی شکار رہتے ہیں۔''

سہیل وڑائچ نے ٹھیک لکھا ہے کہ اگر نظریہ ضرورت نہ ہوتا تو آج ہماری سیاسی تاریخ مختلف ہوتی اور ہم ایک جمہوری معاشرے کے طور پر دنیا میں حکمرانی کر رہے ہوتے اور پاکستان آج جمہوری تناظر میں دنیا کے سامنے کسی سیاسی تنہائی کا شکار نہ ہوتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اس ملک میں محض عدلیہ ہی اپنا مؤثر کردار ادا کرتی تو اس ملک کو بہتر انداز میں چلایا جا سکتا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی معاشرے میں کوئی ایک ادارہ سیاسی تنہائی میں جمہوری کردار ادا کر سکتا ہے۔ اگر سوال کسی بھی ادارے کی مضبوطی کا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھیں فوج بھی تو ایک مضبوط ادارہ تن تنہا بن گئی ہے اور یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ مگر جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ کیا فوج نے بطور جمہوری ادارہ ترقی کی تو اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ جب ریاست اور حکومت خود ہی غیر جمہوری انداز میں چلے گی تو ظاہر ہے اس کا اثر براہِ راست اداروں سمیت عدلیہ پر بھی ہوگا اور ہر ادارہ سیاسی استحصال کا شکار ہو جائے گا۔ خود اعلیٰ عدلیہ میں ہمارے معزز ججوں نے ماورائے آئین حلف اٹھائے اور فوجی اقدامات کی توثیق کر کے ثابت کیا کہ وہ بھی اسی طرح کے غیر قانونی عمل میں پیش پیش ہیں، جو باقی لوگ بھی کر رہے ہیں۔ پاکستان میں عدلیہ کو سیاسی مقاصد کے لیے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے میں یقیناً ہماری سول اور فوجی حکومتیں بنیادی ذمہ دار ہیں۔ انہی کے طرزِ عمل سے جمہوریت کی گاڑی اپنے راستے سے بھٹک جاتی رہی ہے اور اس عمل کو ہماری اعلیٰ عدلیہ کا سہارا حاصل رہا۔

ایک طرف نظریہ ضرورت والی عدلیہ نے سیاست دانوں کے دباؤ یا لالچ میں ان کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا تو دوسری طرف وہ فوج اور اسٹیبلشمنٹ کی بی ٹیم کا بھی کردار ادا کرتی رہی۔ جسٹس سجاد علی شاہ کے دور میں سپریم کورٹ پر حملہ کی جہاں مسلم لیگ (ن) ذمہ دار تھی، وہاں اعلیٰ عدالتوں میں موجود بعض ججوں کا سیاسی کردار بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جو ان واقعات کا محرک ثابت ہوا۔ جسٹس افتخار محمد چودھری کے خلاف جو ریفرنس بھیجا گیا، وہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ ہم عدالتوں اور اس میں موجود ججوں کو اپنا ماتحت سمجھتے ہیں۔ ججوں نے اپنے فیصلوں سے بہت سے بڑے مقدمات میں ثابت کیا وہ کہ آزاد جج نہیں تھے، جن میں بالخصوص فیڈریشن آف پاکستان مولوی تمیز الدین کیس، مس عاصمہ جیلانی بنام حکومت پنجاب، نصرت بھٹو کیس، بھٹو صاحب کی پھانسی، سیاسی حکومتوں کے خاتمے جیسے مقدمات شامل تھے۔

پاکستان کی عدالتی تاریخ میں جسٹس دراب پٹیل کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''پاکستان میں آمریت اور ججوں کا کردار'' میں ججوں کی جانب سے نظریہ ضرورت کے اصول کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارے میں لکھا ہے:

''مجھے ان آراء سے اتفاق نہیں۔ اگر کسی جج کو یقین تھا کہ مارشل لاء کے ذریعے 1962ء کے دستور کی تنسیخ غیر قانونی ہے تو اس نے جج کی حیثیت سے کام کر کے حلف کی خلاف ورزی کی ہے۔ چنانچہ 1969ء میں جب مارشل لاء کا اعلان کیا گیا تو جج کی حیثیت سے ہمارا فرض اور ذمہ داری تھی کہ ہم یہ فیصلہ کرتے کہ آیا ہمیں استعفیٰ دے دینا چاہیے یا اپنے فرائض بدستور سرانجام دینے چاہئیں۔ یہ فیصلہ اخلاقیات کے اصولوں پر ہوتا نہ کہ قانونی موشگافیوں کی بنیاد پر، اپنے آپ پر عائد ہونے والی اخلاقی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کر کے اسے دوسروں کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔'' (صفحہ 82)

جسٹس یعقوب علی نے اس مسئلے کا سامنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس شخص کو، جو ناجائز طریقے سے ملک کے قانونی ڈھانچے کو تہس نہس کر دیتا ہے، قانون سازی کا ماخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ ریاست کا سخت گیر ہتھیار رکھنے کے باعث عوام اور عدالتیں وقتی طور پر چپ سادھ لیں لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ غاصب کی طرف سے مسلط کیا جانے والا کوئی بھی حکم غیر قانونی ہی رہے گا اور عدالتیں اس کی کارروائیوں اور ضابطوں کو ہرگز قانونی درجہ نہیں دیں گی۔ جیسے ہی غاصب کے ہاتھوں سے یہ ظالمانہ ہتھیار گر جائے، اس پر غداری کا مقدمہ چلا کر اسے قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔ آنے والے وقتوں میں اس قسم کے مہم جوؤں کے سدباب کا یہی واحد طریقہ ہے۔''

کاش اس پر عمل ہو جاتا تو یقیناً آج ہماری عدالتی تاریخ کافی مختلف ہوتی اور جرنیل اور جج کی مدد سے کھیلے جانے والے مہم جوئی کے اس کھیل کو بھی مستقل طور پر روکا جا سکتا۔ جنرل پرویز مشرف نے بھی جب فوجی حکمرانی کی مہم جوئی کی تو ہمارے ججوں، جن میں جسٹس افتخار محمد چودھری بھی شامل تھے، نے فوجی حکمران کو تین سال کے لیے قانون سازی کا اختیار دے کر آزاد عدلیہ کے معاملے کو سخت نقصان پہنچایا اور نظریہ ضرورت کا یہ کھیل ججوں اور فوجی حکمرانوں کی ملی بھگت سے جاری رہا۔

اب جب کہ ہم پاکستان میں ججوں کی جانب سے انتظامی اور سیاسی امور میں بڑھتی ہوئی مداخلت اور ججوں کا بالخصوص سیاسی طرز عمل دیکھ رہے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ججوں کو انصاف فراہم کرنے سے زیادہ سیاست کرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ یہاں بعض جج روزانہ سیاسی و سماجی تقریبات کا حصہ بنتے ہیں، حکمرانوں کی دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں اور میڈیا کے دوستوں کے ساتھ سیاسی معاملات پر بیان بازیاں بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے اور اس سے ججوں کا خود

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غیر سیاسی رکھنے کا دعویٰ بہت دُور چلا جاتا ہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری نے 2009ء میں جس انداز میں
جسٹس خلیل الرحمان رمدے کی ایڈہاک تقرری اور جسٹس خواجہ شریف کی بطور لاہور ہائی کورٹ چیف
جسٹس کی تقرری کے حوالے سے اپنے اختیارات کا استعمال کیا، اس سے کوئی اچھا تاثر نہیں اُبھرا۔ جسٹس
خواجہ شریف نے کچھ عرصہ پہلے ڈی جی خان میں وکلا برادری کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا
کہ جنوبی پنجاب کے لوگ تخت لاہور پر اپنی پسماندگی کا تو رونا روتے ہیں لیکن اپنے سرداروں اور وڈیروں
کا ذکر نہیں کرتے جو ان کی بربادی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ اسی طرح لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس
(ریٹائرڈ سابق) ایک بڑی سیاسی جماعت کے رہنما کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کا ذکر بھی مختلف محفلوں
میں کر کے بہت سے لوگوں کے اندر بہت سے سوالوں کو جنم دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بعض ججز، جن
میں چیف جسٹس بھی شامل ہیں، مختلف مقدمات کی سماعت کے دوران فیصلے سے قبل ہی سیاسی فقرے جاری
کرتے ہیں اور اس میں ان کا تحکمانہ انداز بھی مخالفین کے بارے میں نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ ہمارے ججوں کو اخبارات کی سرخیوں میں اپنے آپ کو پیش کرنے کا شوق پیدا ہو گیا اور وہ دیکھتے ہیں
کہ کون سا بیان کتنی بڑی سرخی کے ساتھ ان کی شخصیت کے پہلوؤں کو نمایاں کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے وکلا تحریک کے ختم ہونے اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کے
بعد حکومت اور عدلیہ کے درمیان جو بڑی سیاسی محاذ آرائی دیکھی اور جو اب تک کسی نہ کسی انداز میں چل
رہی ہے وہ ایک مثبت پہلو نہیں۔ یہ طرزِ عمل آزاد عدلیہ کے مقابلے میں اسے سیاسی ادارہ بنانے کی
خطرناک کوشش ہو سکتی ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ملک کی ایک جماعت کے سربراہ نے صاف عوامی
جلسوں میں کہا کہ ہماری عدلیہ سیاست کی نذر ہو گئی ہے اور وہ رات کے ٹی وی ٹاک شو دیکھ کر فیصلے کرتی
ہے۔ حکومت کی جانب سے یہاں تک کہا گیا کہ عدلیہ میں بعض ججز اسے ختم کرنے کی سازشوں میں
مصروف ہیں۔ آزاد عدلیہ میں ججز کی سب سے اہم ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ انصاف ان کی شخصیتوں
سے نہیں بلکہ ان کے فیصلوں سے نظر آتا رہے اور ججز جس حد تک اپنے آپ کو سیاسی معاملات، سیاسی
محفلوں اور سیاسی شخصیات سے دُور رکھیں گے اتنا ہی آزاد عدلیہ کا عمل مضبوط ہو گا۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں
کہ اس ملک میں کسی بھی سائل کے لیے انصاف کا حصول بہت مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔ اگرچہ اب
عدالتوں میں تیزی آئی ہے اور معاملات کو جلد نمٹانے کا عمل شروع ہو چکا ہے، اس کے باوجود عدالتوں
میں انصاف کی تذلیل اور انصاف کو خریدنے کی باتیں بھی عام ہیں۔ ہماری عدالتیں اور ان سے متعلق ججز
اور وکلا بھی اپنے اندر ایک خاص قسم کی طبقاتی تقسیم کو مدنظر رکھتے ہیں اور ان کی جانب سے مجرم کی سیاسی،
سماجی اور معاشی حیثیت اور طاقت کو دیکھ کر معاملات کو ڈیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ جس ملک میں انصاف کے حصول کا عمل خود انصاف کا طلب گار ہو، وہاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انصاف کے عمل کو مضبوط بنانا اور ہر کسی کی اس تک باآسانی رسائی کوئی آسان کام نہیں۔ آزاد عدلیہ ایک بڑا چیلنج ہے اور بدقسمتی سے ہماری سیاسی طاقت کے بڑے مراکز اور کھلاڑی بھی عدلیہ کو حقیقی طور پر آزاد کرنے یا دیکھنے کی بجائے اسے اپنا تابع بنانے کے زیادہ خواہش مند نظر آتے ہیں۔ ہم اکثر اپنے اہل سیاست اور اہل دانش سے آزاد عدلیہ کی باتیں اور بڑے بڑے دعوے سنتے ہیں لیکن عملاً ان کا اپنا طرزِ عمل ان عدالتوں کے بارے میں غیر جمہوری ہوتا ہے۔ ہماری عدلیہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کے بعد اس بات کا برملا اعتراف کرتی تھی کہ اب ملک میں آزاد عدلیہ کا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ جن بڑے نعروں کے ساتھ عدلیہ یا چیف جسٹس بحال ہوئے تھے، اس پر اب تک کچھ نہیں ہو سکا جن میں لال مسجد کا سانحہ، اکبر بگٹی کا قتل، کراچی میں 12 مئی کا سانحہ اور لاپتہ افراد کے معاملے سمیت جنرل پرویز مشرف کا احتساب شامل تھا۔ یہ سب نعرے اب کہیں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور اس نے اس تاثر کو مضبوط کیا ہے کہ ہماری عدلیہ اب بھی بہت سے معاملات میں آزاد نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بعض لوگ حکومت اور عدلیہ کے درمیان صورت حال کو بگاڑنے کے لیے یہ بات بھی کرتے ہیں کہ پارلیمنٹ سپریم نہیں بلکہ اعلیٰ عدالتیں قانون سازی کا حق رکھتی ہیں اور پارلیمنٹ میں کیے گئے فیصلوں اور قانون سازی کو عدالتیں ختم کر سکتی ہیں۔ ججوں کی تقرری پر بھی ہم فردِ واحد ہی کو یہ اختیار دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی تقرری کرے اور اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کوئی جیوڈیشل کمیشن بنے اور اس میں پارلیمنٹ کے ارکان ہوں جو ججوں کی تقرری کو ایک مشاورتی عمل سے یقینی بنائیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھٹو صاحب کا عدالتی قتل

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے المیوں پر نظر ڈالیں تو ان میں ایک بڑا المیہ پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ اور معروف قومی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی تھی جس نے معاشرے کے مجموعی مزاج میں نہ صرف سیاسی تلخیوں کو جنم دیا بلکہ معاشرہ ایک بڑے سیاسی انتشار کا بھی شکار ہوا۔ پاکستانی سیاست کا پرامن اور اینٹی بھٹو میں تبدیل ہونا اور اس میں حد سے زیادہ پیدا ہونے والی تلخیوں میں بھٹو صاحب کی پھانسی کا بڑا عمل بھی شامل تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اگرچہ ایوب خان کے مارشل لاء کے دوران اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا لیکن جب انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو وہ ایک بڑے لیڈر کے طور پر سامنے آئے اور انہوں نے اس پریشان حال قوم کے اندر ایک نئی سیاسی طاقت پیدا کی، یعنی ایک طرح سے اسے آکسیجن فراہم کی۔ عام اور متوسط طبقہ عملاً بھٹو صاحب کی سحر انگیز شخصیت سے مرعوب ہو گیا اور ملک کے چاروں طرف بھٹو صاحب زندہ باد کے نعرے گونجنے لگے۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا المیہ ہے کہ یہاں قیادتوں کو سیاسی انداز میں ختم کرنے کی بجائے انہیں ریاستی طاقت اور بندوق کے زور پر ختم کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو ہی کی ایک مثال نہیں بلکہ لیاقت علی خان، بے نظیر بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو کا قتل اور جنرل ضیاء الحق کے طیارے کا حادثہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام واقعات پر ریاست اور بالادست طبقوں نے پردہ ڈالے رکھا اور ان واقعات کی تحقیقات کروانے کی بجائے خاموشی کا راستہ اختیار کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی سیاست کے پہلے رہنما تھے، جو اسٹیبلشمنٹ کے قومی سیاست میں حد سے زیادہ بڑھتے ہوئے عمل دخل پر صرف عوامی قیادت کا علم لے کر اٹھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جماعت ایک بڑی عوامی طاقت میں تبدیل ہوئی اور اس کا کریڈٹ سوائے بھٹو صاحب کے کسی اور کو نہیں جاتا۔ انہوں نے عملاً چار بڑے نکات کے ساتھ اپنی سیاست کا آغاز کیا، جو یہ ہیں: اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

جہاں تک بھٹو صاحب کے خلاف مقدمے کا تعلق ہے جس کی بنا پر انہیں تختہ دار پر لٹکایا گیا، اس میں ان پر الزام عائد کیا گیا کہ ان کے حکم پر فیڈرل سیکیورٹی فورس نے نومبر 1974ء میں قومی اسمبلی کے رکن احمد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رضا قصوری کے والد نواب محمد خان کے قتل کا اہتمام کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ احمد رضا قصوری اور ان کے وا
نواب احمد خان پر فائرنگ کی گئی تھی جس کے نتیجہ میں نواب محمد احمد خان قتل ہوئے۔ احمد رضا قصوری
پیپلز پارٹی کے بنیادی ارکان میں سے تھے اور انہیں بھٹو صاحب سے یہ شکایت تھی کہ انہیں وزارت
کیوں محروم رکھا گیا اور اس حوالے سے مایوسی نے انہیں بھٹو صاحب کا ساتھ چھوڑنے اور پارٹی
علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پارٹی سے علیحدگی کے بعد احمد رضا قصوری نے بھٹو صاحب اور پارٹی
شدید تنقید بھی کی لیکن بعد میں بھٹو صاحب اور قصوری صاحب میں کچھ مفاہمت بھی ہو گئی تھی۔ اس
مفاہمت کے نتیجے میں قصوری صاحب نے دوبارہ عام انتخابات میں پارٹی کے ٹکٹ کے لیے درخواست
بھی دی، جو منظور نہیں کی گئی۔ ابتدا میں احمد رضا قصوری کا یہ اعتراف بھی شامل تھا کہ بھٹو صاحب کا ان
والد کے قتل کے واقعہ سے براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں اور انہوں نے اس قتل کے واقعہ کے بعد
لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج کے تحت قائم ہونے والے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر بھی اطمینان کا اظہار
کیا تھا۔ لیکن 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاالحق کے مارشل لاء کے بعد احمد رضا قصوری نے جناب بھٹو
خلاف درخواست دائر کی کہ انہوں نے ان کے والد کے قتل کی سازش کی۔ الزامات فیڈرل سکیورٹی
سربراہ مسعود پر لگائے گئے تھے۔ اس نے اپنی گرفتاری کے بعد اس سازش میں بھٹو صاحب کے کردار
تصدیق کرنے کے لیے سلطانی گواہ بننا قبول کر لیا اور اس کے عوض میں اس کے خلاف مقدمات ختم کر
کا وعدہ کیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو صاحب کے خلاف مقدمے کی سماعت پانچ ججوں پر مشتمل بنچ
نے کی جب کہ عموماً دو ججوں پر مشتمل بنچ ایسے مقدمے کی سماعت کرتا ہے۔ جسٹس ہمدانی اور جسٹس مظہر عا
کو بنچ میں شامل نہیں کیا گیا تھا، حالاں کہ انہوں نے بھٹو کے خلاف مقدمے کی ابتدائی سماعت کی تھی اور
قانونی روایت کے مطابق ان دونوں کو مقدمے کی سماعت کرنے والے بنچ میں شامل کرنا ضروری تھا۔ لیکن
اس روایت کی خلاف ورزی کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو شامل نہ کرنے کی وجہ ان کا ابتدائی سماعت
دوران بھٹو کی ضمانت منظور کرتے ہوئے ان کی رہائی کا حکم دینا تھا۔ برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز نے
21 مئی 1978ء کے اپنے اداریہ میں لکھا تھا: ''بھٹو کے مقدمے کی چھے ماہ طویل سماعت خود اس بات کی
ٹھوس شہادت فراہم کرتی ہے کہ عدالتی کارروائی پر سیاسی رنگ غالب رہا اور ان کے منصفانہ اور غیر جانب
دارنہ سماعت کے حق سے اگر مکمل انکار نہیں تو اس میں کافی حد تک ضرور تخفیف ملتی ہے۔''

اسی اخبار نے اپنے 20 مارچ 1978ء کے اداریہ میں لکھا تھا:

''اگر مسٹر بھٹو کو سزائے موت دے دی جاتی ہے تو لازمی طور پر اس کو منصفانہ نہیں بلکہ
اسے ایک خطرناک سیاسی مخالفت کا قتل سمجھا جائے گا۔''

محترمہ نصرت بھٹو نے اسی عدالتی تعصب کی بنا پر چیف جسٹس انوار الحق کے نام ایک کھلا خط

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لکھا تھا اور اسے بشیر ریاض نے بھٹو صاحب کی جیل میں لکھی گئی تحریروں پر مبنی کتاب ''میرا لہو'' میں شائع کیا۔ صفحہ 112-111 پر شائع شدہ اسی خط میں نصرت بھٹو نے لکھا ہے:

''مسٹر چیف جسٹس! یقین کیجیے اگر اس وقت میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ نہ کر رہے ہوتے تو آپ کے ان جھوٹے بیانات سے مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ ایسے متنازعہ خیالات کا اظہار کرنے کے بعد کیا آپ میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ لکھنا اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ بہرحال بنچ کے دیگر ارکان کے بارے میں میرا اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے۔ لیکن ایسے ناموزوں موقع پر آپ کی جانب سے افسوس ناک بیان کے بعد آپ کے فیصلے کو یقیناً شک کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میں آپ کو انصاف کے مفاد اور عدلیہ کے اداروں کے استحکام کا واسطہ دے کر زور دیتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کی اپیل پر فیصلہ نہ لکھیں۔ میں انتہائی افسوس کے ساتھ یہ درخواست کرنے پر مجبور ہوئی ہوں کیوں کہ آپ نے ایسے نازک موقع پر اپنے آپ کو مکمل طور پر فوجی حکومت سے وابستہ کیا جب کہ آپ نے ابھی مکمل فیصلہ نہیں لکھا ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب کے ساتھ جیل میں خاصی بہ سلوکی کا مظاہرہ کیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی کتاب ''میرا لہو'' کے صفحہ 153-152 پر اس حوالے سے ہے:

''قید کے دوران بھٹو کو بڑے ناگفتہ بہ حالات میں رکھا گیا۔''

کوٹ لکھپت جیل میں ان کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے سنڈے ٹائمز کے مسٹر جان سوین نے 19 اپریل کو اس طرح رپورٹ کیا:

''جیل کے اندر فضا بدبودار ہے، وہ لوہے کی چارپائی پر زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ رفع حاجت کھلے عام کرنے پر مجبور ہیں، سلاخوں والی کھڑکیوں سے مچھر اور مکھیوں کی بھرمار رہتی ہے۔ ان کے وکیلوں کا بیان ہے کہ وہ ملیریا کا شکار ہو گئے ہیں اور قیدیوں کی آوازیں جنہیں کوڑے لگائے جا رہے ہوتے ہیں، انہیں سونے نہیں دیتی۔ ان کے لیے 10X7 فٹ کی کوٹھڑی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کے لیے، جو سات سال تک پاکستان کے سیاہ سفید کا مالک رہا، سخت ذلت آمیز حالت ہے۔''

خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور فوجی قیادت کے لیے اس وقت بھٹو صاحب ایک بڑے خوف کی علامت بنے ہوئے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ کو ڈر تھا کہ اگر بھٹو صاحب زندہ بچ کر باہر آ گئے تو ہمارے لیے زیادہ مسائل پیدا کریں گے۔ معروف دانشور صحافی اور تجزیہ نگار عبدالکریم عابد مرحوم نے اپنی سوانح عمری ''سفر آدھی صدی کا'' میں شامل مضمون ''بھٹو کی نعش درکار تھی'' میں لکھا ہے کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''حالاں کہ بھٹو صاحب کو بچانے کے لیے دنیا کے ہر کونے سے آواز بلند کی گئی اور جان بخشی مطالبہ کرنے والوں میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور لیبیا کے حکمران شامل تھے۔ یہ تینوں ممالک بھٹو کی پھانسی پر اس قدر ناراض ہو گئے کہ تعلقات کا بحران پیدا ہو گیا اور بعد میں بڑی مشکل سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات سے اس مسئلے پر تلخی ختم ہوئی۔ پاکستانی حکومت نے اس وقت کے سعودی سفیر ریاض الخطیب کے ذریعے سعودی عرب کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ بھٹو کو پھانسی پر نہیں چڑھایا جائے گا اور اس یقین دہانی کی خلاف ورزی کا مذکورہ تینوں ملکوں نے بہت برا منایا تھا۔ بھٹو کے حق میں حکمرانوں کی اپیل کسی سیاسی وجہ سے نہیں تھی، ہر حکمران چاہتا تھا کہ حکمران کو تختہ دار پر لٹکانے کی مثال قائم نہ کی جائے ورنہ اس کی باری بھی آسکتی تھی مگر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ عالم اسلام میں بھٹو کی شخصیت کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بھٹو نے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لیے دولت مند عرب ملکوں سے کافی رقم لی تھی اور انہیں یقین دلایا تھا کہ پاکستانی ایٹم بم بنا کر رہیں گے جو اسلامی بم کا کام بھی دے گا اور اسرائیل کے جارحانہ عزائم کے لیے روک ثابت ہوگا۔ بھٹو اور امریکہ کے تعلقات میں بگاڑ اس ایٹم بم کی وجہ سے ہوا تھا اور ہنری کسنجر نے ایک ملاقات میں بھٹو کو دھمکی دی تھی کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ مولانا ظفر احمد انصاری، پی این اے کی تحریک میں صاف کہتے تھے کہ امریکہ ایٹم بم کی وجہ سے بھٹو کو نکال رہا ہے اور موت کے تختے تک پہنچائے گا۔''

(صفحہ 283-284) یہ ظاہر کرتا ہے:

''بھٹو صاحب کی پھانسی محض جنرل ضیاالحق کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ انہیں ایک بین الاقوامی سازش کے تحت پھانسی دی گئی۔''

عبدالکریم عابد صاحب اس بات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ جنرل ضیاالحق صاحب کے تھ بھٹو صاحب کی مفاہمت کے امکانات موجود تھے۔ لیکن بھٹو صاحب کے جارحانہ رویے اور ان کے ارد گرد موجود اسٹیبلشمنٹ کے لوگ اور قوم پرستوں نے اس مفاہمت کے پہلو کو کافی کمزور کر دیا۔ وہ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مارشل لاء کے بعد جنرل ضیاالحق، بھٹو سے بہت خائف تھے اور چاہتے تھے کہ ان سے بنا کر رکھی جائے اور تصادم نہ ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ تصادم میں فوج کے وقار کے پرخچے اڑ سکتے ہیں کیوں کہ ان کی بڑی مقبولیت ہے اور ملک کے باہر بھی انہیں عزت کی نگاہ سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیکھا جاتا ہے۔اس لیے وہ بھٹو ان کا احترام ملحوظ رکھ کر مفاہمانہ انداز میں بات کرتے تھے۔لیکن اس سے بھٹو صاحب کی خود پرستی کا پارہ اور چڑھ گیا،ان کے اردگرد غلط مشیر بھی جمع ہو گئے تھے۔انہی دنوں میں نے روزنامہ مشرق کے لیے کالم لکھا اور اس کی سرخی تھی،'' کمیونسٹوں کو ایک نعش کی ضرورت ہے۔'' اس میں کہا گیا تھا کہ زندہ بھٹو، کمیونسٹوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ان کے فائدے کے چیز بھٹو کی نعش ہے،جس کا نام لے کر وہ یہ بات ثابت کر سکیں اور لوگوں کو بھڑکا سکیں۔بھٹو صاحب اپنی غصیلی تقریروں کے ذریعے کمیونسٹوں کے مقصد کی تکمیل کرتے نظر آ رہے ہیں مگر انہیں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔افسوس ایسا نہیں ہو سکا اور بھٹو صاحب اپنی تقریروں میں یہاں تک کہہ گئے کہ وہ جرنیلوں سے اپنا ٹائیلٹ صاف کروائیں گے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بعض غیر ممالک کی یقین دہانیوں پر بڑا بھروسا تھا۔یہ یقین دہانیاں کرانے والوں میں امریکہ بھی شامل تھا اور اس کی یقین دہانی پر اعتبار کرنا بھٹو صاحب کے لیے کسی طرح سے درست نہیں تھا۔اگر وہ مفاہمانہ رویہ اختیار کرتے تو ضیاالحق سے ان کا سمجھوتہ ہو سکتا تھا لیکن ان کے آتشیں رویے نے ان کا انجام برا کیا اور بعد میں انہیں آگ بگولہ کرنے والے لوگ بیگم بھٹو کے گرد جمع ہو گئے اور ان میں اکثر انٹیلی جینس کے ایجنٹ تھے۔''

(صفحہ 285- 286)

یہ بات کسی حد تک تو درست ہو سکتی ہے کیوں کہ امریکہ بھٹو صاحب کے عزائم سے خوف زدہ تھا۔اسلامی بلاک اور اسلامی بم کی سوچ اور اس پر عمل درآمد کے حوالے سے ان کے عزائم نے بھٹو صاحب کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔بھٹو کے حوالے سے جنرل ضیاالحق بین الاقوامی دباؤ میں بھی تھے۔ ضیاالحق عجیب مخمصے کا شکار تھے۔ایک طرف عرب مسلم رہنماؤں کا دباؤ تھا اور دوسری طرف امریکہ تھا،جسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ بھٹو کی پھانسی میں بیرونی فیکٹر خاصا نمایاں تھا اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔اگر واقعی امریکہ،بھٹو کی پھانسی کا مخالف تھا تو جنرل ضیاالحق تن تنہا یہ فیصلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔امریکہ کے بارے میں بھٹو صاحب کے عزائم سے سب آگاہ تھے۔ جناب اسلم گورداسپوری نے،جو بھٹو صاحب کے قریبی ساتھی تھے،اپنی کتاب ''شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستان حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی'' حصہ اوّل کے صفحہ 456 پر لکھا ہے:

''1970ء میں جب امریکہ نے کمبوڈیا پر جارحیت کی تو اس وقت چیئرمین بھٹو صاحب پاکستان کے وہ اکیلے سیاست دان تھے جنہوں نے امریکی جارحیت کی کھل کر مذمت کی تھی اور ان کے باقی ہم عصر سیاست دانوں کو عالمی سیاست کا کچھ ادراک نہیں تھا۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح 9 مئی 1970ء کے نوائے وقت کی اشاعت کے مطابق چیئرمین بھٹو پاکستان کے واحد لیڈر تھے، جو کہتے ہیں کہ پاکستان کا فرض ہے کہ حکومت پاکستان اس مسئلے پر ایک ایشیائی ملک کی حیثیت سے اپنا مؤقف اختیار کرے۔ چیئرمین بھٹو نے انتباہ کیا کہ آج اگر ہم خاموش رہے تو کل پاکستان کے معاملے میں دوسرے ایشیائی ممالک بھی خاموش رہیں گے۔ اخبار کے مطابق بھٹو نے کہا کہ امریکی مداخلت کمبوڈیا میں کھلی جارحیت ہے اور یہ ایشیا میں امریکیوں کی عدم مداخلت کی نکسن پالیسی کے سراسر خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح پیپلز پارٹی کے منشور میں خارجہ پالیسی کے تناظر میں بھی بھٹو صاحب نے امریکہ کے بارے میں سخت مؤقف اختیار کیا۔ اسلم گورداسپوری کی اسی کتاب میں صفحہ 157 پر خارجہ پالیسی کے تناظر میں پارٹی کا مؤقف ان الفاظ میں لکھا ہے:

''پہلا قدم لازمی طور پر سامراج اور نئی نوآبادیاتی طاقتوں کے چنگل سے رہائی پانا ہے۔''

پاکستان سامراج اور نئی سامراجی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں تمام محکوم لوگوں کی حمایت کرے گا۔ خاص طور پر ویت نام کے بہادر لوگوں کی جدوجہد جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم دوسری اقوام کے ساتھ مل کر ایشیا کی سرزمین کو امریکہ اور دوسری مغربی طاقتوں کی افواج کے قبضے سے چھڑانے کی جدوجہد کریں گے۔ یہ سوچ ظاہر کرتی ہے کہ بھٹو صاحب کے ذہن میں ایک بڑا عالمی منظر نامہ تھا اور وہ اسلامی دنیا کو ساتھ ملا کر کوئی بڑا کام کرنا چاہتے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ ہم امریکہ اور دوسری سامراجی قوتوں کے خلاف دنیا میں ایک بار پھر مزاحمت کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا اور بھٹو صاحب جہاں بین الاقوامی سازش کا شکار ہوئے، وہیں اندرونی محاذ پر ان کی بعض سیاسی حکمت عملیوں اور ان کے مخالفین میں موجود بھٹو صاحب کے بارے میں حد سے زیادہ تعصب کی لہر نے بھٹو صاحب کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔

جہاں تک بے نظیر بھٹو کے قتل کا تعلق ہے تو یہ ہماری سیاست کا ایک بہت بڑا زخم ہے جو سیاست کے بحران کو کم نہیں اور زیادہ کرے گا۔ بھٹو خاندان کے سب ہی لوگ منظر سے ہٹا دیے گئے بے نظیر بھٹو کے قتل سے قبل ان کے بھائی مرتضیٰ بھٹو بھی انہی کے دور حکومت میں قتل کر دیے گئے تھے بینظیر بھٹو کا دوبارہ پاکستان آنا ایک بڑی سیاسی مصلحت کی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ اس میں جہاں اندرونی عوامل کارفرما تھے وہیں بیرونی دنیا بالخصوص امریکہ کی مدد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کی مدد کے ساتھ ان کی دوبارہ پاکستان آمد ممکن ہوئی۔ جنرل پرویز مشرف خود اعتراف کر چکے ہیں کہ جو ڈیل ہوئی تھی اس کے تحت بے نظیر بھٹو نے انتخابات کے بعد ملک میں آنا تھا لیکن ان کی پہلے آمد کی ضد نے اس سارے کھیل کو خراب کر دیا۔ بے نظیر کی اس ضد نے عالمی ضامنوں کو بھی مایوس کیا جو ان کے قتل میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی حکومت ہونے اور ان کے شوہر کے پاکستان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علی ترین منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کے قتل کی تحقیقات کے بارے میں کوئی بڑی پیش رفت نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ بے نظیر بھٹو کا قتل محض اندرونی حکمت عملی کا نتیجہ تھا تو یہ مکمل سچ نہیں اور نہ ہی یہ قوتیں اس قدر مضبوط ہیں کہ بے نظیر بھٹو کے قتل کا تن تنہا فیصلہ کر سکتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کو کیوں قتل کیا گیا؟ اس کا حتمی جواب کسی کے پاس نہیں اور ہر کوئی اپنی سوچ کے مطابق اس کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ کرتا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ بھٹو کی طرح ان کی بیٹی بھی عالمی سیاست اور اس کے مفادات کا شکار ہوئی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں اور اپنے آنے کے حوالے سے بھی انہوں نے اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا جب تک ان کو بین الاقوامی ضمانتیں نہیں ملیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر بے نظیر غلطی کیوں کر گئیں۔ دراصل ایک تو جب بے نظیر بھٹو پاکستان آئیں تو یہاں کی صورت حال نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دوئم، اگر وہ ڈیل کے تحت انتخابات کے بعد آتیں تو سیاسی منظر نامے میں ان کی جماعت کوئی بڑی حیثیت کے ساتھ سامنے نہ آتی۔ ان کا خیال تھا کہ پارٹی کو بچانے کے لیے انہیں ہر صورت میں انتخابات سے قبل ملک میں جانا ہوگا لیکن پاکستان اور بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے کارندوں نے اس ڈیل سے انحراف کی صورت میں کچھ اور ہی طے کر لیا تھا جس میں ان کی زندگی کا خاتمہ بھی شامل تھا۔ بے نظیر بھٹو عوامی رہنما تھیں اور عوامی سیاست کے رموز سے بھی واقف تھیں، یہی وجہ تھی کہ ان کے لانے والے انہیں عوامی سیاست سے دُور رکھنا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو کردار دیا جا رہا ہے، وہ اسی کے مطابق آگے بڑھیں، اِدھر اُدھر نہ دیکھیں۔ لیکن کراچی میں ان کے شان دار استقبال نے ان کو ایک بار پھر عوامی سیاست کے قریب کر دیا۔ اور وہ اپنے اوپر ہونے والے حملے کے باوجود عوامی جلسوں کا مظاہرہ کرتی رہیں اور جس انداز سے انہوں نے جلسے کیے، وہ پس پردہ قوتوں کے لیے ایک نئی مصیبت بن گئے تھے۔ بے نظیر بھٹو کا خیال تھا کہ عوامی طاقت سے وہ اسٹیبلشمنٹ کو شکست دے سکتی ہیں مگر چوں کہ وہ کمزور تھیں اور جس طرح ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف کوئی بڑی مزاحمت نہیں ہو سکی، اسی طرح ان کے حوالے سے بھی مزاحمت بہت زیادہ نہیں تھی۔ جس طرح بھٹو کو راستے سے ہٹایا گیا تھا، اسی طرح بے نظیر بھی ایسی ہی کسی سیاسی سازش کا شکار ہوئیں۔

معروف ترقی پسند دانشور لال خان اپنی کتاب ''پاکستان کی اصل کہانی'' کے صفحہ 394-395 پر رقم طراز ہیں:

''بے نظیر بھٹو کے خلاف پہلی کارروائی شاہراہِ فیصل کے کارساز چوک پر دھماکے کی شکل میں سامنے آئی، جس میں دو سو سے زائد افراد لقمہ اجل اور کئی سو زخمی ہوئے۔ الیکشن مہم شروع کر دی گئی اور اس کا جوش اور جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ عوام کی امنگیں روز بہ روز انقلابی ہولر سرگرم و سرکش ہوتی جا رہی تھیں۔ بے نظیر، ڈیل اور امریکیوں کے ساتھ رابطے میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جکڑی ہوئی تھیں مگر عوام نے جوق در جوق جلسے اور جلوسوں میں شامل ہو کر انہیں بھی متاثر اور انقلابی کرنا شروع کر دیا۔ عوام کا اس طرح بے نظیر کے ساتھ جڑنا اور بے نظیر کا یوں عوامی ہوتے جانا ریاست کے قدامت پسند حلقوں کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا، مسئلہ ان کے لیے یہ نہیں تھا کہ وہ ان اجتماعات میں کیا کہہ رہی تھیں، مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کی امیدوں کا مرکز و محور بنتی جا رہی تھیں۔''

معروف صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار عباس اطہر نے 12 اکتوبر 2010ء کو روزنامہ ایکسپریس میں شائع شدہ اپنے کالم ''طلسمی طوطا'' میں لکھا:

''بے نظیر بھٹو کے قتل کے حقائق، اس میں شامل خفیہ اور ظاہری کردار، منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کی تفصیلات کبھی منظر عام پر نہیں آسکیں گی۔ اس طرح کی وارداتوں کے نشان اتنی صفائی سے مٹا دیئے جاتے ہیں کہ ہواؤں کو بھی ان کا سراغ نہیں ملتا۔ قتلوں کے اس سلسلے کی پہلی کڑی ذوالفقار علی بھٹو تھے، انہیں علانیہ طور پر قتل کیا گیا، شاہ نواز بھٹو فرانس میں پراسرار موت مرے، مرتضیٰ کو کراچی شہر کی بارونق سڑک پر گھر کے قریب نشانہ بنایا گیا، محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی حکمت عملی بھٹو صاحب سے مختلف تھی۔ انہیں بھرے میلے میں قتل کر کے عوام کو یہ پیغام دیا گیا کہ پاکستان میں عوامی طاقت اور عوامی مقبولیت کی اوقات کیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو باضابطہ طور پر پیشگی یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ایٹمی پروگرام بنانے کی پاداش میں تمہیں عبرت کی مثال بنا دیا جائے گا جب کہ محترمہ کے سر تنگ کے دوسرے سرے پر دھوکے کا دیا بجھنے نہیں دیا گیا۔''

عباس اطہر کا تجزیہ ٹھیک ہے کیوں کہ مقبول سیاسی جماعتیں اور قیادتیں ہمیں قبول نہیں اور جو بھی عوامی طاقت کا مرکز بنے گا اسے یہاں کی پس پردہ طاقتیں قبول نہیں کریں گی۔ بے نظیر کے بعد نواز شریف مقبول ہوئے تو ان کے لیے قبولیت کا معاملہ سرفہرست ہو گیا ہے۔

بے نظیر بھٹو نے وطن واپسی سے قبل جنرل مشرف کو اپنی سیکیورٹی کے تناظر میں 16 اکتوبر کو خط بھی لکھا تھا اور اس میں انہوں نے جن لوگوں پر اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا کہ اگر ان کو کچھ ہوا تو ان کے ذمہ داران میں چوہدری پرویز الٰہی، ڈائریکٹر آئی ایس آئی حسن وسیم افضل اور انٹیلی جینس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل بریگیڈیر (ر) سید اعجاز شاہ شامل ہوں گے۔ اس فہرست میں بعد میں جنرل (ر) حمید گل کا نام بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ بے نظیر بھٹو قتل کے فوری بعد جو ردعمل سامنے آیا، اس میں چوہدری برادران سخت تنقید کا نشانہ بنے اور زرداری صاحب نے ان کی طرف اشارہ بھی کیا لیکن بعد میں انہوں نے اقرار کیا کہ ان کا بیان جذباتی تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ چوہدری برادران اس قتل میں ملوث تھے۔ ان کی یہ ضرور خواہش تھی کہ بے نظیر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طن واپس نہ آتیں۔ جنرل مشرف نے اعتراف کیا کہ چوہدری برادراں بے نظیر کی وطن واپسی کی اور تیسری ر روز یراعظم بننے کی پابندی کے خاتمے کے مخالف تھے۔ لیکن ان کے قتل میں ان کا شامل ہونا ناممکن تھا۔
بے نظیر بھٹو کی شہادت اس لحاظ سے اہم ہے کہ ان کہ والد کی شہادت ایک متنازع معاملہ تھی ور ہے، البتہ اس کے برعکس بے نظیر بھٹو کے مخالفین بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ انہیں شہید کیا گیا ہے۔ وہ گ جو کل تک بے نظیر کے سخت ناقد تھے اور ان کے بارے میں ان کا اندازِ گفتگو بھی اخلاقیات سے عاری وتا تھا، وہ بھی ان کی شہادت پر رنجیدہ نظر آتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کی سیاست اور خواتین کی تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اگر اس میں خواتین کی شمولیت اور ان کے سیاسی کردار پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس میں کئی طرح کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں۔ اگرچہ پاکستان کے بننے کے عمل میں ہمیں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بہت سی ایسی متحرک اور فعال خواتین کارکن نظر آتی ہیں جنہوں نے ابتدا ہی میں اپنے سیاسی عمل کی بنیاد ڈالی اور ہماری نصابی کتابوں میں ان کے مجموعی سیاسی کردار کو شان دار انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی جو ہمیں سمجھ آتی ہے، وہ ایک تو پاکستان کے بننے کا عمل تھا اور یقیناً اس میں دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ ساتھ خواتین میں بھی جوش و جذبہ موجود تھا کہ وہ بھی اس عمل میں حصہ لیں۔ خواتین کی پاکستان بننے کی تحریک میں حصہ لینے کی جہاں بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں، وہیں 1936ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا بھی ایک کردار تھا۔ اس تحریک نے خواتین کو متحرک کیا کہ وہ بھی اپنے گھریلو معاملات کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی معاملات میں بھی آگے بڑھیں۔ ان کی اس تحریک میں بالخصوص خواتین کی تعلیم، ووٹ ڈالنے اور وراثت میں حصہ لینے کے بنیادی حق کو تسلیم کرنے کی جدوجہد شامل تھی۔ اسی طرح ہمیں بنگلہ دیش، سندھ اور پنجاب میں خواتین کی ایک مضبوط ہاری تحریک بھی نظر آتی ہے جس نے خواتین کو مقامی سطح پر منظم کرنے میں خاصی مدد دی۔ قیام پاکستان میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر بہت سی خواتین نے سیاسی عمل میں بھرپور شمولیت اختیار کی جن میں بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور جہاں آرا شاہ نواز قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک میں نہ صرف خواتین نے مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ کام کیا بلکہ انہوں نے اپنی جدوجہد کے دوران کئی طرح کی صعوبتیں و تکالیف بھی برداشت کیں۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں خواتین کی دو قابل ذکر تنظیمیں بنیں جن میں ایک وومین نیشنل گارڈ تھی جو بیگم رعنا لیاقت علی خان نے بنائی اور دوسری وومین والینٹری سروس بنی جو زیادہ تر مہاجروں کی آبادکاری پر کام کرتی تھی جس میں خواتین کی خدمت اور دیکھ بھال شامل تھی۔ اس تنظیم کے کاموں کو مختلف سطحوں پر خاصی پذیرائی ملی اور بعد میں اس تنظیم نے عملی طور پر اپوا یعنی آل پاکستان وومین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ البتہ اس کے برعکس وومین نیشنل گارڈز پر مختلف سطحوں پر اعتراضات لگائے گئے جن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پردے کا مسئلہ، مسلح جدوجہد شامل تھی اور ان اعتراضات کے بعد عملی طور اس تنظیم کو 1954ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح 1954ء ہی میں یہاں خواتین کی اور بھی تنظیمیں بنیں جن میں فیڈریشن آف یونیورسٹی وومین، نرسز فاؤنڈیشن، انٹرنیشنل وومین کلب اور فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن شامل تھے۔

ان تنظیموں کے بننے کے عمل نے خواتین کو مختلف پلیٹ فارم پر سرگرم ہونے کے مواقع فراہم کیے البتہ ان تمام تنظیموں کا دائرہ کار سماجی شعبوں تک محدود تھا۔ اس کے مقابلے میں سیاسی عمل کے اندر جو تنظیمیں بنیں ان میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی خواتین کی تنظیم، انجمن جمہوریت پسند خواتین شامل تھی۔ اس تنظیم میں زیادہ تر مڈل کلاس اور پڑھی لکھی خواتین شامل تھیں۔ ابتدا میں اس تنظیم نے اپنی توجہ زیادہ تر فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والی خواتین کے مسائل پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اسی طرح 1955ء میں خواتین ہی کے حوالے سے یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ بنی جو بیگم نسیم جہاں نے بنائی اور اس نے خواتین کے قانونی اصلاحات کے لیے جدوجہد کی۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے پہلی بار خواتین کے قوانین میں اصلاحات کے لیے کمیشن کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ 1961ء میں جنرل ایوب خان کے دور میں فیملی لاء آرڈیننس سامنے آیا۔

جہاں تک خواتین کی سیاسی نمائندگی کا تعلق ہے تو 1956ء میں خواتین کی نمائندگی کے حق کو تسلیم کیا گیا اور جہاں آراء کی رپورٹ میں خواتین کی 10 فیصد نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا اور اسی تناظر میں انہیں دوہرے ووٹ کا حق یعنی عام انتخابات اور مخصوص نشستوں پر ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے 1956ء کے دستور کے تحت ملک میں انتخابات کا انعقاد نہ ہو سکا۔ خواتین کی سیاست اور اس میں پر جوشیت کا ایک پہلو ہمیں 1964ء کے صدارتی انتخابات میں بھی نظر آتا ہے جہاں ڈکٹیٹر ایوب خان کے مقابلے میں قائداعظم محمد علی جناح کی بہن فاطمہ جناح امیدوار تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فاطمہ جناح کی حمایت وہ جماعتیں بھی کر رہی تھیں جو خواتین کی نمائندگی پر اپنے شدید تحفظات رکھتی تھیں جن میں جماعت اسلامی قابل ذکر ہے۔ ایوب خان اور فاطمہ جناح کے سیاسی مخالفین نے ان کی سیاسی طور پر مخالفت کرنے کی بجائے ان کے خاتون ہونے کا واویلا مچایا اور کہا کہ خواتین کی سیاسی عمل میں نمائندگی کیسے ممکن ہے۔ لیکن جماعت اسلامی سمیت دیگر لوگوں نے ایوب خان کی اس آواز پر ساتھ دینے کی بجائے فاطمہ جناح کا ساتھ دیا۔ حالاں کہ جماعت اسلامی نے ہمیشہ خواتین کی سیاسی امور میں بہت زیادہ شمولیت کی مخالفت کی لیکن ایوب خان کی مخالفت میں جماعت اسلامی کو فاطمہ جناح کی حمایت کی کڑوی گولی ہضم کرنی پڑی۔ ملک میں 1967ء میں خواتین کی ایک اور بڑی تنظیم بہبود ایسوسی ایشن بھی بنی اور بعد میں اس تنظیم نے اپنے کام کے دائرہ کار کو ملک کے بڑے شہروں تک پھیلایا۔

ایوب خان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا دور آتا ہے اور اس دور میں خواتین کی تحریک اور ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مسائل کے حوالے سے کئی نئے دروازے کھلے، مثلاً 1973ء کے دستور کی شق 25 اور 27 میں کہا گیا کہ جنس کی بنیاد پر معاشرے کے اندر کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اسی ادوار میں بیگم رعنا لیاقت علی خان سندھ کی گورنر اور بیگم کنیز یوسف قائد اعظم یونیورسٹی کی وائس چانسلر بنیں اور خارجہ امور اور ڈی ایم جی گروپ میں بھی خواتین کی نمائندگی کو ممکن بنایا گیا۔ پاکستان کی خواتین کو پہلی بار خواتین کی عالمی کانفرنس میں شرکت کا موقع 1975ء کی کانفرنس میں ملا اور اس وفد کی قیادت محترمہ بیگم نصرت بھٹو نے کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پہلی بار ملک میں خواتین کی ایک بڑی تعداد بالخصوص غریب اور لوئر مڈل کلاس خواتین نے بھٹو صاحب کے سیاسی سحر میں اپنے آپ کو گرفتار کیا۔ خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد بالخصوص شہری علاقوں سے، نے پاکستان پیپلز پارٹی کے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے کے سائے تلے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ پیپلز پارٹی دیگر سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں پروگریسو جماعت تھی اور عام خیال یہ ہی تھا کہ یہ جماعت خواتین کی ترقی اور دیگر امور میں روایتی کردار اپنانے کی بجائے ایک لبرل سوچ کو آگے لے کر بڑھے گی۔ اس سوچ نے پروگریسو اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی مجبور کیا کہ وہ بھٹو کی سیاست کی حمایت کریں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین کی وہ تمام تنظیمیں اور تحریکیں عملی طور پر بھٹو صاحب کی سیاست کا عملی یا غیر عملی طور پر حصہ بنیں۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے اقتدار کے خاتمہ اور ملک میں جنرل ضیا الحق کی آمریت میں خواتین کی سیاسی تحریک کے تناظر میں بہت کچھ سامنے آیا۔ جنرل ضیا الحق کی حمایت میں زیادہ تر دائیں بازو یعنی رجعت پسند سیاسی عناصر غالب تھے اور اسی کے نتیجے میں ضیا الحق کو اپنے اقتدار کو تقویت دینے کے لیے ملک میں اسلامائیزیشن کا سہارا لینا پڑا کیوں کہ بھٹو صاحب پر الزام تھا کہ انہوں نے معاشرے کو بے راہ روی کا شکار بنا دیا تھا اور ایسے اقدامات کیے تھے جو اسلامی تعلیمات کے برعکس تھے۔ اس لیے جب جنرل ضیا الحق نے اقتدار پر قبضہ کیا تو دائیں بازو اور مذہبی سیاست کرنے والے لوگوں کی حمایت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ضیا الحق کے دور میں جب اسلامائیزیشن کا نعرہ لگایا گیا تو ایسے محسوس ہوا کہ اس سے قبل ہم غیر اسلامی معاشرے میں رہ رہے تھے۔ اس تحریک کا سب سے زیادہ نزلہ خواتین پر گرا اور انہیں چادر اور چار دیواری تک محدود کرنے کے لیے بھرپور اقدامات کیے گئے۔ حدود آرڈیننس جیسے کالے اور فرسودہ قوانین کو خواتین پر جبری بنیادوں پر نافذ کیا گیا اور اس سلسلے میں کہیں بھی خواتین کی تنظیموں اور دیگر خواتین کے طبقوں سے مشاورت نہ کی گئی۔ اس جبری قوانین کے نفاذ پر خواتین کے اندر ردعمل کا پیدا ہونا فطری امر تھا اور جب بالخصوص فہمیدہ بخش کو 10 کوڑوں کی سزا سنائی گئی تو اس پر شدید ردعمل سامنے آیا۔ اس ردعمل کے نتیجے میں ملک میں پڑھی لکھی اور پروگریسو خواتین نے خواتین محاذ عمل یعنی وومن ایکشن فورم تشکیل کی اور اس نے خواتین کے بنیادی حقوق کی تلفی پر خواتین کی تحریک کو ایک نئے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان ز سے منظم کرنے کی کوشش کی۔ اسی تحریک کے نتیجے میں 12 فروری 1983ء کو قانونِ شہادت اور حدود آ ڈیننس کے خلاف مظاہرے میں خواتین پر بے پناہ تشدد بھی کیا گیا۔ ٹیلی وژن پر خواتین کو پابند کیا گیا ۔ وہ اسلامی شعائر کا مذاق نہ بنیں اور سروں دوپٹہ اوڑھ کر ٹی وی سکرین پر نمودار ہوں۔ اس دور میں ۔ندھ کے اندر خواتین کی سندھیانی تحریک کے نام سے ایک تحریک بھی زوروں پر رہی۔ خواتین محاذِ عمل ۔ے شہروں کی سطح پر خواتین کو منظم کیا اور ان کی تحریک کا بنیادی نکتہ ضیا الحق کے مارشل لاء کے دوران جمہوریت کی بحالی کی حمایت اور امتیازی قوانین کی مخالفت تھا۔ اس تحریک کے دوران خواتین پر نہ صرف تشدد کیا گیا بلکہ ان پر مقدمات اور جیلوں میں ڈالنے کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والی خواتین شاہی قلعے کی اذیت اور کوڑے بھی کھانے پڑے جو ضیا دور کا سیاہ کارنامہ تھا۔

خواتین کی قومی، صوبائی اور مقامی نظام حکومت میں نمائندگی کا جائزہ

ملک کی قانون ساز اسمبلیوں میں خواتین کی مخصوص نشستوں کا نظام برصغیر ہند میں 1936ء ے چلا آ رہا ہے۔ پاکستان میں 1990ء تک آئین کے مطابق قومی اسمبلی میں 10 فیصد اور صوبائی سمبلیوں میں 05 فیصد نشستیں خواتین کے لیے مختص کی گئی تھیں، جب کہ اس کے برعکس سینٹ میں خواتین کوئی مخصوص نشستیں نہیں رکھی گئی تھیں۔ ماضی میں اگر ہم خواتین کی سیاسی عمل میں شمولیت کے تناظر میں ن کی سیاسی اداروں میں نمائندگی کے عمل کو دیکھیں تو اس میں آج کے مقابلے میں بہت کم خواتین قومی، صوبائی اور سینٹ میں بطور ممبرز نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی قیادتوں ن جانب سے خواتین کو بطور نمائندگی کا بہت بڑا حق نہیں مل سکا اور جن خواتین کو ملا بھی تو ان کی بڑی وجہ وروثی اور خاندانی سیاست کا پہلو تھا۔ مثال کے طور پر، ہم اگر 1985ء کی قومی اسمبلی کو دیکھیں تو قومی سمبلی کے کل ارکان کی تعداد 237 کے مقابلے میں یہاں خواتین کی تعداد 23 تھی جو کہ کل ارکان کا 9 فیصد بنتی تھی۔ اسی طرح 1988ء میں یہ تعداد 24، 1990ء میں 02، 1993ء میں یہ تعداد 04 جب کہ 199 ء میں یہ تعداد 07 رہ گئی تھی۔ یعنی تسلسل کے ساتھ خواتین کی نمائندگی میں اضافہ ہونے کی بجائے ں میں کمی ہوتی رہی جس سے خواتین کی ان اداروں میں نمائندگی کا معاملہ کافی کمزور رہا۔ سینٹ جیسے اہم دارے میں بھی خواتین کی نمائندگی کا تناسب 1985ء، 1988ء، 1990ء، 1993ء اور 1997ء میں بالترتیب 00 فیصد، 1.1 فیصد، 1.1 فیصد، 1.1 فیصد اور 2.3 فیصد رہا جو ظاہر کرتا ہے کہ ہم خواتین کو ان اداروں میں بہتر نمائندگی دینے کے عمل میں ناکام رہے ہیں۔ اسی طرح صوبائی اسمبلیوں میں خواتین کی تعداد بہت کم تھی، مثال کے طور پر اگر صرف 1997ء کی نواز شریف حکومت کو دیکھیں تو اس دور میں پنجاب کے کل ارکان کی تعداد 248 تھی جس میں صرف ایک خاتون نمائندہ تھی جو کل ارکان کا 0.4 فیصد بنتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح سندھ اسمبلی کے کل 109 ارکان میں سے کوئی خاتون نمائندہ نہیں تھی۔ سرحد اسمبلی کے کل 83 ارکان میں سے صرف ایک خاتون جب کہ بلوچستان کی کل 43 نشستوں میں سے کوئی خاتون نمائندہ نہیں تھی۔

لیکن 01-2000ء میں جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے پہلی بار اس ملک میں مقامی حکومتوں کے انتخابات کے اعلان پر ان اداروں میں خواتین کی 33 فیصد نشستوں کا اعلان کیا جو خواتین کی مخصوص نشستوں کے تناظر میں پوری کی جائیں گی۔ ان کا طریقہ انتخاب میں یونین کونسل کی سطح پر براہ راست انتخاب کروانے کا فیصلہ کیا گیا، جب کہ ٹاؤن، تحصیل اور ضلعی کونسل میں براہ راست طریقہ انتخاب کے عمل کو برقرار نہیں رکھا گیا۔ اس کے برعکس 2002ء کے عام انتخابات میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے قومی، صوبائی اور سینٹ میں خواتین کی 33 فیصد نمائندگی کی بجائے 17 فیصد نشستوں کا اعلان کیا۔ ملک میں قومی، صوبائی اور سینٹ کی سطح پر بھی جنرل نشستوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور خواتین کی بھی نمائندگی کا عمل پہلی بار بڑی تعداد میں سامنے آیا جو خواتین کی سیاست کے تناظر میں ایک خاطر خواہ اضافہ تھا۔ مثال کے طور ملک کی قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کی کل 1170 ارکان کی تعداد میں خواتین کی تعداد 17 فیصد کے تناسب سے 205 نشستیں مختص کی گئی جو کہ تقریباً 17.5 فیصد بنتا ہے۔ قومی اسمبلی کے 342 ارکان میں خواتین کے لیے 60 نشستیں مختص کی گئی ان میں سے 35 پنجاب کو، سندھ کو 14، خیبر پختونخوا کو 08، بلوچستان کو 03 اور ایک اسلام آباد کے لیے مختص کی گئی۔ اس کے برعکس فاٹا میں خواتین کی کوئی نشست مختص نہیں کی گئی۔ اسی سینٹ میں کل 100 ارکان میں سے 17 نشستیں خواتین کے لیے مختص کی گئی ان میں سے پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کو چار چار جبکہ اسلام آباد کو ایک نشست مختص کی گئی۔ اسی طرح پنجاب کی کل 371 نشستوں میں سے 66، سندھ اسمبلی کی کل 168 نشستوں میں سے 29، خیبر پختونخوا کی کل 124 نشستوں میں سے 22، جب کہ بلوچستان کی کل 65 نشستوں میں سے 11 نشستیں خواتین کے لیے 17.5 فیصد کے قانون کے تحت مختص کی گئی۔ اس کے برعکس عام نشستوں پر بھی خواتین براہ راست انتخابات میں حصہ لے کر بھی اسمبلیوں تک اپنی رسائی کو یقینی بنا سکتی ہیں۔ ان نشستوں کو پُر کرنے طریقہ انتخاب کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا اس کے مطابق متناسب نمائندگی کے طریقہ کا پارٹی لسٹ سسٹم کی بنیاد کو اپنایا گیا۔ اس قانون کے مطابق صوبوں کو دی جانے والی مخصوص نشستوں کو سیاسی جماعتوں کو کل حاصل کردہ عام نشستوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جانا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ جو جماعت انتخابات میں کم از کم 05 فیصد ووٹ حاصل کرے گی وہی خواتین کی ان مخصوص نشستوں کی حق دار ہوگی۔ اس قانون کے تحت 3-2002ء میں قومی، صوبائی یا سینٹ کے جو انتخابات ہوئے، ان میں خواتین مخصوص نشستوں پر بھی منتخب ہوئی اور بعض علاقوں میں خواتین نے براہ راست انتخابات میں حصہ لے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کامیابی حاصل کی۔ اس طرح اگر 3-2002ء کی قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے ارکان کی تعداد کو دیکھیں تو قومی اسمبلی میں 74، سینٹ میں 18، پنجاب اسمبلی میں 73، سندھ اسمبلی میں 33، خیبر پختونخوا میں 23، بلوچستان میں 12 خاتون ارکان شامل تھیں (اس تعداد میں مخصوص اور جنرل نشستوں پر منتخب ہونے والی دونوں خواتین شامل تھیں)۔ اس کے مقابلے میں جب 01-2000ء میں جنرل مشرف حکومت نے مقامی حکومتوں کے انتخابات کروائے تو ملک بھر میں یونین، تحصیل، ٹاؤن اور ضلعی حکومت میں تقریباً 36 ہزار سے زیادہ خواتین ان مقامی اداروں میں بطور نمائندہ بن کر سامنے آئیں جو کہ ملک میں خواتین کی سیاسی عمل میں شمولیت کے حوالے سے ایک بڑے انقلاب کی تصویر پیش کرتا ہے۔

خواتین اور سیاست کے بارے میں عمومی تصور

پاکستان کی سیاست میں جب خواتین کی سیاست کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو اس میں ایک اہم پہلو خواتین کی سیاسی عمل میں شمولیت کے حوالے سے ایک مجموعی تصور کا ہے۔ بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آئی اور معاشرے ایک بڑے حصے میں سیاست کو محض مردوں ہی کا شعبہ سمجھا گیا۔ خواتین کو اس حد تک تو اجازت تھی کہ وہ 1970ء میں ملنے والے ووٹ کے حق کو تو استعمال کر سکیں اور وہ بھی انہیں بعض قبائلی اور دیہاتی علاقوں میں اجازت بھی نہ مل سکی اور خواتین ایک طویل عرصے تک اپنے ووٹ کا حق بھی استعمال نہیں کر سکیں۔ اسی طرح ان سے بالخصوص شہروں میں یہ توقع بھی رکھی گئی کہ وہ اپنی اپنی پسند کی جماعتوں اور افراد کے لیے انتخابی مہم چلائیں اور اور ان کے لیے ووٹ مانگیں، سیاسی جدوجہد کریں لیکن ان کی سیاسی اداروں میں بطور نمائندگی کے حوالے سے لوگوں اور سیاسی اشرافیہ میں کئی طرح کے تضادات تھے۔ ایک عمومی تصور یہ تھا کہ خواتین سیاست میں ایک محدود کردار تک ضرور حصہ لیں لیکن نمائندگی کرنا اور عملی ووٹ کی سیاست اور سیاسی اداروں میں بطور نمائندگی کرنا خواتین کے لیے موزوں نہیں۔ اس لیے جب بھی خواتین نے بطور نمائندگی کے تناظر میں مؤثر کردار ادا کرنا چاہا یا اپنی سیاسی قیادتوں سے یہ توقع رکھی کہ وہ انہیں بطور سیاسی نمائندہ کے طور پر پارٹی ٹکٹ جاری کریں تو اس کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ یہاں بعض مذہبی جماعتوں نے بھی خواتین کی نمائندگی کے خلاف ایک مؤثر کردار ادا کرنے کی کوشش کی اور اس تاثر کو مضبوط کیا کہ خواتین عملی سیاست میں حصہ لینے کی بجائے اپنے آپ کو اپنی بنیادی ذمہ داری یعنی گھر اور خاندان و بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت تک محدود رکھیں۔ معاشرے میں ابتدائی سطح پر ان خواتین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا جو سیاسی عمل میں شریک ہوئیں اور سمجھا گیا کہ یہ گھر اور خاندان کی باغی خواتین ہیں۔ حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی بلکہ جب خواتین سیاست کے دیگر امور یعنی ووٹ مانگنے، جلسے جلوس میں شرکت کرنے، سیاسی جدوجہد کرنے، سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتوں میں عملی شمولیت کر سکتی ہیں تو پھر ایسی کون سی مجبوریاں ہیں کہ اس پر محض سیاسی نمائندگی یا انتخابات اور اسمبلیوں میں کردار ادا کرنے سے روکا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ جب ملک میں عام انتخابات اور بالخصوص مقامی حکومتوں کے انتخابات 01-2000ء منعقد ہوئے تو اس میں پہلی بار خواتین کی نمائندگی کو نچلی سطح پر مضبوط کرنے کے لیے 33 فیصد نمائندگی دی گئی اور بالخصوص یونین کونسل میں ان کا براہِ راست طریقہ انتخاب مقرر کیا گیا تو اس موقع پر ملک کے دُور دراز علاقوں اور بالخصوص صوبہ سرحد میں مقامی سطح پر بالخصوص مذہبی رجعت پسندی، انتہا پسندی اور قبائلی و جاگیردرانہ سوچ کے حامل لوگوں نے خواتین کی ان مقامی اداروں میں براہ راست نمائندگی کو بزور طاقت روکا۔ ان لوگوں کے بقول اگر خواتین نے ان مقامی سیاسی اداروں میں شمولیت اختیار کی تو وہ اسلام کی منافی کام کریں گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سارے عمل میں محض مذہبی جماعتیں ہی پیش پیش نہیں تھیں بلکہ دیگر اہم سیاسی جماعتیں جن میں اے این پی، پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن)، مسلم لیگ (ق) بھی اس عمل میں شامل تھیں۔ انہوں نے مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاسی معاہدے کیے جن میں دو پہلو اہم تھے۔ اوّل وہ کسی بھی انتخاب میں بطور امیدوار حصہ نہیں لے سکیں گی اور دوئم بعض علاقوں میں مقامی روایات کے مطابق وہ ووٹ بھی نہیں ڈال سکیں گی۔ اس معاہدے پر تمام مقامی سیاسی جماعتوں کے مقامی اہم رہنماؤں اور پارٹی عہدے داروں نے دستخط کیے۔ مردوں کی ذہنی قبولیت کے لیے یہ بات بڑی مشکل تھی کہ خواتین بھی ان کی سیاسی قیادت کے طور پر سامنے آ سکتی ہیں۔ اس لیے جب وہ منتخب ہو کر بھی آ گئیں اور بالخصوص وہ خواتین جو کمزور تھیں یا جن کی معاشی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں تھی اور جو بڑے گھرانوں سے تعلق نہیں رکھتی تھیں، انہیں خاصی مشکلات اور مختلف مردانہ تعصبات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے بات محض مذہبی حوالے ہی سے بالادست نہیں تھی بلکہ خواتین کو مذہب کے ساتھ ساتھ برادریوں، قبائلی اور جاگیردارانہ سوچ سیاسی انتہا پسندی کے نام پر بھی روکا گیا اور ہر وہ کوشش کی گئی کہ ان خواتین کو ان کے مخصوص کرداروں تک ہی محدود رکھا جائے۔ خود بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کا بھی خیال تھا کہ خواتین انتخابات کے عمل میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکیں گی اور ہمیں پارٹی ٹکٹ دیتے وقت بہت سے پہلوؤں پر سوچنا پڑتا ہے جس میں عورت کی اہمیت بہت کم رہ جاتی ہے اور ان وجوہات کی بنا پر اسے انتخابی عمل سے دُور رکھا جاتا ہے۔ پاکستان میں ان خواتین کو بالخصوص وہ جو مڈل کلاس یا اوپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھیں، اپنے سیاسی تجربات میں ایسا بہت کچھ دیکھنے کو ملا جو ان کے لیے نہ صرف ناقابل برداشت تھا بلکہ ان کے ساتھ ہونے والا سلوک دوسری خواتین کے لیے ایک سبق ہوتا تھا کہ وہ سیاست سے دُور رہیں۔ خواتین کی کردار کشی ایک آسان کام ہے اور اس کی براہ راست اثر محض خواتین تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے پورے خاندان اور معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور خواتین کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مخصوص نشستوں یا براہِ راست انتخابات میں بڑے سیاسی گھرانوں کی خواتین کی بالادستی:

اسی طرح ہماری سیاسی خواتین کی تاریخ اور بالخصوص 1977ء کے بعد جو خواتین انتخابی سیاست میں نمودار ہوئیں، وہ ایک مخصوص بڑے سیاسی خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی کیوں کہ ابتدا میں ایسا ہی ہونا تھا اور خیال تھا کہ اس عمل اگر تسلسل کے ساتھ جاری رہے گا تو اس سے دیگر شعبوں اور بالخصوص عام طبقہ سے تعلق رکھنے والی سیاسی خواتین بھی اس عمل میں کامیابی سے سامنے آئیں گی۔ لیکن ایک بڑے وقت تک عملاً ایسا نہیں ہو سکا۔ ہم نے دیکھا کہ عملی طور پر 1977ء سے لے کر 1999ء تک ہونے والے تمام انتخابات میں براہِ راست یا طے شدہ مخصوص نشستوں پر چند بڑے خاندانوں کی اجارہ داری مضبوط رہی۔ براہِ راست نشستوں پر تو جو خواتین انتخابات میں حصہ لیتیں یا انتخابات میں کامیابی حاصل کرتیں، اس میں موروثی سیاست کا بڑا عمل دخل ہوتا تھا۔ ان خواتین میں نصرت بھٹو، بے نظیر بھٹو، عابدہ حسین، تہمینہ دولتانہ، مجیدہ وائیں، شہناز جاوید اور دیگر خواتین نمایاں تھیں۔ بعض دفعہ سیاسی جماعتوں نے بعض خواتین کو براہِ راست انتخاب کے لیے انتخابی ٹکٹ جاری کیے لیکن یہ وہ نشستیں ہوتی تھیں جن میں پارٹی کی نظر میں اہمیت کم ہوتی تھی اور ان کا خیال ہوتا تھا کہ یہاں ہمیں کامیابی نہیں مل سکے گی تو وہ خواتین کو پارٹی ٹکٹ جاری کر دیتے تھے۔

اسی طرح مخصوص نشستوں پر جو خواتین منتخب ہوتی رہی ہیں، ان کا براہِ راست تعلق بھی بڑے سیاسی خاندان اور گھرانوں سے رہا ہے اور چوں کہ ان نشستوں پر براہ راست انتخاب کا طریقہ کار موجود نہیں تو اس کا حق محض سیاسی جماعتوں میں موجود ان کی قیادت کے پاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان مخصوص نشستوں پر ان بڑے سیاسی خاندانوں کی خواتین کو نوازا جاتا رہا ہے اور یہ ہی الزام ہمیشہ رہا ہے کہ ان نشستوں پر ایسی خواتین منتخب ہوتی رہی ہیں جو خواتین کی حقیقی نمائندہ نہیں۔ ان میں بہت سی ایسی خواتین بھی منتخب ہوتی تھیں جن کا پارٹی کی سیاست میں کوئی براہ راست تعلق نہیں ہوتا تھا اور یہ عمل دیگر سیاسی کارکن خواتین کی حوصلہ شکنی کا سبب بنتا تھا۔ ملک میں 1985ء سے لے کر 1999ء تک اسی طریقہ کار کے تحت خواتین منتخب ہو کر آتی رہیں جب کہ اس کے برعکس سول سوسائٹی کا مطالبہ تھا کہ ان مخصوص نشستوں پر خواتین کے براہِ راست انتخاب ہونے چاہیے تاکہ ان خواتین کے انتخاب میں ووٹر براہ راست شامل ہو اور وہ اپنے ووٹر کو جواب دہ ہو۔ ووٹر کے پاس یہ حق ہونا چاہیے کہ جو لوگ بھی ان کے نمائندہ کے طور پر اسمبلیوں میں جائیں انہیں ان کے ووٹ کی تائید حاصل ہونی چاہیے۔

لیکن اب اگر پاکستان میں خواتین کی سیاسی عمل میں شمولیت اور سیاسی اداروں میں ان کی نمائندگی کے پہلو کو دیکھیں تو ہمیں ماضی کے مقابلے میں اب کافی بہتر صورت حال نظر آتی ہے۔ سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعتوں کے اندر بھی خواتین کی شرکت کو بڑھانے کے حوالے سے ایک احساس سامنے آیا ہے اور اب خواتین سیاسی جماعتوں میں بھی کافی متحرک اور فعال نظر آتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے لیے اب یہ عمل کافی مشکل ہوگیا ہے کہ وہ خواتین کو سیاسی عمل میں استعمال تو کریں لیکن ان کو اہم حیثیت میں وہ مقام نہ دیں جو ان کا سیاسی و قانونی حق ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی خواتین کے حوالے سے سماجی اور خاندانی سطح پر کئی طرح کے چیلنجز ہیں کیوں کہ قوانین کا بننا اہم عمل ہوتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جو قانون بنتے ہیں وہ لوگوں کے اندر بھی اپنی حیثیت کو منوا سکیں اور لوگ اس قانون کی اہمیت کو سمجھ کر اس پر عمل درآمد بھی کریں۔ لیکن چوں کہ ہمارے یہاں اب بھی خواتین کے خلاف سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی تعصبات پائے جاتے ہیں جو جگہ جگہ پر خواتین کی سیاسی عمل میں مؤثر شرکت کے حوالے سے رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ اسی طرح سیاسی جماعتوں کے اندر بھی ایسے بہت سے اہم لوگ ہیں جو اب بھی خواتین کی سیاسی عمل میں بہت زیادہ شرکت کے حامی نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ بہتری کی جانب بڑھے گا اور خواتین کو ان سیاسی اداروں میں شرکت کے مواقع کو پیدا کرنے میں ریاست، حکومت، سیاسی جماعتیں، قیادتیں، سیاسی کارکن سمیت قانون ساز ادارے اور میڈیا اس معاملے میں جو بھی رکاوٹیں ہیں، ان کو دور کرسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ہمیں اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک بڑی مشترکہ حکمت عملی اور سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے اور یہ کام سیاسی جماعتوں کے مؤثر کردار کے بغیر ممکن نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستانی سیاست میں اخلاقیات کا بحران اور قومی ذمہ داری

پاکستان کی سیاست ایک ایسی چیز بن چکی ہے جہاں روزانہ نت نئی باتیں اور کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو کہانی پیش کی جارہی ہے وہی اس ملک کا حقیقی مسئلہ ہے اور جب تک یہ بحران حل نہیں ہوگا ہماری سیاست ایک بہتر راستے کی جانب گامزن نہ ہو سکے گی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہماری سیاسی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں اہل سیاست اور اسٹیبلشمنٹ کے باہمی گٹھ جوڑ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ بازی یا نیچا دکھانے کے کھیل نے عملی طور پر لوگوں کے سامنے ایسے ایشوز کو مسائل بنا کر پیش کیا جو قوم کے حقیقی مسائل نہیں تھے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جو مسائل پیش کیے گئے یا کیے جارہے ہیں وہ غیر اہم نہیں، تو سوال یہ ہے کہ وہ مسائل جو قومی ترجیحات کی درجہ بندی میں سرفہرست ہونے چاہئیں ان پر پہلے غور کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں لوگوں کی نظروں کے سامنے کچھ اور ہو اور پس پردہ کچھ اور کھیل کھیلا جارہا ہو تو وہاں سیاسی مسائل کی جھلک وہ نہیں ہو سکتی جو سب کو دکھائی جارہی ہو۔ اس کے پس منظر میں یہ سوچ کارفرما ہو سکتی ہے کہ لوگوں کو شعوری طور پر ایسے غیر ضروری مسائل میں الجھا دیا جائے کہ وہ ان سے باہر ہی نہ نکل سکیں۔ انہی مسائل کو قومی مسائل سمجھ کر اپنی طاقت اور سیاسی جدوجہد کو ان کی نذر کر دیں۔ ریاست اور حکمران طبقہ لوگوں کو غیر اہم مسائل میں الجھا کر جہاں ان میں سیاسی تقسیم پیدا کرتا ہے، وہاں بالادست طبقوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ ملکی اور غیر ملکی سطح پر اپنا سیاسی ساز باز کا کھیل جاری رکھیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عام لوگ خود بخود سیاست سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سیاسی اشرافیہ کا طبقہ جس میں اہل دانش اور بالخصوص میڈیا سے وابستہ افراد شامل ہوتے ہیں، ریاست اور حکومت کا شعوری اور غیر شعوری طور پر حصہ بن کر عملاً لوگوں کے مفادات کی سیاست کے خلاف کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایسے مسائل کو قوم کے سامنے بڑا بنا کر پیش کرتے ہیں جو دراصل اہم نہیں ہوتے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اہم اور سنجیدہ مسائل کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ریاست اور حکومت بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شعوری طور پر ان اہم افراد کو جو رائے عامہ بنانے میں معاونت کرتے ہیں، بڑی خوب صورتی سے استعمال کرتی ہیں اور بعض اوقات ان میں سنجیدہ افراد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا کہ ان بالادست قوتوں کے ہاتھوں اپنے بالادست لوگوں کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔

معروف تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''تاریخ کی آگاہی'' میں شامل مضمون ''اخلاقی قدریں اور سماجی تبدیلی'' میں لکھتے ہیں:

''کیا پاکستان میں اخلاقی قدریں ہیں اور اگر ہیں تو انہیں کن معنوں اور مفہوم میں بیان کیا جاتا ہے۔ اوّل تو جب پاکستانی معاشرے کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے جاتے ہیں کہ یہ معاشرہ زوال پذیر نہیں بلکہ زوال شدہ ہے کیوں کہ اس کے سیاسی اور معاشرتی ادارے عوام کی بجائے حکمران طبقوں کے مفاد میں کام کر رہے ہیں۔ اس لیے معاشرے میں اخلاقی قدروں کے معانی بدل گئے ہیں، ایمان داری، پاکیزگی، دیانت داری، نیکی، رحم دلی، فیاضی، سخاوت، انسانیت اور دوستی کی روایات کو دیکھیں تو وہ ایک دوسرے ہی تناظر میں نظر آتی ہیں۔ اس کی جگہ منافقت، عیاری، دشمنی، بدمعاشی، جھوٹ، بدعنوانی اور غنڈہ گردی چھائی ہے۔ مگر ان روایات نے اخلاقی قدروں کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔''

صفحہ 153 میں اسی مضمون میں وہ آگے جا کر لکھتے ہیں:

''ایک زوال شدہ معاشرے میں اخلاقی قدریں بھی کمزور ہو جاتی ہیں۔ معاشرہ ایک ایسے جنگل کی شکل اختیار کر لیتا ہے جہاں ہر فرد ہر حربے اور ہر طریقے کو استعمال کر کے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اخلاقی قدروں کا سہارا نہیں لیتا اور اس وقت ہم ایک ایسے ہی بحران سے گزر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر مبارک علی نے بڑی خوب صورتی سے معاشرے کی اخلاقی قدروں کی تصویر کشی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشرے جب زوال پذیر یا زوال شدہ ہو جائیں تو ان میں جو اخلاقی قدریں سامنے آتی ہیں، وہ بالکل مختلف اور نئی ہوتی ہیں۔ اس طرح کی نئی تبدیلیاں پرانے خیالات کو ختم کر کے سماج میں نئے لفظوں اور خیالات کی قبولیت کو یقینی بناتی ہیں۔ مثلاً پاکستان کی سیاست میں آج کل جعلی ڈگریوں کے قصے عام ہیں اور ہر سطح پر ان جعلی اور بدعنوانی سے حاصل کی گئی ڈگریوں کی بازگشت زور و شور سے آواز میں سنائی دے رہی ہے۔ ملک کی اعلیٰ عدالتوں، اہم اداروں، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور سیاسی اشرافیہ سمیت سیاسی و سماجی طبقوں میں بھی سیاست دانوں کی جعلی ڈگریاں ایک تماشا بنی ہوئی ہیں۔ اہم اور سنجیدہ افراد بھی اس سیاست کا شکار نظر آتے ہیں اور ان کی گفتگو میں بھی دیگر موضوعات کم زیر بحث آتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، جعلی ڈگریوں پر زیادہ بات ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ اس پوری قوم کا مسئلہ جعلی ڈگریاں ہیں اور اہل سیاست اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ حالاں کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں 1200 سے زیادہ ارکان میں سے تقریباً 64 افراد پر یہ مقدمات چل رہے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بھی بعض لوگوں پر ان مقدمات کی نوعیت سیاسی ہو۔ اب تک کئی ارکان قومی یا صوبائی اسمبلی یا تو عدالتی فیصلوں کو قبول کرنے پر مجبور ہوئے ہیں یا انہوں نے حالات کے تناظر میں خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض ارکان اسمبلی کو ان کی اپنی جماعتوں نے عدالتی فیصلوں کے باوجود دوبارہ انتخابی ٹکٹ جاری کیے اور اہم بات یہ کہ ان میں سے چند افراد نے دوبارہ کامیابی بھی حاصل کی۔ ہمارے میڈیا نے پیپلز پارٹی کے جمشید دستی کے خلاف رائے عامہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور انتخابات سے ایک روز قبل بھی ان کے خلاف جعلی ڈگری کا شور سنایا جاتا رہا لیکن عوام کی عدالت میں جمشید دستی سرخرو ہوئے اور انہوں نے ثابت کیا کہ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ میڈیا ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ جو انتخابی نظام ہے اب یہ اچھے برے کی تمیز سے باہر ہوگیا ہے۔ صرف طاقت ور لوگوں کا ساتھ دیتا ہے اور اس میں سنجیدہ افراد کی جگہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ بعض لوگوں کی نظر میں یہ سارا گند پیپلز پارٹی کا پیدا کردہ ہے اور باقی جماعتیں اس برائی سے پاک ہیں، لیکن سب نے دیکھا کے اخلاقی بنیادوں پر پورا نہ اترنے والی جماعتوں میں پیپلز پارٹی ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ (ن) اور مسلم لیگ (ق) جیسی جماعتیں بھی شامل ہیں۔ ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ میڈیا سے سب سے زیادہ تنقید جمشید دستی پر ہوئی لیکن اسی میڈیا نے مسلم لیگ (ن) کے اس دوہرے معیار کو بحث کا موضوع نہیں بنایا کہ انہوں نے بھی جعلی ڈگری ہولڈر اجمل آصف اور نغمانہ مشتاق کو بالترتیب خانیوال اور فیصل آباد سے انتخابی ٹکٹ جاری کیے۔ چوں کہ یہ ارکان مسلم لیگ (ق) کو چھوڑ کر مسلم لیگ (ن) کا حصہ بنے تھے، اس لیے ان کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا گیا تھا، جو اُن کے ایک ایم این اے حاجی پرویز کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہماری دونوں بڑی جماعتیں پس پردہ اور کھل کر ان کی حمایت میں سرگرم ہیں اور بقول صدر زرداری کے قانون کے مقابلے میں عوام کی عدالت سب سے بڑی ہوتی ہے اور ہم اس میں سرخرو ہوئے ہیں۔ نواز شریف، جو اصولوں کی سیاست کے بڑے علمبردار ہیں، کی جماعت نے بھی ایک سے زیادہ نشستوں پر جعلی ڈگریوں کے تناظر میں سیاسی سمجھوتوں کا راستہ اختیار کیا۔

انہی جعلی ڈگریوں کے معاملے میں ایک فریق ہمارے جج اور ہماری عدالتیں بھی ہیں جو آج کل انصاف کے علمبردار ہیں اور ان کے بقول ڈگریوں سے پورا معاشرہ کھوکھلا ہو چکا ہے۔ ان کی باتیں بالکل ٹھیک ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جب اس ملک کے اقتدار پر جنرل پرویز مشرف براجمان تھے تو انہی عدالتوں اور ججوں نے 2002ء کے انتخابات کے تناظر میں سات سال تک جعلی ڈگریوں کے معاملے کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

التوا میں ڈالے رکھا اور وکلا کی بار بار درخواستوں کے باوجود کچھ نہ کیا گیا۔ اب جب کہ سیاسی حکومت ہے تو لگتا ہے کہ ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت سیاست دانوں کی کردار کشی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میں جعلی ڈگریوں کا حامی نہیں اور میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی ہونی چاہیے اور اعلیٰ عدالتوں کو ان جعلی ڈگریوں والے افراد پر کچھ سال تک سیاسی پابندیاں ضرور لگانا چاہیے کیوں کہ ان کے تحفظ نے ان لوگوں کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ جعلی ڈگریوں کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اخلاقیات کا یہ بحران محض سیاست تک ہی محدود ہے تو اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ اب تو سرکاری ملازمین، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں موجود اساتذہ، بیوروکریسی میں ایسے لوگ موجود ہیں جو جعلی ڈگریوں اور بدعنوانی کے معاملات میں پیش پیش ہیں۔ اب ان کے قصے بھی میڈیا میں سنائی دے رہے ہیں اور ہر طرف جعلی کاموں کا چرچا ہے۔ دراصل جب معاشروں میں اداروں کی بجائے افراد کی حکمرانی ہوگی اور ادارے اپنے قانون اور ضابطہ اخلاق کی بجائے طاقت ور عناصر کے ساتھ ہوں گے تو وہاں اخلاقیات کا بحران لازمی پیدا ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے اصول دراصل سماج کے اندر موجود کلچر اور روایات سے جنم لیتے ہیں اور اگر کوئی سماج مسلسل تیزی سے گراوٹ کا شکار ہو تو وہاں اچھی روایات اور اخلاقیات کے پہلو کیسے سامنے آسکتے ہیں؟ جب بالادست طبقہ، سیاسی جماعتوں اور دیگر شعبوں کی قیادت خود ان عناصر کی سرپرستی کریں گے جو اخلاقیات کے معیار پر پورا نہیں اترتے ہوں تو پھر معاشرے میں بہتری کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ ہمارے سماجی ادارے اور خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور اس میں اخلاقیات کا سوال خاصا پیچھے چلا گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ یا ادارے جو دوسرے لوگوں کی قیادت پر سوال اُٹھاتے ہیں، ان کی اپنی اخلاقیات کا معیار کیا ہے؟ کیا انہوں نے کبھی خود کو دوسروں کے سامنے احتساب کے لیے پیش کیا؟ اور اگر نہیں تو پھر اگلا سوال یہ اُبھرتا ہے کہ وہ کون سی طاقت ہے جو ان لوگوں کو اپنی اخلاقیات کی آڑ میں سیاسی و سماجی تحفظ فراہم کرتی ہے؟ سیاست دانوں کا ضرور احتساب ہونا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر اداروں کا اور بالادست طبقوں کو اس سارے عمل سے کیوں دُور رکھا جاتا ہے؟ جب اداروں کی اپنی اخلاقیات اپنے ہی اصولوں اور ضوابط کے خلاف کام کرتی ہے تو سیاست اس کا براہ راست شکار ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر اسمبلیوں کا رکن منتخب ہونے کے لیے تعلیمی شرائط کا حامی نہیں اور جنرل پرویز مشرف نے اس حوالے سے جو قانون بنایا تھا، اوّل تو وہ درست نہیں تھا اور دوم اس نے اس قانون کو خالصتاً اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اس کے تحت کئی لوگوں کو اسمبلیوں کی سیاست سے بھی دُور رکھا۔ اس طرح لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ جعلی ڈگریوں کے ساتھ اسمبلیوں کا حصہ بنیں۔ یہ تو محض ڈگریوں پر ایک طوفان مچا ہوا ہے۔ ارکانِ اسمبلی سمیت معاشرے کے دیگر طبقے جو نا گوشوارے جمع کرواتے ہیں اور اپنی آمدنی کو ٹیکس کے نفاذ سے بچانے کے لیے مختلف نوعیت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس کو بنیاد بناتا ہے تو آپ کو اپنا موجودہ سارا سیاسی سسٹم لپیٹنا ہوگا کیوں کہ اس میں جعلی ڈگری سمیت بہت سے ارکان کی تعداد ایسی ہے جو جان بوجھ کر غلط معلومات دے کے اسمبلیوں اور سیاست کا حصہ بنتے ہیں۔ اس پر تو ہمارا سارا میڈیا خاموش ہے اور خود نواز شریف کے بارے میں بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ بھی اپنی آمدنی اور اثاثہ چھپا کر کم ٹیکس ادا کرنے کے عمل میں برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے اس حمام میں ہمارے کئی پاک باز چہرے بھی ننگے ہیں لیکن انہوں نے شرافت کے لبادے اوڑھ کر اخلاقیات کی سیاست کا پرچم تھاما ہوا ہے۔ کبھی یہاں سیاست میں یہ آوازیں اُٹھتی ہیں کہ ارکانِ اسمبلی مختلف برائیوں کا شکار ہیں۔ ہمارے ایک دوست کے بقول کچھ لوگ چھپ کر برائیاں کرتے ہیں اور کچھ سرعام، اور سارا نزلہ ہم ان سامنے نظر آنے والوں پر گراتے ہیں اور پس پردہ لوگوں پر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ تمام برائیاں سیاست دانوں سمیت سب میں موجود ہیں اور خاص طور پر وہ بالادست طبقے جو براہ راست سیاست میں نہیں، وہ بھی ان کاموں اسی طرح شامل ہیں، جیسے نظر آنے والے لوگ ہیں۔ مذہبی جماعتوں کی سیاست کرنے والے لوگوں کے اندر بھی تضادات ہیں اور وہ بھی اخلاقیات کے اس معیار پر نہیں جو کبھی ان کا خاصا تھا۔ دراصل سیاست میں اخلاقیات کا تعلق سماجی کلچر اور سیاسی جماعتوں کی اندرونی جمہوریت اور شفافیت پر مبنی نظام سے ہوتا ہے اور اس میں سیاسی قیادت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسی موضوع پر معروف دانشور محمود مرزا اپنی کتاب ''مسلم ریاست جدید کیسے بنے'' میں شامل مضمون '' آمریت اور کرپشن کلچر کی بنیادیں'' میں لکھتے ہیں:

> '' جب ہمارے سیاسی کلچر کی حالت اس قدر ناقص ہے تو جمہوریت کے فروغ کے امکان کیسے روشن ہوں گے۔ اس بارے میں میری عرض یہ ہے کہ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے، اگر ہم حقیقت تسلیم نہیں کریں گے تو جمہوریت کے امکان روشن بنانے کے لیے جس کلچر انجینئرنگ کی ضرورت ہے، اس کے لیے درکار اقدامات ہم کیسے اُٹھائیں گے۔ جیسے کہ ہم آگاہ ہیں سیاسی کلچر کو موجودہ حالت تک پہنچانے میں مارشل لاء کے آمرانہ طرز حکومت کا بڑا کردار ہے۔ مارشل لاء حکام نے جمہوری عمل کو نہ صرف معطل کیا بلکہ اس کو مسخ بھی کیا۔ اصلی حالت میں نہیں رہنے دیا۔ حکومتی اور فوجی خفیہ ایجنسیوں نے سیاسی عمل میں مداخلت کی۔ وہ پروردہ اور خریدے ہوئے سیاسی کارکنوں کے ذریعے سیاسی جماعتوں کی پالیسیوں اور دوسرے امور پر اثر انداز ہوئے۔ کئی سیاسی پارٹیوں کو اپنی لائن دی۔ ان ایجنسیوں نے سیاست میں کرپشن کا عنصر داخل کیا اور ذرائع ابلاغ میں اپنے پروردہ افراد داخل کیے۔ سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت کش پروپیگنڈا کیا اور ان گروہوں کی حوصلہ افزائی کی جو جمہوری نظریات میں کنفیوژن پھیلاتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان ایجنسیوں کے پروردہ سیاسی کارکن ملک میں اعلیٰ سیاسی مقام حاصل کر گئے۔ چنانچہ یہ فطری نتیجہ ہے کہ آج جاہ پرست خوشامدی اور کرپٹ لیڈر اقتدار کے کھیل میں نمایاں ہو گئے ہیں۔" (صفحہ 90-91)

محمود مرزا نے ٹھیک تجزیہ کیا ہے کہ آج سیاست میں جو زوال آیا ہے، اس میں ایک خاص طبقہ تھا جن کی پس پردہ حمایت اور سرپرستی کی گئی اور وہ ہم پر مسلط ہو چکا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے ہم اتنے معصوم کیوں ہیں کہ ہمیں کوئی بھی استعمال کر لے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ہم معصوم نہیں شاطر ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم جو کام کر رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ لیکن ہمارے مفادات کے تحت وہ ضروری ہوتا ہے۔

معروف دانشور صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار عبدالکریم عابد نے اپنی کتاب "پہلی بات" میں شامل مضمون "قومی نفسیات کا بگاڑ" میں لکھا ہے:

"اگر کوئی معاشرہ جور و جبر کا شکار ہے اور لوگوں نے ظالمانہ نظام قبول کر لیا ہے تو ایسے معاشرہ میں عقل و منطق بھی زوال پذیر ہوگی اور اخلاق و ضمیر بھی۔ اس طرز کے معاشرے دو ہی طرح کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ بالادست طاقت انہیں اپنا غلام بنا لے اور انہیں اپنی خدمت گاری پر لگا لے یا ایسا معاشرہ مادی ترقی و اخلاقی بہتری کا جوہر کھو دینے کے بعد افراتفری اور خانہ جنگی میں پڑ کر ٹوٹ پھوٹ جائے۔"

یہاں اصل سوال یہ ہے کہ ہمارے ماضی سے یا آج کے حکمران کس مینڈیٹ کے ساتھ اقتدار میں آئے تھے۔ کیا ان سب کے سامنے فروعی مسائل تھے۔ حکومت جب اقتدار میں آئی تو اس کے سامنے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور داخلی و خارجی سطح پر بے شمار چیلنجز تھے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس حوالے سے پھیلے ہوئے لاتعداد مسائل حکومتی ترجیحات کا اہم حصہ بننے چاہئیں۔ لیکن یہ سب باتیں کہاں گئیں اور وہ تمام سیاسی وعدے جو لوگوں کی زندگیوں میں خوش حالی لانے کے لیے صدر زرداری، نواز شریف، شہباز شریف، اسفند یار ولی خان، مولانا فضل الرحمان، الطاف حسین نے اپنے ووٹروں کے ساتھ کیے تھے، وہ کہاں ہیں؟ داتا دربار کے سانحہ پر سیاست چمکانا اور ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرنا تو آسان کام ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت اس دہشت گردی کا مستقل حل تلاش نہیں کر سکی۔ اور جو حل ہمیں سجھایا جا رہا ہے وہ بین الاقوامی نقطہ نظر کے قریب ہے۔ اب تک اس دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک بڑی قومی اتفاق رائے سامنے نہیں لا سکی۔ غیر ملکی مداخلتوں پر ہمارا حکمران طبقہ عملاً خاموش ہے۔ اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ صرف بعض بڑے ممالک اور ان کے نمائندے پاکستان میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے فیصلوں کے تناظر میں ہم پر بالادستی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت نے بعض شعبوں میں سیاسی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا ابھی تک براہِ راست اثر عوام اور اداروں کی سطح پر نظر نہیں آ رہا۔ اگرچہ اداروں کے درمیان تصادم نہ ہونے کی باتیں کی جاتی ہیں لیکن ابھی اداروں کے درمیان باہمی تصادم کے خدشات موجود ہیں اور کم نہیں ہوئے ہیں۔ خود حکومت میں اہم عہدوں پر ایسے لوگ موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً ہمیں ڈراتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ حکومتوں کے خلاف سازشیں کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ سیاسی قیادت کی ناکامی اس میں کسی ایک جماعت کی ناکامی نہیں بلکہ مجموعی طور پر حکمران طبقہ شامل ہے جو لوگوں کے اندر امید پیدا کرنے کی بجائے انہیں روشنی سے دور لیتا جا رہا ہے۔ حکمرانوں نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے سارا الزام سابقہ حکمرانوں پر ڈال دیا ہے۔ اور جو ان کی اپنی ناکامی ہے وہ بھی انہی کے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے۔ اس لیے پہلے ہمیں اس اخلاقیات کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے کہ ہم پر جو حکمران طبقہ مسلط ہے، وہ سیاسی اور سماجی سطح پر کیا گل کھلا رہا ہے اور عوام کے لیے کچھ کر بھی رہا ہے یا نہیں۔ اخلاقیات میں فرد کا وعدہ بہت اہم ہوتا ہے لیکن یہاں تو ہمارے ساتھ یعنی عوام کے ساتھ ایک نہیں کئی کئی وعدے کیے گئے اور ان وعدوں کی خلاف ورزی پر شرمندہ ہونے کی بجائے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں جعلی ڈگریوں کا ضرور ماتم کرنا چاہیے۔ لیکن یہ غم محض اس ایشو تک محدود نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ یہاں ایک فرد یا شعبہ بگاڑ کا شکار نہیں بلکہ ہمیں دیگر امور بالخصوص سماجیات، اخلاقیات اور سیاسیات سمیت سب پہلوؤں کی اصلاح کرنی ہوگی۔ اگر ہم ان مسائل کو محض سیاسی تنہائی میں دیکھیں گے اور ہر مسئلہ کو ایک مسئلہ سمجھ کر بات کریں گے تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے کیوں کہ سیاست میں جب اخلاقیات کے تناظر میں بگاڑ شروع ہوتا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہمارا مجموعی سیاسی تناظر اصولوں کی سیاست سے دور ہو چکا ہے اور ہم بے اصولی کی سیاست میں اپنی بہتری کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ ہماری سیاسی جدوجہد چند لفظوں اور چند مصنوعی نعروں اور مسائل تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہم وہ بڑا تناظر بھول جاتے ہیں جو ایک قومی بحران کی شکل میں ہمیں بطور قوم درپیش ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری اصل بدقسمتی یہ ہے کہ پوری سیاسی قیادت، سیاسی اشرافیہ اور میڈیا میں موجود سب لوگوں کی اکثریت ایک ایسے کھیل کا حصہ بن گئی ہے، جو دراصل ہمارا کھیل نہیں بلکہ اس کھیل میں جس بوجھ کر ہمیں الجھایا جا رہا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ قوم بھی ان بالادست طبقوں کے کھیل میں اپنا اصل کام اور راستہ بھول گئی ہے۔

اس لیے میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ جعلی ڈگریوں کا معاملہ ہو یا اسی طرح کے دیگر سیاسی و انتظامی مسائل، ہمیں ان کا گہرائی تک تجزیہ کرنا چاہیے۔ اپنی سوچ کو محدود کرنا اور اس میں رہ کر اپنی طاقت کو ضائع کرنا اصل کام نہیں۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب ہمارے ہاں لوگ سیاسی طور پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ شعور رکھیں گے اور جان سکیں گے کہ ہم جن کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں وہی ہمیں دراصل پیچھے رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سیاست میں اخلاقیات کی سیاست چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے مجموعی طور پر سیاست کے اندر بڑی اور جامع اصلاحات کی ضرورت ہے۔ یہ کام محض جعلی ڈگریوں پر پابندی سے نہیں ہوگا اور اس طرح کی پابندیاں ان بڑے طاقتور گروپوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ ہم نے دیکھ لیا کہ جب ڈگری کی شرط لگائی گئی تو انہوں نے جعلی ڈگریوں کے حصول کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو آج ہمیں نظر آرہا ہے۔ اس لیے ہماری سیاسی اشرافیہ کو اپنی سیاسی سمجھ بوجھ بڑھانے کے لیے اسٹیبلشمنٹ کیا، اصل سیاست کو سمجھنا ہوگا کہ وہ ان ایشوز کے ساتھ کس ایجنڈے کو بالادست کرنا چاہتے ہیں۔ کون سے وہ عناصر ہیں جو اس اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا حصہ بن کر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ملک کے اندر سیاسی عمل کو کمزور کرنے اور جمہوری عمل کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فرد کی تبدیلی سے سیاست میں اخلاقیات کا سوال مضبوط ہوسکتا ہے اور یہ کسی حد تک ٹھیک بھی ہے لیکن بعض دفعہ فرد کی اصلاح اداروں کے اندر موجود سسٹم سے ہوتی ہے اور شفاف اور خود احتسابی پر مبنی نظام کرپٹ سے کرپٹ لوگوں کو بھی مجبور کردیتا ہے کہ وہ اگر سیاست کرنا چاہتے ہیں تو انہیں سیاسی اخلاقیات کے ساتھ نظام کا حصہ بننا ہوگا ورنہ دوسری صورت میں شفافیت پر مبنی نظام ان کو نکال باہر کرے گا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ کرپشن، بدعنوانی اور جعلی کام ہر ملک میں ہوتے ہیں لیکن اداروں کی مضبوطی ان کو روکنے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ مگر یہ بدقسمتی ہے کہ ہم سیاست کے اخلاقی بحران کی لڑائی میں اپنی قومی ذمہ داری اور مسائل کو بھول گئے ہیں اور یہ عمل ایک بڑی مجرمانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے تبدیل ہونا چاہیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کا سیاسی نظام
جرائم پیشہ اور مافیا کے کنٹرول میں

پاکستان کے سیاسی نظام کے بارے میں ہماری سیاسی اشرافیہ اور اہل دانش میں ہمیشہ سے یہ بحث رہی ہے کہ یہ سول اور فوجی حکمرانی کے درمیان ایک سرد جنگ کے طور پر موجود ہے۔ اس جنگ میں اگرچہ ہمیشہ سے فوجی یا پس پردہ قوتوں کی بالادستی موجود رہی ہے لیکن اس کے باوجود سیاسی فریقین نے جہاں اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کیا یا ان کی طاقت کو محسوس کروایا تو انہوں نے بھی اپنی بالادستی کو منوانے کے لیے اپنے پتے کھیلے ہیں۔ ہماری سیاسی جدوجہد فوجی حکمرانی کے مقابلے میں سول یا جمہوری حکمرانی کو طاقت دینے میں مگن رہی ہے۔ میں یہاں بہت زیادہ ذکر سیاسی قیادتوں اور ان کے اہم رہنماؤں کی سیاسی جدوجہد کا نہیں کر رہا بلکہ میری مراد ان تمام سیاسی کارکنوں سے ہے، جو مختلف ادوار میں رہتے ہوئے سیاسی جدوجہد کا حصہ ہیں۔ اسی جدوجہد میں انہوں نے نہ صرف اپنی زندگیاں وقف کی ہیں بلکہ اس عمل میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں، جسمانی اور ذہنی تشدد، کوڑے اور کئی کئی برسوں تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہے ہیں۔ اس عمل میں صرف مرد سیاسی کارکن ہی نہیں بلکہ خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو اپنی سیاسی جدوجہد کی اپنی الگ داستان رکھتی ہیں اور انہیں ریاست و سماجی جبر کے ساتھ ساتھ معاشرتی تعصبات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ محض سیاسی کارکنوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں ہماری سیاسی اشرافیہ یا سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے مرد اور خواتین نے فکری اور عملی محاذ پر جمہوریت اور ایک منصفانہ معاشرے کی جدوجہد میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس عمل میں انہیں بھی ریاستی و حکومتی جبر کا مختلف انداز میں سامنا کرنا پڑا، اس جدوجہد میں انہیں اپنی ملازمتوں کی برطرفی کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود بہت سی دنیاوی ترقیوں سے بھی محروم ہونا پڑا، لیکن ان کی جدوجہد و نظریاتی کمٹمنٹ انہیں اپنا راستہ چھوڑنے پر مجبور نہ کر سکی۔

مجھے پاکستان میں سیاسی کارکنوں اور دیگر طبقات کی سیاسی و فکری جدوجہد سے کبھی انکار نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے دونوں طبقات نے مختلف ادوار میں جدوجہد کی ہے اور یہ جدوجہد اب بھی جاری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بحث بھی موجود ہو کہ کس نے حقیقی طور پر جدوجہد کی ہے، مگر میرے نزدیک یہ بحث بے معنی ہے کیوں کہ سیاسی کارکن عملاً سیاسی کارکن ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کس نے زیادہ شدت کے ساتھ اور کس نے کم شدت کے ساتھ جدوجہد کی ہے یا قربانیاں دی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارا جو معاشرہ ہے، اس میں سیاسی کارکن ہونا اور اس کی جدوجہد کرنا یا مزاحمتی کردار ادا کرتے ہوئے جیل جانا کوئی اچھا پہلو نہیں سمجھا جاتا اور خاندان و معاشرے کی سطح پر ایسے لوگوں کی جدوجہد کو سلام کرنے کی بجائے انہیں بے وقوف یا پاگل سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم معاشرے میں ایک بہت بڑی جدوجہد کے باوجود اس ملک میں اس جمہوریت کو مضبوط کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے، جس کے لیے ہم نے جدوجہد کی یا جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا۔ کیا پاکستان کا سیاسی بحران محض اب بھی سیاسی حکمرانی کا ہے اور کیا ہمارا سیاسی بحران اس دائرے کے اندر تک محدود ہے یا صورتِ حال کچھ اور بھی ہے۔ دراصل اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں فوجی اور سیاسی حکمرانی کا سوال انتہائی اہم ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی آزادی سے لے کر اب تک اسی مخمصے کا شکار ہیں کہ یہاں کس کی حکمرانی ہونی چاہیے۔ اگرچہ یہ بات طے ہے کہ ہم اس ملک کو جمہوریت کے تناظر میں ہی آگے بڑھا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود طاقت کے بڑے کھلاڑی جمہوریت کے مقابلے میں اپنے آپ کو آگے لے آتے ہیں اور یوں ہمارا جمہوری تسلسل برقرار نہیں رہ پاتا۔ لیکن اب صورتِ حال محض سیاسی اشرافیہ اور سیاسی تبدیلی کے سنجیدہ کارندوں کے لیے صرف سیاسی اور فوجی حکمرانی کے سوال تک ہی محدود نہیں رہی کیوں کہ اب یہ احساس اچھی طرح غالب ہوتا جارہا ہے کہ ملک میں سیاسی حکمرانی ہو یا فوجی حکمرانی، ہمیں دونوں میں ایسی کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی جو عام لوگوں کی خواہشات کی ترجمانی کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ دونوں طرز کے نظام سے مایوس ہوتے جارہے ہیں اور انہیں اب فوجی یا سول حکمرانی سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ ان کا خیال ہے کہ اب بات آگے تک پہنچ گئی ہے اور دونوں طرز کی سیاست میں ایک مافیا کی سیاست کا منظر غالب آگیا ہے اور اس مافیا کی سیاست میں سول اور فوجی حکمرانی کا آپس میں ایک گٹھ جوڑ بن گیا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سیاست کے اندر اور باہر جو مافیا ہیں، وہ ہی عملی طور پر سیاست چلا رہے ہیں۔ اس عمل نے ان تمام سنجیدہ سیاسی کارکنوں اور سیاسی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے مختلف طبقات جن میں میڈیا، وکلا، سماجی کارکن، ریٹائرڈ حضرات یا ایسے عناصر جو سیاسی عمل میں ایک بڑا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں، ان کے راستے آہستہ آہستہ مخدوش ہوتے جارہے ہیں۔ ان سیاسی کارکنوں اور سنجیدہ علمی و فکری حضرات کے مقابلے میں اب ہماری سیاست پر جو عناصر مضبوط قبضہ جما

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چکے ہیں، ان میں بڑے بڑے مافیا اور ایسے حضرات ہیں جو محض اپنی دولت اور طاقت کے ساتھ ساتھ پس پردہ قوتوں کے آلہ کار بن کر سیاسی رہنماؤں کا روپ دھار چکے ہیں۔ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے، جو ناجائز انداز میں لوٹ مار کر کے دولت کماتے ہیں، اور اسی ناجائز دولت کی بنیاد پر وہ سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کی سیاسی ضرورت بن جاتے ہیں۔ اسمبلیوں میں ایسے ارکان کی تعداد کافی ہے جن پر مختلف معاملات، جن میں لوٹ مار، پلاٹوں اور زمینوں اور سرکاری املاک پر قبضے، بینکوں سے قرضے معاف کروانا، کرپشن، بدعنوانی، جعل سازی، اغوا، مخالفین پر انتقامی کارروائیاں، جعلی ڈگریاں پیش کرنا، قتل کرنا شامل ہیں، ان پر مقدمات درج ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے ارکان ایسے بھی ہوں گے جن پر یہ مقدمات جعلسازی سے بنائے گئے ہوں گے، لیکن یہ تمام تر جھوٹ نہیں کیوں کہ ان لوگوں کا مقامی پولیس اور عدالتوں پر کنٹرول ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف مقدمات کا شفاف انداز میں فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ بدقسمتی یہ ہے ان سب لوگوں کو تحفظ ہماری سیاسی اور غیر سیاسی حکومتیں اپنے اقتدار کو تقویت دینے کے لیے دیتی ہیں اور یہ عمل ان لوگوں کو کمزور کرنے کی بجائے اور زیادہ مضبوط بناتا ہے۔ سیاست کو اب محض ایک کاروبار کی شکل میں دیکھا جارہا ہے اور خیال کیا جارہا ہے کہ جو بھی سب سے زیادہ مالی investment کرے گا، وہی سیاست کا بڑا کھلاڑی ثابت ہوگا۔

یقیناً جو لوگ قومی، سینٹ، صوبائی اور مقامی انتخابات میں کروڑوں روپے خرچ کریں گے تو اس کی بجائے غریب سیاسی کارکن کہاں جائے گا۔ جب یہ لوگ سیاست میں Heavy finnancial investment کریں گے، تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عوامی مفادات پر مبنی سیاست کو تقویت دیں گے، ایک خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں انتخابی قوانین بھی موجود ہیں جو انتخابات میں اخراجات کی حد بھی مقرر کرتے ہیں لیکن اس پر کہیں بھی عملدرآمد نہیں ہوتا۔ سیاست جو عوامی خدمت اور معاشرے میں بہتر تبدیلی کا نام ہے، اب ایسے کاروبار میں تبدیل ہو چکی ہے جس نے سیاست کا مجموعی مزاج ہی بدل دیا ہے۔ اس مزاج کی تبدیلی نے عام اور غریب سیاسی کارکنوں کے اندر بھی ایک کاروباری سوچ کو تقویت دی ہے کہ اگر ارکان اسمبلی اور سیاست دان پیسے کماتے ہیں تو ہم اس کھیل میں کیوں پیچھے رہیں۔ اس لیے انتخابات کے عمل میں اب سیاسی کارکن بھی وہی سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو پورے سیاسی ماحول کو آلودہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس وقت بھی کئی ایسے ارکان اسمبلی ہیں جن کی لوٹ مار کے بارے میں کسی کو شبہ نہیں اور یہ حضرات چند برسوں میں لکھ پتی سے ارب پتی بنے ہیں اور ان کی لوٹ مار کے قصے بھی عام ہیں، لیکن قیادت کی خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ وہ خود بھی سمجھوتوں کی سیاست کے قائل ہو گئے ہیں۔ میں ایسے کئی ارکانِ اسمبلی اور سیاست دانوں کو جانتا ہوں جو اپنی لوٹ مار اور بدعنوانی پر پردہ ڈالنے اور سیاسی قیادت کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے پارٹی فنڈ میں کروڑوں روپے جمع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرواتے ہیں اور پارٹی ان کی کرپشن پر اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ اس سارے کھیل میں وہ تمام بڑے بڑے سیاسی رہنما پیش پیش ہیں جو ہمیں ہر وقت جمہوریت کی مضبوطی کا درس دیتے ہیں اور پس پردہ جرائم پیشہ افراد کی کھل کر سپورٹ کرتے ہیں۔ اس کھیل میں اب ماشاء اللہ مذہبی جماعتوں کے لوگ بھی پیچھے نہیں رہے اور میں ان میں سے بھی کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو مذہب کی سیاست کے نام پر سیاست میں دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ چند برسوں میں انہوں نے جس انداز میں کمایا ہے، وہ بھی ایک بڑے سوالیہ نشان کے طور پر موجود ہے۔ ہم سارا غصہ تو مولانا فضل الرحمان پر نکالتے ہیں لیکن دیگر مذہبی جماعتوں میں شامل بہت سے افراد بھی طاقت کی سیاست کا کھیل کھیل رہے ہیں اور ان میں سے بیشتر کا تعلق پس پردہ قوتوں اور مافیا کی سیاست کے کارندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ان مذہبی جماعتوں میں بھی اب احتساب کا وہ نظام موجود نہیں جو کسی زمانے میں ان کا خاصا تھا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ سیاست میں دولت اور مافیا کی سیاست کا کھیل اور اس کا بیج جنرل ضیاالحق مرحوم نے بویا تھا اور اس کی مزید آبیاری ان کے بہت سے سیاسی جانشینوں نے خوب کی جن میں بالخصوص نواز شریف پیش پیش ہیں۔ یہ جنرل ضیاالحق ہی کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے اپنے اقتدار کو طاقت دینے کے لیے پہلی بار ملک میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کے لیے سیاسی رشوت کے طور ''ترقیاتی فنڈ'' متعارف کروایا۔ آج ہماری اسمبلیوں میں ایسے لوگ چھا گئے ہیں جن کے پاس سیاسی سمجھ بوجھ ہے اور نہ ان کو سیاست یا قانون سازی سے کوئی دلچسپی ہے۔ ان کے سامنے صرف اور صرف ایک ہی بڑا ہدف ہے اور اس بلا کا نام ترقیاتی فنڈ ہے اور یہ عناصر بڑی سیاسی قیادتوں اور حکومت کو بلیک میل کر کے فنڈ کے حصول کی سیاست کو تقویت دے رہے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل نے ملک میں مقامی حکومتوں اور اداروں کو بھی مضبوط نہیں ہونے دیا اور سیاست قانون سازی سے نکل کر کرپشن کا گڑھ بن چکی ہے۔ اسی سیاسی اور غیر سیاسی نظام کی بحث میں ہماری سیاست میں خاندانی سیاست کا بیج جو پہلے بھی موجود تھا، اب ایک خوف ناک صورت میں سامنے آ چکا ہے۔ اب سیاسی خاندان میں موجود بڑے لوگوں نے اپنی سیاست کو مضبوط بنانے کے لیے سیاسی بٹوارے کر لیے ہیں۔ یعنی ایک ہی سیاسی خاندان کے لوگ مختلف سیاسی جماعتوں کا حصہ بن گئے ہیں تاکہ جو بھی جماعت اقتدار میں ہو، یہ تمام لوگ ایک دوسرے کے سیاسی و مالی مفادات کو تقویت دے سکیں۔ اس کھیل میں کسی بھی سیاسی جماعت کا ریکارڈ جمہوری نہیں اور اس وقت بھی مولانا فضل الرحمان، آصف علی زرداری، نواز شریف، چوہدری شجاعت حسین سب ہی موروثی سیاست کو مضبوط بنا رہے ہیں اور سب کی کوششیں ہیں کہ سیاسی طاقت اپنی ہی جماعت کے لوگوں تک پھیلانے کی بجائے اپنے خاندان تک ہی محدود رکھی جائے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ پہلے پاکستان کی سیاست میں جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور اس کے بعد جنرل ضیاالحق کے دور میں سرمایہ داروں کا اضافہ ہوا اور اب اس میں نئی شکل مافیا کی سامنے آ گئی ہے اور ان کو جمہوری اور غیر جمہوری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دونوں حکومتوں میں تحفظ حاصل رہا ہے۔

یہاں یہ کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہماری سیاست میں مڈل کلاس اور متوسط طبقے کا پڑھا لکھا نوجوان کبھی بالادست نہیں رہا۔ یقیناً بہت سے لوگ ہیں اسی جکڑی ہوئی سیاست میں سامنے آئے۔ جماعت اسلامی، ایم کیو ایم، پیپلز پارٹی، اے این پی، مسلم لیگ سب میں ایسے لوگ موجود رہے جو مڈل کلاس سیاست کا حصہ تھے لیکن ہم سب نے دیکھا کہ اگر یہ لوگ سیاست میں آئے تو بہت مختصر عرصے میں یہ لوگ مڈل کلاس سیاست کا حصہ نہیں رہے بلکہ اب عملی طور پر وہ خود سرمایہ دار کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ایم کیو ایم کے لوگ جو مڈل اور لوئر مڈل کلاس سے تھے، انہوں نے نہ صرف خوب دولت کمائی بلکہ وہ ایک بڑی مافیا کی سیاست کا حصہ بن گئے ہیں۔ اب سیاسی قیادتوں ہی کو دیکھ لیں، ان میں کہاں ہیں مڈل کلاس کی قیادتیں، نواز شریف، شہباز شریف، آصف علی زرداری، بھٹو خاندان، خورشید قصوری، بیگم عابدہ حسین، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الٰہی، حامد ناصر چٹھہ، آفتاب شیر پاؤ، مولانا فضل الرحمان، مخدوم جمیل صالح حیات، الطاف حسین سمیت سب ہی کس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ ہم سے ڈھکا چھپا نہیں۔ اس لیے یہاں ایک سوال جو بہت اہمیت کا حامل ہے کہ جب ہم جمہوریت کی جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں تو اس کا فائدہ کن قوتوں کا ہوتا ہے اور کیا یہ واقعی جمہوری لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ بعض اوقات ہماری سیاسی جدوجہد کا فائدہ سیاسی نظام اور جمہوریت کے مقابلے میں مخصوص افراد یا ان کی قیادت کو ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح ہم میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو جمہوریت کے نام پر شخصیت پرستی یا فردِ واحد کو مضبوط کرنے کا سامان کر رہے ہوتے ہیں۔ مڈل کلاس یا متوسط طبقے کے لوگوں، جو سیاست میں ایک متحرک اور فعال کردار ادا کرنا چاہتے ہیں، کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا کے وہ سیاست میں موجود بڑے ہیوی ویٹ جو دولت اور حماقت کی بنیاد پر سیاست کر رہے ہیں، ان کا حصہ بن جائیں۔ وہ نعرے بھی لگائیں، جلسے جلوس کی رونق بھی بڑھائیں، لوگوں کو پارٹیوں کا ممبر اور حصہ دار بنائیں، ووٹ مانگیں اور اپنی جماعت اور افراد کو ووٹ دلوائیں، ان کے جائز و ناجائز کاموں کو سیاسی تحفظ فراہم کریں، انہیں معاشرے یا ان کے حلقوں میں باعزت بنا کر پیش بھی کریں، لیکن اگر اس کے برعکس وہ خود سیاسی اداروں میں آنا چاہیں تو ان کے لیے راستے بند ہوں اور ان کی اس خواہش کو سیاسی قیادتیں مختلف جواز بنا کر پیش کریں اور انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔

علمی اور فکری محاذ پر جو لوگ موجود ہیں، ان کے پاس بھی راستے محدود ہو گئے ہیں اور وہ بھی سیاسی گروپ بندی کا شکار ہیں اور جمہوریت کی لڑائی لڑتے وقت وہ اندرونی محاذ پر پھیلی ہوئی ان برائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں ان کی جدوجہد کا فائدہ کن لوگوں کو ہو رہا ہے جو جمہوریت کی کمزوری کے اسباب ہیں۔ اس کی اصل جڑ اور خرابیاں کہاں ہیں۔ یہ جو ہر بات میں فوجی حکمرانی کو برا بھلا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہہ کر جمہوریت کے نام پر بہت سی موجود خرابیوں پر پردہ ڈالتے ہیں، اس کے ذمہ دار بھی ہم ہی ہیں۔ یقیناً فوجی حکمرانی غلط ہے اور اس کے جواز کا کوئی بھی پہلو قابل قبول نہیں لیکن یہ کہنا کہ جمہوریت سے وابستہ افراد ایک بہتر روڈ میپ پر ہیں، تو وہ بھی غلط ہے اور اس پر پردہ ڈالنے والے افراد بھی کسی نہ کسی شکل میں ان خرابیوں کو تقویت دیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کا علاج کیسے ممکن ہوگا۔ کیا جمہوریت بھی ناکام ہوگئی ہے اور کیا ہمیں اس سے وابستہ توقعات ختم کر لینی چاہئیں؟ تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اور یقیناً ہمیں جمہوریت کے راستے میں سے بہتری کی شکلیں اختیار کرنا ہوں گی۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہر سیاسی جماعت اور سیاسی اشرافیہ میں اچھے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں، اور جو واقعی موجودہ حالات اور سیاسی راستہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے بند ہونے پر فکرمند ہیں۔ یہ ہی لوگ نجی محفلوں میں سیاسی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کی ڈکٹیٹرشپ پر بھی نالاں ہیں۔ پچھلے دنوں وزیراعلیٰ پنجاب کے ایک ایڈوائزر سے بات چیت ہوئی اور جو کچھ انہوں نے اپنے وزیراعلیٰ کے لیے کہا وہ واقعی حیران کن تھا اور انہوں نے جو کچھ سچائی سے کہا، یہ عمل ہر سطح پر موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں مختلف سیاسی وسماجی کارکنوں، سول سوسائٹی سے وابستہ اداروں میں شامل افراد، اہل دانش، اور فکری وعلمی محاذ پر موجود افراد سمیت بہت سے لوگوں کو معاشرے میں سیاسی نظام کے اندر پھیلی ہوئی ان خرابیوں کے خلاف محاذ بنانا ہوگا اور ایسے تمام لوگ بشمول اپنی اپنی سیاسی قیادتوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کرنا ہوگی۔ انہیں احساس دلانا ہوگا کہ سیاست کے نام پر کاروبار اور دیگر مختلف بیماریوں کو جو سیاسی تحفظ دیا جارہا ہے، اب وہ ہمیں قابل قبول نہیں۔ جو اس وقت طریقہ انتخاب اور طریقہ سیاست ہے۔ اس کے خلاف ایک بڑی سیاسی بغاوت کی ضرورت ہے اور یہ جو ہم نے اپنے کندھے سیاسی قیادتوں کو احتساب کے لیے پیش کیے ہوئے ہیں، اس پر بھی سوچنا ہوگا۔ اس تاثر کو بھی ختم کرنا ہوگا تاکہ ہم سیاسی شخصیت پرستی اور فرد واحد کو مضبوط کرنے کی بجائے اداروں کو مضبوط بنائیں اور اگر ادارے مضبوط ہوں گے تو افراد کا آنا جانا لگا رہے گا اور کوئی بھی اپنے آپ کو اداروں سے بالاتر بنا کر پیش نہیں کر سکے گا۔ علمی اور فکری محاذ پر موجود اہل دانش کو بھی سابقہ عشق اور محبتوں کے جال سے باہر نکلنا ہوگا اور اگر وہ اپنی محبت کو برقرار رکھنا چاہیں تو یہ اچھی بات ہے لیکن اس کے لیے پھر انہیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنا چاہئیں۔ برائی اور غلطی جہاں سے بھی ہو اور جو بھی کر رہا ہو اس کی محض اس بنیاد پر پردہ پوشی نہ کی جائے کہ اس سے آپ کی محبت کا تعلق ہے، اس کا احتساب ہونا چاہیے اور فکری محاذ پر موجود لوگوں کی انفرادی سطح سے ہٹ کر ایک قومی ذمہ داری کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ اگر سیاسی اور سماجی سطح پر لوگ اس صورت حال میں سیاسی جماعتوں اور اپنی پسند وناپسند سے بالاتر ہو کر اکٹھے ہوتے ہیں اور عام لوگوں کو سیاسی شعور دیتے ہیں کہ جمہوریت کی جدوجہد ضرور کی جائے لیکن اس کے خدوخال واضح ہونے چاہیے تو یہ ایک اچھی کوشش ہوگی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دراصل اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں جمہوریت کی مضبوطی اور بالخصوص اس میں عام آدمی کی طاقت کے تناظر میں ایک نئے سیاسی چارٹر کی ضرورت ہے۔ یہ سیاسی چارٹر محض ایسے ہی سب کے سامنے نہیں آئے گا بلکہ اس کے لیے معاشرے میں موجود مختلف طبقات کو آپس میں جوڑنا ہوگا اور جب تک سیاسی جماعتوں کے اندر سے اس پر آواز نہیں اٹھے گی تو اور لوگ منظم نہیں ہوں گے، معاملہ جوں کا توں رہے گا۔ دراصل اب ہمیں چپ کا روزہ توڑنا ہے اور یقیناً یہ کام آسان نہیں، بالخصوص سیاسی جماعتوں کے اندر لیکن یہ کام ہونا ضرور ہے اور آپ نہیں تو کوئی اور ضرور کرے گا۔ اس لیے ہمیں جمہوریت کی مضبوطی سے پہلے مافیا کی سیاست سے آزاد ہونا ہوگا۔ ورنہ دوسری صورت میں جمہوریت کے نام پر ہمارا سیاسی استحصال بھی ہوگا اور ہمیں سیاسی محاذ پر دیوار سے لگانے کی پہلے سے جاری کوششوں کو اور زیادہ طاقت فراہم کی جائے گی۔ اس سلسلے میں بہت سے افراد یا گروہ مل کر ایک بڑی مشاورت کا اہتمام کر کے اس بحث کو آگے بڑھا سکتے ہیں اور بحث کو محض اسلام آباد یا چند بڑے شہروں تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس بحث کا دائرہ کار وسیع ہونا چاہیے۔ اس بحث کا یہ وسیع دائرہ کار لوگوں میں ایک نئی سیاسی سوچ کو اُجاگر کرنے میں معاونت فراہم کرے گا۔ معاشرے میں ایک نئے سیاسی کلچر کی بنیاد پڑ سکے گی اور سیاست دوبارہ ان ہی خطوط پر استوار ہو سکے گی جہاں اس کی بنیاد عوام اور ان کے مفادات کی سیاست ہوگی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ جات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حکومتیں اور اسمبلیاں توڑنے کے اعلانات

اسمبلی توڑنے کا گورنر جنرل غلام محمد کا اعلان

ملک کو درپیش سیاسی بحران پر غور کرنے کے بعد گورنر جنرل نہایت افسوس کے ساتھ اس نتیجے پہنچے ہیں کہ دستور ساز نظام ناکام ہو گیا ہے، لہٰذا انہوں نے پاکستان بھر میں ہنگامی حالت کا اعلان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی عوام کے اعتماد سے محروم ہو چکی ہے اور اب اپنا فرض ادا نہیں کر سکتی۔

انتخابات کے انعقاد تک ملک کا نظم و نسق نو تشکیل شدہ کابینہ چلائے گی۔ (گورنر جنرل نے) وزیر اعظم سے کہا ہے کہ وہ دوبارہ کابینہ بنائیں تاکہ ملک کو ایک مضبوط اور مستحکم انتظامیہ فراہم کی جا سکے۔

1954ء کی سیاسی صورتِ حال پر وزیر اعظم بوگرہ کا بیان

یہ ایک پریشان کن صورت حال تھی ہماری معاشی کیفیت تشویش ناک تھی۔ ہمارے بنیادی خام مال پٹ سن اور کپاس کی قیمتیں بے حد گر گئی تھیں۔ ہمارے زرِ مبادلہ کی آمدنی جو زیادہ تر ان ہی دو اجناس سے حاصل ہوتی تھی، خطرناک حد تک کم ہو گئی تھی۔ جزوی طور پر اس کے نتیجے میں اور اسی طرح حکومت کی غلط معاشی پالیسیوں کے سبب ہمارے زرِ مبادلہ کی مد میں 1952ء کے برس میں 87 کروڑ روپے کا شدید خسارہ ہوا۔ عمومی معاشی کساد بازاری اور بدنظمی کے باعث ہماری داخلی مالی صورتِ حال بھی اچھی نہ تھی۔ ریونیو میں آئندہ برس ہمیں تیس کروڑ روپے کی حد تک کمی کا سامنا تھا، خوراک کی بھی شدید کمی تھی... ملک پر قحط کا خطرہ چھایا ہوا تھا۔

اس کے نتیجے میں وسیع تر بے چینی کا بول بالا تھا۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی بنا پر مزید ابتر ہو گئی کہ مغربی پاکستان میں شدید فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اور لاقانونیت کے مظاہرے ہوئے۔ پنجاب کے بعض حصوں میں صورتِ حال اس حد تک خراب ہو گئی تھی کہ لاہور پر مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1954ء میں اسمبلیوں کے برخاست ہونے پر وزیراعظم محمد علی بوگرہ کی نشری تقریر

وزیراعظم مسٹر محمد علی نے ریڈیو پاکستان سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جس قدر جلد ممکن ہو عوام کو نئی مجلسِ دستور ساز منتخب کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ آپ نے کہا کہ مجلس دستور ساز کی بعض کارروائیوں سے ملک کی اکثریت میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔

نئی کابینہ کے حلف اٹھانے کی رسم کے بعد تقریر کرتے ہوئے، وزیراعظم نے کہا، ''آئین سازی کا کام اہم ہے لیکن ملک کی سلامتی اور استحکام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ دستور ساز اسمبلی نہ صرف عوام کو متحد کرنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی بلکہ اس کی کارروائیوں کا اُلٹا اثر ہوا ہے۔''

مسٹر محمد علی نے کہا کہ گورنر جنرل کے خیال میں مجلسِ دستور ساز عوام کا اعتماد کھو چکی ہے۔ آخری اختیار عوام کو حاصل ہے اور عوام کو ہی تمام معاملات کا، جن میں آئین بھی شامل ہے۔ فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے جس قدر جلد ممکن ہو انتخابات کرائے جائیں گے۔ انتخابات تک ملک کا نظم ونسق چلانے کے لیے گورنر جنرل نے مجھے کابینہ بنانے کی دعوت دی جو میں نے منظور کر لی۔

مسٹر محمد علی نے کہا کہ ملک کی اکثریت کا یہ دعویٰ تھا کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کو چوں کہ عوام کا اعتماد حاصل نہیں، اس لیے وہ آئین بنانے کی مجاز نہیں۔ عوام کے لیے ایسے آئین کی ضرورت ہے، جو انہیں قابلِ قبول ہو۔ قابلِ قبول اور قابلِ عمل آئین بنانے کے لیے ملک میں اتحاد کی ضرورت ہے۔ وزیراعظم نے کہا، ''میرے دورۂ امریکہ پر روانگی کے بعد ملک کی صورتِ حال کے متعلق تکلیف دہ اطلاعات پہنچنی شروع ہوگئی تھیں اور میں گہری تشویش سے ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس اثنا میں مجلسِ دستور ساز کے اقتدار میں تیزی سے کمی آ گئی اور واپسی پر ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ گورنر جنرل کو وہ قدم اٹھانا پڑا جو اب میں نے اٹھایا ہے۔

ملک کا آئین تیار کرنے کا کام ایسی دستور ساز اسمبلی پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا جو داخلی کشمکش کا شکار ہو چکی ہے۔ آئین اہم مسئلہ ہے لیکن ملک کی سلامتی اور استحکام اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ذاتی، طبقاتی اور علاقائی کشمکش سے قومی اتحاد خطرے میں پڑ چکا تھا۔ پاکستان کے مفاد کو ہر بات پر مقدم رکھا جائے گا۔

وزیراعظم نے آخری میں عوام سے تعاون کی اپیل کی اور کہا کہ عوام کو نئے نمائندے منتخب کرنے کا موقع جلد دیا جائے گا تاکہ متحد اور ترقی پسند قوم کہلانے کا کام آگے بڑھ سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسکندر مرزا کا اعلانِ مارشل لاء

صدر مملکت کا ہنگامی فرمان

اعلامیہ جو 7 اکتوبر سنہ 1958ء کو صدر پاکستان نے جاری کیا۔

نمبر ایف 81 / پریز / 58 ,25 اکتوبر سنہ 1958ء، گزٹ مورخہ 31 اکتوبر سنہ 1958ء

حسب ذیل اعلان جو صدر نے 7 اکتوبر 958ء کی رات کو ساڑھے دس بجے جاری کیا، عام اطلاع کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

''پچھلے دو سال سے میں گہری تشویش کے ساتھ مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اقتدار کے لیے بے تحاشا رسہ کشی جاری ہے، بدعنوانیاں ہیں، سادہ، نیک و محب وطن اور محنتی عوام سے بے شرمی کے ساتھ ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، شائستگی کا فقدان ہے اور اسلام کو سیاسی مقاصد کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔ فقط چند قابل قدر لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن ایسے لوگ چوں کہ اقلیت میں ہیں اس لیے وہ ملک کے معاملات پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔

ان مذموم حرکتوں کا نتیجہ پست ترین درجے کی آمریت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اہلِ ہوس اور اہل غرض عوام کو نقصان پہنچا کر ناجائز فائدہ حاصل کرتے رہے اور اپنی بدکرداریوں کی بدولت اور زیادہ دولت مند ہوتے گئے۔

میری مسلسل کوششوں کے باوجود غذائی مسئلے کو حل کرنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی گئی۔ خوراک ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے، حالاں کہ ہمارے ملک کو درحقیقت خوراک میں خود کفیل ہونا چاہیے تھا۔ زراعت اور انتظام اراضی کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ نظام حکومت کے تحت کوئی سیاسی جماعت خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کے قابل نہ ہوگی۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں سمگلر بڑے منظم طریقے سے غلہ، ادویات اور دوسری ضروریات زندگی سرحد پار پہنچا رہے ہیں، اس بنا پر جو قلت پیدا ہوئی ہے اور قیمتوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اضافہ ہوا ہے، وہ عام لوگوں کی مصیبت کا باعث بن گیا ہے۔ غلے کی درآمد کی وجہ سے گزشتہ چند روز سے ہماری بیرونی زرمبادلہ کی کمائی پر مستقل اور شدید بار پڑ رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت نہایت ضروری ترقیاتی منصوبوں میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔

ہمارے کچھ سیاست دان چند دنوں سے خونی انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ہنگامہ پسند بیرونی ملکوں میں جا کر براہِ راست ان سے اتحادِ عمل کی پیشکش کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے جسے کھلی بغاوت ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

چند روز پہلے مشرقی پاکستان اسمبلی میں جو شرمناک مناظر دیکھنے میں آئے، ان سے سب آگاہ ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ اس قسم کی باتیں غیر منقسم بنگال میں اکثر ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو لیکن بہرصورت یہ کوئی مہذب طریق عمل نہیں ہے۔ اسپیکر کو زدوکوب کرنا، ڈپٹی اسپیکر کو قتل کرنا اور قومی پرچم کی توہین کرنا، ملک کے وقار کو بڑھانے کی صورتیں نہیں ہیں۔

سیاسی جماعتوں کی ذہنیت اتنی پست ہوگئی ہے کہ مجھے اس بات کا کوئی بھروسا نہیں رہا کہ انتخابات ملک کے موجودہ داخلی انتشار کو سدھار سکتے ہیں یا ان کے ذریعے ایک ایسی مضبوط اور مستحکم حکومت بنائی جا سکتی ہے، جو ان بے شمار پیچیدہ مسائل کو حل کر سکے جو ہمیں درپیش ہیں۔ آسمان سے نئے لوگ اتر کر نہ آئیں گے۔ وہی گروہ جس نے پاکستان کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے، انتخابات کو محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرے گا بلکہ یہ لوگ بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ دوبارہ برسرِ اقتدار آئیں گے، کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ انتخاب ذاتی، علاقائی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑا جائے گا۔ جب وہ انتخاب میں کامیاب ہو کر آئیں گے تو انہی طریقوں کو استعمال کریں گے جنہوں نے جمہوریت کو ایک ڈھونگ، ایک المناک تماشا بنا کر رکھ دیا ہے، اور جو دراصل ہر طرف پھیلی ہوئی حرماں زدگی کا باعث ہیں۔ بدلتی ہوئی وفاداریوں اور کرسیوں کے لیے مچی ہوئی افراتفری کے پیشِ نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ انتظامیہ خواہ کتنی بھی کوشش کرے انتخابات آزادانہ اور منصفانہ نہ ہوں گے۔ انتخابات ہماری مشکلات کو حل نہ کریں گے، اس کے برعکس زیادہ بددلی اور مشکلات پیدا کریں گے اور آخر ہمیں ایک خونریز انقلاب کی جانب لے جائیں گی۔ حال ہی میں کراچی کارپوریشن کے انتخابات ہوئے تھے۔ پورے حلقے سے صرف بیس فیصد ووٹ ڈالے گئے اور ان میں سے تقریباً پچاس فیصد ووٹ جعلی تھے۔

ہم ایک یونٹ توڑنے اور پرائیویٹ رضاکار تنظیموں کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں سول نافرمانی کی دھمکیاں سن رہے ہیں۔ ان انتشار پسند رجحانات سے ان لوگوں کی حب الوطنی کی قلعی کھل جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتی ہے کہ سیاست باز اور حالات سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے اپنے اپنے سنک دلانہ مقاصد کے حصول کے لیے کس حد تک بڑھ سکتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری خارجہ پالیسی پر غیر ذمہ دارانہ اور بلاسوچے سمجھے نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ حب الوطنی کے نظریے سے نہیں بلکہ محض ذاتی اغراض کے لیے اور وہی لوگ نکتہ چینی کرتے ہیں جو خود اس پالیسی کے ذمہ دار تھے۔ ہم تمام قوموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتے ہیں، لیکن سیاسی موقع پسندوں، متحدہ عرب جمہوریہ اور عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب کرنے اور غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھارت کے خلاف بے شک وہ جنگ کے نعرے بلند کرتے ہیں، مگر یہ جانتے ہوئے کہ خود کہیں میدانِ جنگ کے آس پاس نہ ہوں گے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی سیاسی جماعتیں خارجہ پالیسی کے ساتھ اس طرح کا مذاق نہیں کرتیں جیسے کہ پاکستان میں کیا جاتا رہا۔ اس خلجان کو دُور کرنے کے لیے میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ ہم اس خارجہ پالیسی پر عمل کریں گے جس کا ہمارا قومی مفاد اور جغرافیائی محل وقوع کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم اپنے تمام بین الاقوامی معاہدات پر کاربند رہیں گے جو بلاشبہ ہم نے پاکستان کی سلامتی کی خاطر کیے ہیں، وعلیٰ ہذا القیاس ایک امن پسند قوم کی حیثیت سے ہم اس آفات زدہ دنیا سے جنگ کا خطرہ دُور کرنے کے لیے اپنے مقدور بھر کوشش کرتے رہیں گے۔

گزشتہ تین برس سے میں جمہوری طریقوں سے دستور پر عمل درآمد کرانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی مخلوط حکومتوں کے قیام کے لیے کوشش کی، اس توقع میں کہ شاید نظم و نسق میں استواری پیدا ہو سکے اور ملک کی حکومت اس طرح چلے کہ عوام کو فائدہ پہنچے۔ مجھے رسوا کرنے والوں نے بدنیتی سے ہمیشہ ان تبدیلیوں کو محلاتی سازشوں کا نام دیا۔ سارا الزام صدر کے سر تھوپنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ کسی خوش طبع نے چند روز ہوئے کہا، ''اگر ملک میں بارش زیادہ ہو جائے تو یہ صدر کا قصور ہے اور اگر نہ ہو تو یہ بھی صدر کا قصور ہے۔'' اگر معاملہ صرف میرا ہی ہوتا تو میں ان ملامتوں کو برابر نظر انداز کیے جاتا اور ان کی مطلق پروا نہ کرتا، لیکن ان غداروں اور ملک دشمن عناصر کا مقصد صدر مملکت پر حملہ کر کے پاکستان اور حکومت کا وقار گرانا تھا۔ وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں اور اگر اس صورتِ حال کو برقرار رہنے دیا جائے تو وہ اپنے اصل مقصد میں بالآخر کامیاب ہو جائیں گے۔

داخلی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عوام کی اکثریت کا اعتبار موجودہ طرزِ حکومت پر سے بالکل اٹھ گیا ہے اور وہ روز بہ روز اس کی بابت زیادہ نا اُمید ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کو جس طرح جبر و استحصال کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس کی بنا پر ان میں خطرناک حد تک تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ سیاسی رہنماؤں نے ان کی خدمت کا حق ادا نہیں کیا، عوام نے ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کر سکے۔

آئین جو اتنی دشواریوں کے بعد 23 مارچ 1956ء کو نافذ کیا گیا تھا، ناقابل عمل ہے۔ اس میں مصالحتیں ہی مصالحتیں ملتی ہیں جو بڑی خطرناک ہیں اور اگر اس کی خرابیوں کو دُور نہ کیا گیا تو جلد ہی داخلی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر پاکستان کی جمعیت بکھر کر رہ جائے گی۔ ان حالات کو درست کرنے کی غرض سے پُرامن انقلاب کے ذریعے ملک کو ہوش مندی کی طرف لے جانے کی ضرورت ہے، اس کے بعد میرا ارادہ یہ ہے کہ بعض محب وطن افراد کو جمع کروں تا کہ وہ سیاسی شعبے میں ہمارے مسائل کا جائزہ لے کر ایک ایسا موزوں آئین مرتب کریں جو مسلم عوام کے مزاج کے مطابق ہو۔ جب یہ تیار ہو جائے گا تو اسے مناسب وقت پر عوام کے استصواب رائے کے لیے پیش کیا جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ آئین ایک مقدس چیز ہے۔ لیکن آئین اور ہر دوسری چیز سے زیادہ مقدس ملک اور اس کے عوام کی خوش حالی اور بہبود ہے۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے غدار اور عوام کے روبرو میرا اوّلین فریضہ پاکستان کی سالمیت ہے۔ اسے غداروں اور سیاسی زمانہ سازوں کی بے دردی سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ جن کی خود غرضی، ہوسِ اقتدار اور غیر محب وطن رویے کو روکنا موجودہ نظام کے تحت قائم ہونے والی حکومت سے ممکن ہے نہ ہی میں ملک کو تباہ کرنے کی کوششوں کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا گوارا کر سکتا ہوں۔ میں بڑے گہرے تفکر اور اضطراب کے بعد اس افسوس ناک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر میں نے پاکستان کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے ایسے اقدام نہ کیے جو موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں، تو میں اپنے فرض سے کوتاہی کروں گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے:

(الف) 23 مارچ 1956ء کا آئین منسوخ کر دیا جائے۔

(ب) مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو فوری طور پر برطرف کر دیا جائے۔

(ج) قومی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے۔

(د) تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا جائے۔

(و) جب تک متبادل انتظامات نہ ہوں پاکستان میں مارشل لاء نافذ رہے گا۔ میں جنرل محمد ایوب خاں، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کرتا ہوں اور پاکستان کی تمام افواج کو ان کی کمان میں دیتا ہوں۔

پاکستان کی بہادر افواج سے مجھے یہ کہنا ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت سے میرا ان سے گہرا رابطہ ہے، جس کے باعث میں ان کی وفاداری اور جذبۂ حب الوطنی کا معترف اور مداح ہوں۔ میں ان پر جو ذمے داری ڈال رہا ہوں۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے لیکن افواج کے افسرو اور جوانو! تمہاری ہی خدمت پر اس بات کا دارومدار ہے کہ پاکستان بحیثیت ایک آزاد قوم کے، برقرار رہے اور آزاد دنیا کے اس علاقے میں ایک مضبوط قلعے کی حیثیت سے قائم رہے۔ بلا خوف و خطر اور بلا رو رعایت اپنا فرض ادا کیجیے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

پاکستانی عوام سے میں ایک بھائی اور ہم وطن کی حیثیت سے مخاطب ہوں۔ موجودہ اقدام بڑے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افسوس کے ساتھ کیا جا رہا ہے، لیکن یہ مجھے ملک کے مفاد اور عوام کی خاطر کرنا پڑا، ایسے عوام جن سے ہم انسانوں کا تصور محال ہے۔ محب وطن اور قانون پسند لوگوں سے میں یہ کہوں گا کہ آپ آئندہ زیادہ آزاد اور خوش حال ہوں گے۔ سیاسی موقع پرستوں، سمگلروں، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کے لیے بُرا وقت ہوگا اور ان کی سرگرمیوں کو سختی سے دبایا جائے گا۔ جہاں تک غداروں کا تعلق ہے۔۔۔۔ ہو گا کہ موقع پائیں تو ملک سے بھاگ جائیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

5 جولائی کو ضیاالحق کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

خواتین وحضرات السلام علیکم!

میں آج اس عظیم ملک کی عظیم قوم سے خطاب کرنے کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا تہ ل سے شکر گزار ہوں۔ آپ کو یہ معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم ہو چکی ہے ور اس کی جگہ ایک عبوری حکومت قائم کی گئی ہے۔ یہ تبدیلی جو گزشتہ شب آدھی رات کو شروع ہوئی او آج علی الصبح ختم ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پُرامن طور پر خوش اسلوبی سے یہ تمام کارروائی میرے حکم پر عمل میں لائی گئی ہے۔

اس عرصہ میں وزیراعظم اور ان کے رفقا کو حفاظت میں لیا گیا ہے۔ اس طرح قومی اتحاد کے قائدین کو بھی حفاظت میں لیا ہے، سوائے بیگم ولی خان کے، اس اقدام پر اب تک موصول ہونے والے تاثرات حسب توقع نہایت حوصلہ افزا ہیں مختلف جگہوں سے مبارک بادوں کے پیغامات کی بھرمار لگ گئی ہے۔ میں اپنی قوم اور اپنی زندہ دل اور مومن افواج کا شکر گزار ہوں۔ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ معدودے چند حضرات نے خدشہ بھی ظاہر کیا ہے کہ کہیں یہ کارروائی کسی کے ایما پر تو نہیں کی گئی ہے۔ کہیں جنرل ضیا کی سابق وزیراعظم سے کوئی خفیہ ملی بھگت تو نہیں ہے۔ اس سے متعلق یہ عرض کروں گا کہ حقائق کبھی چھپے نہیں رہتے۔ پچھلے چند ماہ کے تجربے سے اتنی زیادہ بدگمانی ہوگئی ہے کہ اچھے بھلے لوگ بھی شک وشبہ میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

آج صبح آپ نے خبروں میں سن لیا ہوگا کہ افواج پاکستان نے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا ہے۔ مسا کر پاکستان کے لیے ملکی انتظام کو سنبھالنا کوئی مستحسن اقدام نہیں کیوں کہ افواج پاکستان دل سے چاہتی ہیں کہ ملک کی باگ ڈور اور عوام کے ہاتھوں میں ہو جو صحیح طور پر اس کے حق دار ہیں۔ عوام اپنا حق اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں جس کے لیے ہر جمہوری ملک میں وقتاً فوقتاً انتخابات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے عزیز ملک میں گزشتہ 7 مارچ کو انتخابات ہوئے جس کے نتائج کو ایک فریق نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انتخابات میں دھاندلی کے الزام نے جلد ہی دوبارہ انتخابات کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ اس مطالبے کو تسلیم کرانے کے لیے ایک تحریک چلائی گئی جس کے دوران یہ خیال آرائی بھی کی گئی کہ پاکستان کی بقا جمہوریت اور صرف جمہوریت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتعال انگیز حالات اور مختلف سیاسی دباؤ کے باوجود افواجِ پاکستان نے حالیہ ہنگاموں میں اقتدار سنبھالنے سے گریز کیا۔

افواجِ پاکستان کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ سیاسی بحران کا کوئی سیاسی حل تلاش کر لیا جائے اس مقصد کے پیشِ نظر افواجِ پاکستان نے حکومتِ وقت پر کئی بار زور دیا کہ وہ جلد از جلد مذاکرات کے ذریعہ اپنے سیاسی مخالفین سے کوئی تصفیہ کرے ان مذاکرات کے لیے وقت درکار تھا جو افواجِ پاکستان نے نظم و نسق برقرار رکھ کر مہیا کیا۔ بعض حلقوں میں فوج کے اس کردار پر نکتہ چینی بھی کی گئی لیکن ہم نے یہ سب کچھ اس اُمید پر برداشت کیا کہ یہ وقتی چیز ہے جب قوم اس ہیجانی کیفیت سے نکلے گی تو خود بخود افواجِ پاکستان کے صحیح اور آئینی کردار کے متعلق تمام شک و شبہات دُور ہو جائیں گے۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے ملک کو درپیش صورتِ حال کا اجمالی نقشہ پیش کیا جس سے آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ جب سیاست دان ملک کو بحران سے نکالنے میں ناکام رہیں تو افواجِ پاکستان کے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑی ہے۔ یہ اقدام صرف ملک کو بچانے کی خاطر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے فریقین میں آپس میں سمجھوتے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا، اس کی خاص وجہ آپس کی بے اعتمادی اور ایک دوسرے سے بدگمانی تھی۔ ان حالات میں اس بات کا خدشہ تھا کہ اس صورتِ حال کی وجہ سے ملک ایک بار پھر افراتفری اور سنگین تر بحران کا شکار ہو جائے گا۔ یہ خطرہ مول لینا قوم کے مفاد میں ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ یہ فوجی کارروائی عمل میں لانی پڑی ہے۔

اب مسٹر بھٹو کی حکومت ختم ہو گئی ہے۔ سارے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں۔ صوبائی گورنر اور وزیر خارجہ بنا دیے گئے ہیں۔ البتہ آئین کو منسوخ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے بعض حصوں پر عمل درآمد روک دیا گیا ہے اور اسی آئین کے تحت صدرِ مملکت چودھری فضل الٰہی حسبِ سابق اپنی ذمہ داریاں جاری رکھنے پر رضامند ہو گئے ہیں جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ وہ سربراہ مملکت کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اہم قومی مسائل کو حل کرنے میں ان کی مدد کے لیے ایک ملٹری کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ کونسل 4 افراد پر مشتمل ہو گی جس میں چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف اور بری، بحری اور ہوائی افواج کے چیف آف اسٹاف شامل ہوں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں چیف آف آرمی اسٹاف اور چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داریاں ادا کروں گا۔ حسب ضرورت مارشل لا آرڈرز اور احکام جاری کیے جائیں گے۔ آج صبح میں چیف جسٹس آف پاکستان جناب یعقوب علی سے بھی ملا۔ میں ان کے مشورے اور قانونی رہنمائی کے لیے از حد مشکور ہوں۔ میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ فوج ہی اپنے سپاہیانہ پیشے سے اُکھڑنا چاہتی ہے۔ مجھے صرف اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آنا پڑا ہے جو سیاست دانوں نے پیدا کیا ہے اور میں نے یہ چیلنج صرف اسلام کے ایک سپاہی کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کروانا ہے جو اس سال اکتوبر میں منعقد ہوں گے۔ انتخابات مکمل ہوتے ہی اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دوں گا اور میں لائحہ عمل سے ہرگز انحراف نہیں کروں گا۔ آئندہ تین مہینوں میں میری ساری توجہ انتخابات پر مرکوز ہوگی اور میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو دوسرے معاملات پر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

اس مرحلے پر ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ملک کی عدلیہ کے لیے میرے دل میں بہت احترام ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہو عدلیہ کے اختیارات محدود نہ ہوں۔ تاہم بعض ناگزیر حالات میں خصوصی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مارشل لاء آرڈرز اور مارشل لاء ریگولیشنز جاری کرنا ضروری ہوں گے ان کو کسی اور عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ نئے انتخابات کرانے کے لیے میں عن قریب مفصل ٹائم ٹیبل اور طریقۂ کار کا اعلان کروں گا اور مجھے توقع ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں اس کام میں مجھ سے تعاون کریں گی۔ حالیہ سیاسی محاذ آرائی سے ماحول میں کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اس لیے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وقت دینا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ آج سے تاحکم ثانی ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ انتخابات سے پہلے سیاسی سرگرمیاں بحال کر دی جائیں گی۔

میرے عزیز ہم وطنو!

میں نے دل کی بات کھول کر آپ کے سامنے بیان کر دی ہے میں نے آپ کو اپنے عزائم کے بارے میں اعتماد میں لے لیا ہے اب میں اس مشن کو حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور آپ سے مدد اور تعاون کا خواست گار ہوں۔ امید ہے کہ عدلیہ، انتظامیہ اور عام شہری میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ میری یہ کوشش ہوگی کہ مارشل لاء انتظامیہ نہ صرف سیاسی انصاف اور برابری کا برتاؤ کرے بلکہ عوام کو اس بات کا احساس بھی ہو۔ سول انتظامیہ کو اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کرنا ہوگا، لہٰذا میں یہ اعلان کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میری درخواست پر ہر صوبے کی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے قائم مقام گورنر بننا منظور کر لیا ہے۔ انتظامیہ میں اگر بعض افسروں کو اپنے مستقبل کے بارے میں خدشات ہوں تو میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ کسی کو بھی ناکردہ گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ اگر کسی سرکاری ملازم نے اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرائض میں کوتاہی برتی، جانب داری سے کام لیا یا ملک وقوم سے بے وفائی کی تو اس کی سخت سے سخت سزا ملے گی اسی طرح اگر کسی نے امن وامان میں خلل ڈالنے کی کوشش کی تو اس سے بھی سختی سے نمٹا جائے گا۔

بیرونی ممالک سے تعلقات کے بارے میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ حکومت نے جن ملکوں کے ساتھ جو معاہدے، وعدے اور سمجھوتے کیے ہیں، میں ان کا پابند رہوں گا۔ آخر میں میں بری، بحری، فضائی افواج کے تمام افسروں اور جوانوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے فرائض بجالاتے وقت مکمل غیر جانب داری اور انصاف سے کام لیں گے اور کسی سے غیر ضروری رعایت نہیں برتیں گے۔ میں ان سے یہ بھی توقع رکھوں گا کہ ماضی میں اگر کسی نے ان پر لعن طعن کی ہو تو اسے اسلامی روایات کے مطابق معاف کر دیں اور اپنے فرائض ادا کرتے وقت اپنے اور اپنے پیشے کے وقار کو پیش نظر رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے احسن طریقہ سے عہدہ برآ ہوں گے جس سے ان کے وقار اور مرتبے میں اور اضافہ ہوگا۔

چند ایک نکات کی تشریح ضروری سمجھتا ہوں:

1- سول عدالتیں اپنے فرائض معمول کے مطابق انجام دیتی رہیں گی۔

2- ایف ایس ایف کی عن قریب تنظیم نو کی جائے گی۔

3- حال ہی میں سول انتظامیہ میں جو تبادلے کیے گئے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے گا۔

4- عبوری حکومت کا ڈھانچا اس طرح تشکیل دیا گیا ہے:

ا: جناب صدر فضل الٰہی چودھری سربراہ مملکت ہوں گے۔

ب: ملک میں اہم انتظامی امور ملٹری کونسل ادا کرے گی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

ج: انتظامیہ کا سربراہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوگا۔

د: سیکریٹری جنرل ڈیفنس جناب غلام اسحاق تمام وفاقی محکموں میں رابطے کے ذمہ دار ہوں گے۔

ہ: وفاقی حکومت کے ہائی کورٹ کا چیف جسٹس اس صوبے کا قائم مقام گورنر ہوگا۔

ر: صوبے کی انتظامیہ کے سربراہ صوبے کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوں گے۔

میری خواہش ہے کہ

(1) انتظامیہ بلا خوف وخطر اپنے فرائض انجام دے۔

(2) پولیس میں بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔

(3) اخبارات آزادیٔ صحافت کے علمبردار ہوں مگر ضابطۂ اخلاق سے انحراف نہ کریں۔

(4) قوم میں ہوش مندی پیدا ہو۔

(5) ہر شخص کی جان ومال اور عزت محفوظ ہو۔

(6) ملک میں امن وامان قائم ہو اور غنڈہ گردی کا خاتمہ ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(7) درس گاہیں سیاسی اکھاڑہ نہ بنیں۔

آپ کی اطلاع کے لیے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرحدیں محفوظ ہیں اور مسلح افواج اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اور سرحدیں جائز نقل و حرکت کے لیے کھلی ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالیہ تحریک میں اسلام کا جو جذبہ دیکھنے میں آیا ہے، وہ قابل تحسین ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستان جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا وہ اسلام کے نام پر ہمیشہ قائم رہے گا جس کے لیے اسلامی نظام اشد ضروری ہے۔

پاکستان پائندہ باد

29 مئی 1988ء کو اسمبلیاں توڑنے کے صدارتی حکم کا متن

''جن اغراض و مقاصد کے تحت قومی اسمبلی منتخب ہوئی تھی وہ پورے نہیں ہوئے۔ ملک میں امن و امان کی صورت حال اس حد تک گمبھیر ہوگئی ہے کہ جس کے نتیجے میں ان گنت گراں قدر قیمتی جانوں کا ناک اتلاف اور املاک کا نقصان ہوا ہے۔ پاکستان کے شہریوں کی جان و مال، عزت اسلامتی قطعی غیر محفوظ ہوگئی ہے۔ نظریہ پاکستان اور اس کی یکجہتی کو سنگین خطرہ لاحق ہوگیا ہے اور جہاں عوام کی اخلاقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عوامی حلقے اسے سیاسی روش کا نام دیتے۔ لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اسی طرح صوبائی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، آڈیٹر جنرل پاکستان کی رپورٹوں میں بھی سرکاری محکموں میں پائی جانے والی سنگین بدعنوانیوں اور قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی چند انکشافات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

(1) پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے 50 ارب روپے کے خورد برد کا انکشاف کیا۔ اس میں اہم ذمہ دار کردار محکمہ خوراک اور ہائی ویز کا تھا۔

(2) وفاقی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے مطابق ملک کے سرکاری محکموں میں ہر سال 40 ارب روپے کا گھپلا ہوتا ہے۔

(3) ایک سرکاری دستاویز کے حوالے سے سالانہ ایک کھرب روپے کے ٹیکس چوری ہوتے ہیں۔

(4) 83 ارب روپے کے قرضوں کی مختلف وجوہ کی وجہ سے عدم ادائیگی۔

(5) جعلی سرمایہ کار کمپنیوں کا قیام اور ایک ارب روپے کا فراڈ۔

(6) ری بیٹ کی مد اور مینکوں میں کروڑوں روپے کا فراڈ۔

(7) خشک دودھ کی درآمد میں چالیس لاکھ روپے کا فراڈ۔

(8) پنجاب کے 17 محکموں میں 8 کروڑ 63 لاکھ روپے کا فراڈ۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(9) ریلوے کو سالانہ 4 ارب روپے کا خسارہ (23 ہزار ویگنوں میں سے صرف تین ہزار چل رہی ہیں)۔

(10) افراط زر کی وجہ سے مئی کے اوائل میں زیر گردش نوٹوں کی تعداد میں ایک ارب 17 کروڑ روپے کا اضافہ ہوا۔

(11) بعض اقتصادی ماہرین کے مطابق اس سال بجٹ کا خسارہ 83 ارب روپے تک پہنچ جائے گا۔

(12) ٹیکس چوروں اور ہیروئن کے اسمگلروں کے پاس ایک کھرب 22 ارب روپے کا انکشاف۔

(13) پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی اس رپورٹ کے باوجود کہ متعدد وفاقی وزارتیں قومی خزانے پر بوجھ ہیں تقریباً تین ہفتہ قبل نئے وزرا اور وزرائے مملکت کا تقرر کیا گیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قوم سے خطاب ...... غلام اسحاق خان

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان، اسلام آباد۔ 6 اگست 1990ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم!

مجھے یقین ہے کہ اب تک آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہوگی کہ میں نے آئین کے آرٹیکل 58 شق (2) (ب) کے تحت اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک صدارتی حکم کے ذریعے قومی اسمبلی توڑ دی ہے جس کے نتیجے میں وزیراعظم اور ان کی کابینہ اپنے عہدوں پر برقرار نہیں ہے۔

آج جاری ہونے والے اس حکم نامے میں آئین، قانون اور مسلمہ جمہوری روایت کے منافی ان افسوسناک سرگرمیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے نتیجے میں ایک منتخب ادارے کی حیثیت سے قومی اسمبلی کی افادیت ختم ہوگئی تھی اور وہ عوامی اعتماد سے محروم ہو چکی تھی۔ حکم نامے میں سیاسی وفاداریوں کی کھلے بندوں اور لگاتار خرید و فروخت کے ذریعے انتخابی مینڈیٹ میں خورد برد کے قابل مذمت طرزِ عمل کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور آئین کی خلاف ورزی کے ان متعدد واقعات کی نشاندہی بھی جو مرکز اور صوبوں کے باہمی تعلقات، صوبائی خود مختاری کے دائرہ کار پر دست اندازی، سینٹ کے کردار، اعلیٰ عدالتوں کے احترام، حکومت کی انتظامی مشینری کے استعمال اور اسی طرح کے چند اور امور کے سلسلے میں مسلسل پیش آتے رہے۔ انتہائی وسیع پیمانے پر قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ بدعنوانیوں کی شرمناک وارداتوں اور سندھ میں امن وامان کی صورت حال کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وفاقی حکومت آئینی تقاضوں کے مطابق نہ چلائی جا رہی تھی اور نہ چلائی جا سکتی ہے اور رائے دہندگان سے دوبارہ رجوع کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ قومی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسمبلی توڑی جاتی ہے۔

میں نے یہ فیصلہ اپنے حلف کی پاسداری اور اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے کی خاطر کیا جو آئین کی رُو سے وفاق پاکستان کے اتحاد کی علامت اور آئین پاکستان کے محافظ کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ فیصلہ میں نے مکمل طور پر غیر جذباتی غور وفکر کے بعد اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اصلاحِ احوال کی دیگر تمام کوششوں کے صبر آزما انتظار کے باوجود بے نتیجہ ثابت ہونے پر اس یقین کے ساتھ کیا ہے کہ یہ فیصلہ پاکستان کے کروڑوں بے زبان عوام کی سوچ، خواہشوں اور امنگوں کے عین مطابق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس فیصلے سے اگر ایک طرف عوام کی اس شدید خواہش کی تکمیل ہوئی ہے کہ چند مفاد پرست، خودغرض، ناقابل اصلاح افراد کو دس کروڑ عوام کی قسمت اور اس ملک کی تقدیر سے کھیلنے کی کھلی چھٹی نہ دی جائے تو دوسری طرف اس فیصلے سے جمہوریت کے اس بنیادی اصول کی عملاً توثیق بھی ہوئی ہے کہ ملک کے اصل حکمران عوام ہیں اور عوام ہی رہیں گے اور یہ کہ وہ جب چاہیں حکمرانی کا وہ حق واپس لے سکتے ہیں جو منتخب نمائندوں کو محض امانت کے طور پر، اور امانت کی پاسداری کی شرط پر سونپا جاتا ہے۔

چنانچہ مجھے اس بات میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ یہ فیصلہ ملک وقوم اور جمہوریت کے بہترین مفاد میں ہے۔ مجھے اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ اس فیصلے کی تائید وحمایت ہر وہ شخص کرے گا جو ملکی سالمیت کو سیاست اور آئینی تقاضوں کو مصلحتوں سے مقدم اور محترم جانتا ہے، جو اس ملک کا درد رکھتا ہے، جو جمہوریت کو ..... حقیقی اور صاف ستھری جمہوریت کو ..... پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے، جو سمجھتا ہے کہ چند افراد کی نااہلی اور نادانیوں کی سزا پوری قوم کو نہیں دی جانی چاہیے، جس کا عقیدہ ہے کہ قوم کو اس کا یہ حق ضرور دیا جانا چاہیے کہ ان لوگوں کا محاسبہ کرے، جنہوں نے اس کے اعتماد کی دھجیاں اڑائیں اور اس کی توقعات کو، اس کی اُمیدوں کو روند ڈالا۔

جمہوریت میں عوام کی اُمیدیں اور توقعات ہی منتخب نمائندوں کی رہبر ورہنما ہوتی ہیں اور ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سال پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے اپنے خطاب میں کہا تھا، ''ایک ترقی پذیر ملک میں عوام محض اس لیے جمہوریت کے گرویدہ نہیں ہوتے کہ وہ ایک خوب صورت تصور ہے۔ عام آدمی جمہوریت کی فلسفیانہ قدر وقیمت یا نظریاتی حسن سے زیادہ جمہوریت کی عملی افادیت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ جمہوریت سے اس کی وابستگی اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کا تحفظ ہوگا۔ اسے عزتِ نفس کے ساتھ انصاف نصیب ہوگا، ترقی کے موقع میسر آئیں گے اور اس کے مسائل کو اس کی شرکت سے حل کیا جائے گا۔''

ملک میں بحالی جمہوریت کے بعد پاکستان کے عوام بجا طور پر ایسی ہی توقعات رکھتے تھے۔ وہ امن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

. مان، ہم آہنگی، انصاف اور مساوات کے ایک نئے دور کے آرزو مند اور مسائل کے فوری حل اور کسی امتیاز کے بغیر اہلیت کی بنیاد پر ترقی و خوش حالی کے یکساں مواقع کے منتظر تھے۔ مگر انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ ان کے نمائندوں کی کج روی اور بے عملی نے ان کے ابتدائی جوش و خروش پر پانی پھیر دیا۔

میں نے اپنی اس تقریر میں عوامی جذبات کی ترجمان کی کوشش کی تھی اور ان حالات کی نشاندہی بھی ... قوم کے لیے ذہنی کرب اور اضطراب کا باعث بن رہے تھے۔ میں نے عوامی نمائندوں کو یاد دلایا تھا کہ عوام ان کے درمیان قانون اور آئین کے تقاضوں کے مطابق باہمی مفادات، اشتراک عمل اور صحت مند ... ان کی فضا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے اور رواداری کے جذبے کا مظاہرہ کیا جائے۔ میں نے دیانت دارانہ سیاست پر زور دیا تھا۔ میں نے گزارش کی تھی کہ دوسروں سے ... برتاؤ رکھا جائے جس کی توقع ہم اپنے لیے ان سے کرتے ہیں۔ میری التجا تھی کہ تنقید کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور مخالفت برائے مخالفت سے احتراز کیا جائے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا ... اختیارات کے روایتی ارتکاز کی بجائے ان کی مناسب تفویض کا اہتمام کیا جائے تاکہ آئین میں مرکز ... صوبوں کی ذمہ داریوں جو تعین کیا گیا ہے اور مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے اختیارات کے مابین جو ... فاصل مقرر کی گئی ہے، اس کا احترام ہو سکے۔ میں نے وفاق کے اتحاد اور جمہوری عمل میں تسلسل کے ... سینٹ کے تعمیری کردار کی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور قانون سازی کی بھاری ذمہ داریوں کی طرف ... مبذول کروائی تھی۔ میں نے ملک کے اسلامی تشخص کی بقا اور فلاح کے لیے اسلام سے مکمل وابستگی پر ... ر دیا تھا، میں نے عوامی نمائندوں کو ان کی اس وقت تک کی غیر تسلی بخش کارکردگی کا آئینہ دکھانے کی ... شش بھی کی تھی۔

مجھے امید تھی ...... اور یقیناً قوم کو بھی ہوگی ...... کہ عوام کی امنگوں، خود اپنے انتخابی وعدوں ... اپنی کارگزاری میں تضاد کے بے لاگ جائزے کے نتیجے میں منتخب افراد حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ... ئے اپنی اصلاح آپ کرنے کے مثبت اور دلیرانہ عمل کی ابتدا کریں گے مگر افسوس کہ میری گزارشات ... صدا بہ صحرا ثابت ہوئیں۔ مجھ سے زیادہ آپ اس بات سے واقف ہیں کہ حالات کس طرح بد سے بدتر ... تے چلے گئے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس طرح سیاسی محاذ آرائی کو مستقل وطیرہ اور عدم ... مت کو مروجہ طریقہ کار بنایا گیا، کس طرح حقیقتوں سے فرار کی پالیسی اپنائی گئی، کس طرح ضروری فیصلوں سے احتراز کیا گیا، کس طرح آئینی اور انتظامی اداروں کو مفلوج کر دیا گیا اور ان حالات کے نتیجے ... کس طرح قوم خانوں میں بٹتی چلی گئی اور کس طرح قومی دولت لوٹی جاتی رہی۔

میں جن حالات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، آپ میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حد تک ان کا عینی شاہد ... ہے اور گواہ بھی۔ آپ میں سے کس نے عوام کے دیئے ہوئے مینڈیٹ کے تقدس کی پامالی اور اسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنس تجارت بنانے کے شرمناک واقعات نہیں دیکھے؟ سیاسی سٹاک ایکسچینج کھولے گئے اور سیاسی وفاداریاں کھلی منڈی میں مویشیوں کی طرح بیچی اور خریدی گئیں۔ وزیراعظم کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے وقت تو تحریک کی مخالفت اور تحریک کے لیے حمایت حاصل کرنے کی مہم میں ایسے غیر اخلاقی اور غیر قانونی حربے استعمال کیے گئے کہ ہماری قومی اسمبلی دنیا بھر میں مذاق کا نشانہ بنی۔ ممبران اسمبلی ایک طرح سے یرغمال بن کر حبس بے جا میں رہے اور لالچ اور دھمکیوں کے زور پر انہیں اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے سے روکا گیا۔ بقول کسی کے، کوئی وزارت کے ترازو میں تل کر بکا، کسی نے ضمیر کا سودا زمین کے بدلے طے کیا، کسی نے قرضوں کے عوض اور کسی نے وعدہ فردا کے لالچ میں سیاسی وفاداری گروی رکھ دی۔ جنہوں نے ظاہراً وفاداری میں شرط استواری برقرار رکھی، انہوں نے بھی ترک تعلق کی دھمکیوں کے بل پر اپنی قیمت وصول کی۔ گویا سیاست کو سوداگری سمجھنے والوں نے وقت کی ہر کروٹ سے ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر اٹھائے جانے والے حلف کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے یا یہ عوام نے جماعتی بنیادوں پر ہونے والے انتخابات میں اسے جس جماعت کے نظریے کی ترجمانی کے لیے اسمبلی میں بھیجا گیا تھا، اس سے انہیں رجوع کے بغیر انحراف کا کوئی حق نہیں۔ ایسا کرنا اپنے ووٹروں سے غداری اور امانت میں خیانت کے مترادف ہے جو روز سزا و جزا کے مالک کے نزدیک ظلم عظیم ہے۔ اس طرز عمل سے بعض ستم ظریفوں کو یہ تک کہنے کا موقع ملا کہ دو ڈھائی سو کروڑ کے عوض پاکستان کی پوری قومی اسمبلی کی بولی لگائی جا سکتی ہے۔

یہی نہیں، قول و عمل کے اور بھی کئی انداز ایسے تھے جن کے ذریعے پارلیمنٹ کے وقار کو بری طرح مجروح کیا گیا۔ پارلیمنٹ جمہوری نظام میں محوری حیثیت رکھتی ہے۔ اسے اہم قومی مسائل کے حل اور معاشرے میں صحت مند تبدیلیوں کا سرچشمہ بنایا جانا چاہیے تھا مگر حد درجہ ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اسے فروعی معاملات میں الجھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ قانون سازی جیسے بنیادی کام تک میں سنجیدگی سے دلچسپی نہیں لی گئی۔ ماسوائے بجٹ، کوئی قابل ذکر بل اسمبلی میں پاس تو کجا پیش تک نہیں کیا گیا۔ بیشتر معاملات پرانے آرڈیننسوں کے ازسرنو اجراء کے ذریعے چلائے جاتے رہے اور اکثر وقت تحاریک التوا اور تحاریک استحقاق کی نذر ہوتا رہا۔ اسٹینڈنگ کمیٹیاں پارلیمانی نظام کی جان سمجھی جاتی ہیں، لیکن ان کی تکمیل میں 19 ماہ تک لیت و لعل سے کام لیا گیا۔ اکثر وزراء اسمبلی میں بیٹھنے تک کے روادار نہ تھے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ معزز ایوان میں بار بار غلط بیانی اور حقائق پوشی سے کام لیا گیا۔ عدم دلچسپی یا سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اسمبلی کے فرسودہ قواعد کو آئین کے مطابق ڈھالنے کے لیے ضروری ترامیم کی مزاحمت بھی گوارا نہ کی گئی اور یوں رفتہ رفتہ قومی اسمبلی اپنی افادیت کھو بیٹھی۔

دوسری طرف پارلیمنٹ کے ایوان بالا سینٹ ... کے وقار کو زک پہنچانے اور اس کی حیثیت و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزع بنانے کی شعوری کوششیں کی جاتی رہیں۔ سینٹ وفاق پاکستان کے اتحاد کی مظہر ہے۔ وہ چاروں صوبوں کی مساویانہ حیثیت کی علمبردار اور عوامی نمائندگی میں تسلسل کا وسیلہ ہے۔ ساری جمہوری دنیا میں پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کو ایک خاص امتیازی مقام دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوا کہ اس انتہائی اہم اور وقار ادارے کے قانونی جواز تک کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا، اس پر تنقید جاری رکھی گئی اور اس کے تعلق انتہائی عامیانہ انداز میں ہرزہ سرائی کی جاتی رہی اور اس طرح آئین کے تحت وجود میں آنے والے اس ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچایا جاتا رہا۔

مملکت کے دیگر آئینی ادارے بھی سیاسی دیوالیہ پن کے اثرات سے محفوظ نہ رہے۔ ایک طرف اعلیٰ عدالتوں جیسے محترم ادارے کا مذاق اڑایا گیا اور اس کے فیصلوں کی غیر جانب داری اور موزونیت پر تعلم انگشت نمائی کی گئی، تو دوسری طرف ضابطے کے مطابق کارروائی کے بغیر ہزاروں قیدیوں کو سیاسی وابستگیوں کے نام پر جیلوں سے رہا کر کے، یا ان کی سزاؤں میں تخفیف کر کے انصاف کے تقاضوں کو پامال کیا گیا۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی یقیناً ایک مستحسن اقدام تھا مگر یوں رہا کیے جانے والوں میں قانونی و اخلاقی مجرم بھی شامل تھے، جو عدالتوں سے باقاعدہ سزایافتہ تھے۔ ان کے خلاف الزامات کی چھان بین کی گئی اور نہ مقدمات کی تفصیل اور حقائق دیکھے گئے۔ سستی شہرت کی خواہش کے تحت قتل، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان جیسے بہیمانہ جرائم کو معاف کر کے عدل وانصاف کی دھجیاں بکھیری گئیں۔

الیکشن کمیشن بھی عدم توجہی کا شکار رہا اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ممبران کی خالی نشستوں کو پُر نہیں کیا گیا۔ نتیجتاً الیکشن کمیشن متعدد ایسی عذرداریوں اور فلور کراسنگ کے مقدمات کی سماعت سے قاصر رہا جن سے اسمبلیوں کی پارٹی پوزیشن میں فرق پڑ سکتا تھا۔

سول سروسز انتظامیہ میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا نظام بھی آئین کے تحت قائم کردہ دیگر آئینی اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی سیاسی مصلحتوں اور من مانیوں کا شکار ہوا اور ایسی بے راہ روی کا نشانہ بنایا گیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تقرریاں اور ترقیاں ذاتی پسند و ناپسند اور شخصی التفات و عناد کا کھیل بن گئیں۔ وزیراعظم سیکرٹریٹ میں پلیس منٹ بیورو کے نام سے ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے ذریعے سیاسی بنیادوں پر تقریباً 215 ہزار افراد کو سرکاری ملازمتوں سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں نہ مروجہ ضابطوں کا خیال رکھا گیا اور نہ قابلیت، تجربہ، عمر اور کوٹے کی پابندیوں کا لحاظ۔ یہاں تک کہ قانونی طور پر نااہل قرار دیئے جانے والوں تک کو، بلا کسی اضافی جواز کے، سرکاری آسامیوں کا اہل سمجھا گیا اور اس طرح نہ صرف یہ کہ جائز حق داروں کا حق مارا گیا بلکہ انتظامیہ میں مستقل بنیادوں پر اپنے کاسہ لیسوں اور وفاداروں کی کھیپ بھرتی کی گئی۔

علاوہ ازیں، سرکاری ملازمتوں سے نکالے گئے افراد اور عوام کے ٹھکرائے ہوئے عناصر پر مشتمل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشیروں، معاونین خصوصی OSDs کی ایک اچھی خاصی فوج بھرتی کی گئی جو حکمرانوں کے مصاحبین خاص کا درجہ رکھتے تھے اور اپنے آپ کو ہر طرح کی انضباطی پابندیوں اور مروجہ رولز اینڈ ریگولیشنز سے آزاد سمجھتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں میں دندناتے پھرتے تھے۔ جب ان کی تقرری اور طرز عمل پر عوامی تنقید میں شدت آ گئی تو ان کے استعفے منظور کر کے انہیں صدر کے حکم کے مطابق باقاعدہ طور پر عہدوں سے فارغ کر دیا گیا مگر شان خسروی دیکھیے کہ اس کے باوجود انہیں بدستور تمام تر سرکاری مراعات اور لوازمات کے استعمال کی اجازت عطا کی گئی۔

یہ تمام اقدامات صریحاً آئین اور قانون کے خلاف تھے۔

جو سرکاری اہل کاران حالات پر معترض ہوئے یا اس التزام میں کھپ نہ سکے، راندۂ درگاہ قرار دے کر ادھر اُدھر کر دیئے گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حکومت کے اپنے کہنے کے مطابق ان افسروں کی تعداد 59 ہوئی، جب کہ اخبارات کا کہنا تھا کہ ان کی تعداد سو سے تجاوز کر گئی تھی۔ ان افسران کو کہا تو جاتا تھا ''افسران بہ کار خاص''، لیکن ان کا خاص کام صرف یہ تھا کہ بغیر کوئی کام کیے، گھر بیٹھے تنخواہ لیتے رہیں، یہ نہ صرف قومی خزانے پر ظلم تھا بلکہ ان سے سول سروسز کی عزتِ نفس، مستعدی اور کارکردگی بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ملک کا انتظامی ڈھانچا اپنے تفویض شدہ فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت اور دلچسپی کھو بیٹھا۔

ارباب بست وکشاد آئینی تقاضوں کی پاسداری میں وفاقی نظام کو خوش اسلوبی سے چلانے میں بھی ناکام رہے۔ مرکز اور صوبوں کی باہمی آویزشوں، تعلقات میں کشیدگی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں نے وہ زور پکڑا کہ سازش کی حدوں کو چھونے لگیں۔ صوبوں سے تصادم پر اس طرح پوری توجہ اور ساری توانائی مرکوز کر دی گئی کہ حکمرانوں کا بیشتر وقت سیاسی دنگلوں اور داؤ پیچ میں صرف ہونے لگا۔ قانون نافذ کرنے والی اور حساس ایجنسیوں سے لے کر ذرائع ابلاغ تک، پوری سرکاری مشینری پارٹی کے مفادات کو پروان چڑھانے، مخالفوں کو زک پہنچانے اور حریفوں کی کردار کشی کے لیے بلا جھجک اور بلا روک ٹوک وقف کر دی گئی۔

محاذ آرائی کی بنیادی وجہ صرف اتنی تھی کہ بلاشرکت غیرے اقتدار کی خواہش میں عوام کے دیے ہوئے انتخابی مینڈیٹ کو کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا گیا اور اسے جوڑ توڑ اور سازشوں کے ذریعے تبدیل کرنے کی راہ اپنائی گئی۔ یہ غلط روش مرکز اور صوبوں کے درمیان تصادم پر بھی منتج ہوئی اور لاتعداد غلط فیصلوں جمہوری روایات سے انحراف اور سیاسی بلیک میلنگ کے نت نئے طریقوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا جو دستور کے مطابق، بات چیت کے ذریعے، لو اور دو کے اصول پر طے نہ ہو سکتا تھا۔ ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ خلوص نیت اور سنجیدگی سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے کوشش کی جاتی۔ کچھ نیم دلانہ کوششیں ہوئیں بھی مگر کچھ تو سیاسی مصلحت کوشی کے سبب اور کچھ انا پرستی اور ہٹ دھرمی کے باعث ان کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو پائے۔

آئین میں صوبائی خودمختاری کو یقینی بنانے کے لیے کونسل آف کامن انٹرسٹ تجویز کی گئی۔ مگر صوبوں کے مسلسل اصرار کے باوجود اس کا اجلاس طلب کرنے سے گریز کیا گیا اور اجلاس کے انعقاد کو ملک کی تباہی کے مترادف گردانا گیا۔ اسی طرح صوبوں کے درمیان قومی وسائل کی تقسیم کے لیے آئین میں نیشنل فنانس کمیشن تجویز کیا گیا۔ مگر اس بات کو جواز بنا کر کہ اس ادارے کی تشکیل نو کی جارہی ہے، اس کا اجلاس بلانے سے گریز کیا جاتا رہا۔ تشکیل نو کی منظوری جولائی 1989ء میں دی جا چکی تھی۔ نو تشکیل شدہ کمیشن کو معرض وجود میں لانے کے لیے محض ایک نوٹیفکیشن جاری کرنے کی ضرورت تھی مگر اس کام میں دانستہ ایک سال سے زیادہ کی تاخیر کی گئی۔

آئین میں تجویز کردہ ان دونوں اداروں کو کام کرنے کا موقع دینا کسی کی مرضی و منشا کا معاملہ نہ تھا بلکہ ایک آئینی پابندی تھی جس کا پورا کیا جانا لازم تھا۔ اس سے اغماض برت کر آئین کی خلاف ورزی کی گئی اور نتیجتاً صوبوں میں یہ تاثر عام ہونے لگا کہ انہیں ان کے حقوق سے اور قومی وسائل میں ان کے جائز حصے سے دانستہ محروم رکھا جارہا ہے۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور ان کے الگ الگ دائرہ ہائے کار کا تعین بھی آئین میں بڑی صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے مگر اس معاملے میں بھی من مانی کرنے کی بے جا ضد سے کام لیا گیا۔ اگر صوبوں نے اپنے آئینی اختیارات کو بروئے کار لانے کی بات کی تو اسے بغاوت سے موسوم کیا گیا۔ دوسری طرف ایسے منصوبوں کے مرکزی کنٹرول پر اصرار کیا گیا جو صوبوں کے دائرہ کار میں آتے تھے۔ پیپلز ورکس پروگرام اس دوہرے طرز عمل کی بدترین مثال ہے۔

پانچ ارب روپے کی خطیر رقم سے چلائے جانے والے پیپلز پروگرام کے لیے فنڈ مختص کرنے اور رقم کی ادائیگی اور حسابات کی جانچ پڑتال کے معاملے میں مسلمہ مالیاتی قواعد وضوابط سے لاپرواہی برتتے ہوئے ایک ترقیاتی منصوبے کو سیاسی رشوت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ پروگرام بنیادی طور پر مقامی ترقیاتی پروگرام تھا اور اس کے لیے جو شعبے منتخب کیے گئے تھے وہ صوبوں کے دائرہ اختیار میں آتے تھے۔ چنانچہ ضروری تھا کہ اس کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد میں صوبوں کو شریک کیا جاتا اور ان کی سفارشات اور ترجیحات کو اہمیت دی جاتی مگر محض پروگرام سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی خواہش کے تحت ایسا کرنے سے پہلو تہی کی جاتی رہی۔

صوبوں کے ساتھ محاذ آرائی اور صوبائی خودمختاری میں بے جا مداخلت کی وجہ سے یہ تاثر ابھرنے لگا کہ موجودہ نظام وفاقی اکائیوں کے مفادات کی نگہداشت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور جب کسی نظام کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناکامی کا احساس عام ہونے لگے تو لوگ متبادل صورتیں ڈھونڈنے لگتے ہیں اور اس کوشش میں اکثر صوبائیت، علاقائیت اور مقامی وفاداریوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس میں تشویش کی بات یہ ہوتی ہے کہ پھر مرکز سے ان کے تعلقات میں تشنی کا عنصر غالب آ جاتا ہے اور وہ اپنے حقوق کے لیے مرکز سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا اب وقت نہیں آ گیا کہ ہم آئین میں دی گئی صوبائی خودمختاری کے احترام کے زبانی کلامی دعوؤں کے بجائے اسے عملی شکل دینے کا اہتمام کریں؟ ہمیں بدلتے وقت کے مثبت تقاضوں ساتھ دیتے ہوئے صوبوں کے احساسِ محرومی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی طرف بامعنی پیش رفت کرنی چاہیے تاکہ وفاقی رشتوں کو استحکام اور ایک قومیت کے جذبے کو فروغ دیا جا سکے۔ ہمیں عملاً ایسی پالیسیوں سے اجتناب کرنا چاہیے جو وفاق کی سالمیت کے لیے خطرہ بنتی جا رہی ہیں۔

ملک میں جمہوریت کی بحالی کے بعد یہ توقع کی جاتی تھی کہ آبادی کے مختلف طبقوں کے مابین منافرت اور نفاق کی خلیج پاٹ دی جائے گی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ جب اقتدار میں آنے والی سیاسی جماعتیں یہ بات ذہن نشین کر لیتیں کہ اب وہ صرف اپنے جماعتی طبقوں کی نمائندہ نہیں رہیں۔ انہیں اپنے سیاسی منشور کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنوں اور غیروں کی تخصیص ختم کر دینی چاہیے اور سب کو قومی انتظامی معاملات میں ایک نظر سے دیکھنے کی روایت اپنانی چاہیے مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ وہ جماعتی سوچ سے بلند ہو کر غیر جانب دار طرزِ عمل اپنانے اور وسیع القلبی سے کام لینے میں ناکام رہیں۔ ان کی نظر میں کچھ انسانوں کا جان و مال محترم ٹھہرا اور کچھ کی نہ زندگی کی وقعت رہی نہ گھر بار کی، حالاں کہ ہر انسان کا خون یکساں محترم اور ہر چار دیواری کی حرمت ایک جیسی ہے۔ زمین پر بہنے والے خون کو نسلی وابستگی کی بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، نہ ہی جلتے ہوئے گھروں سے اٹھنے والے دھوئیں کو سیاسی وفاداریوں کے خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ اس آفاقی حقیقت کو فراموش کر دینے کے نتیجے میں ابتدائی توقعات کے برخلاف نفرتیں بڑھ گئیں، معاشرتی ہم آہنگی کے تار و پود بکھر گئے اور شہریوں کی زندگی میں تشدد کا زہر اور ذہنوں میں خوف کے سائے پھیل گئے۔

صوبہ سندھ کبھی امن کا گہوارہ تھا، سندھ جس کے راستے برصغیر میں اسلام کا امن و آشتی اور محبت و اخوت کا لافانی پیغام داخل ہوا تھا، سندھ جس نے قیامِ پاکستان کے بعد لاکھوں بے خانماں انسانوں کے لیے اپنی بانہیں وا کی تھیں، اسی سندھ کی پاکیزہ فضاؤں پر لاقانونیت اور بدامنی کا آسیب چھا گیا جس کا کوئی علاج جمہوری حکومت نہ کر سکی۔

قتل، اغوا، ڈکیتی، آتش زنی اور لوٹ مار کی لرزہ خیز وارداتیں روز کا معمول بن گئیں۔ گلی کوچے میدانِ کارزار اور گھر تو کیا تعلیمی ادارے تک اسلحہ خانوں میں بدل گئے۔ میں نے امن و امان کی بگڑتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نئی صورتِ حال کی طرف اسمبلی اور حکومت کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے اپنے خطاب میں کہا تھا:

''آج ملک کے بعض حصوں میں بدقسمتی سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے جس میں شہریوں کی جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں، تاوان کی خاطر کام کرنے کے آئینی حق سے محروم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ علیحدگی پسند اور دہشت گرد ملک کے استحکام، سلامتی اور موجودہ جغرافیائی تشکیل کو چیلنج کر رہے ہیں۔''

گزشتہ آٹھ ماہ کے دوران ان حالات کی سنگینی میں آئے روز اضافہ ہوتا چلا گیا اور انتظامیہ اور قانون کے محافظ سیاسی دباؤ کے سامنے بے دست و پا ثابت ہوئے۔ وہ نہ کسی کو تحفظ دے سکے نہ کسی کو انصاف۔

حکومت کی اپنی ایجنسیوں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق صرف اس سال یعنی جمہوری حکومت کو ذمہ داریاں سنبھالے پورا ایک سال گزرنے کے باوجود بھی، یکم جنوری سے 31 جولائی تک کے سات ماہ میں...... سندھ میں مختلف وارداتوں 1187 افراد ہلاک اور 2491 زخمی ہوئے۔ ان میں نسلی بنیادوں پر مارے جانے والوں کی تعداد 635 اور زخمی ہونے والوں کی 1433 تھی۔ اس کے برعکس ملک کے باقی تینوں صوبوں میں اس دوران مجموعی طور پر 599 افراد ہلاک اور 1656 زخمی ہوئے۔ وہاں کسی نے والعہ میں ایک بھی ایسا نہ تھا اور نسلی وجوہات کی بناپر مارا گیا ہو۔ البتہ 14 آدمی زخمی ضرور ہوئے۔

انہی سات مہینوں کے دوران سندھ میں 765 افراد اغوا کیے گئے اور 1062 ڈکیتیاں ہوئیں، ملک کے باقی تینوں صوبوں میں کل ملا کر اغوا کی 115 اور ڈکیتی کی 327 وارداتیں ہوئیں۔

ان حالات کی وجہ سے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے، کہ سندھ میں حکومت مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے اور یہاں جنگل کے قانون کے سوا کوئی قانون نہیں۔ امن و امان کی بحالی اور شہریوں کے جان و مال کی حفاظت حکومت کی بنیادی ذمہ داری تھی۔ اگر سندھ کی حکومت اس میں ناکام ہو چکی تھی تو صوبے کو اندرونی انتشار سے بچانے کا فرض آئین کی رُو سے مرکزی حکومت پر عائد ہوتا تھا حالانکہ مرکز اور سندھ میں ایک ہی سیاسی جماعت برسرِ اقتدار تھی مگر اس بات کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی کہ صوبائی حکومت کو آئین اور قانون کے مطابق چلایا جائے۔

ایک طرف یہ ناگفتہ بہ اور تشویش ناک حالات تھے تو دوسری طرف اختیارات کے ناجائز استعمال کے ذریعے تجوریاں بھرنے اور عنایات بانٹنے کی بے شمار داستانیں عوام میں گردش کر رہی تھیں۔ رشوت، بے ایمانی اور بدعنوانی کے واقعات زبان زد خلائق تھے۔ قومی اور بین الاقوامی اخبارات آئے دن بڑے بڑے سکینڈل چھاپ رہے تھے۔

سرکاری خزانے کو اس طرح موروثی جائیداد کی طرح برتا جا رہا ہے اور قومی وسائل کو اس طرح مالِ غنیمت کی طرح لوٹا جا رہا ہے کہ لفظ کرپشن پاکستانی سیاست کا ٹریڈ مارک بن گیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ تجارتی بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں مثلاً زرعی ترقیاتی بنک، NDFC اور PICIC سے ناجائز مراعات حاصل کرنے اور دلوانے کی راہ ہموار کرنے کے لیے ان میں کلیدی آسامیوں پر اہمیت اور تجربے کا خیال کیے بغیر اپنی پسند کے افراد کا تقرر کیا گیا ہے۔ ضروری دستاویزوں، ضمانتوں اور قاعدے کے مطابق کارروائی کے بغیر اربوں روپے کے قرضے سیاسی بنیادوں پر منظورِ نظر افراد کو دلوائے گئے اور کروڑوں روپے کے واجبات اور قرضے یا تو معاف کروائے گئے ہیں یا ان کی ادائیگی نہ شرائط وضوابط اور میعاد کو انتہائی آسان بنا دیا گیا ہے۔ نتیجتاً چند بینکوں کے دیوالیہ ہونے تک کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

اخبارات ملکی تجارتی معاہدوں میں بھی اسی انداز کی بدعنوانیوں کا واویلا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مشکوک حیثیت رکھنے والی فرموں کے ساتھ بین الاقوامی منڈی کی قیمتوں سے کہیں کم داموں پر روئی اور چاول کی فروخت کے بڑے بڑے سودوں میں کروڑوں روپے کا کمیشن کھایا گیا ہے۔ اسی طرح یہ خبریں بھی چھپیں کہ توانائی، ہوابازی اور مواصلات سمیت کئی شعبوں میں بیرونی ممالک سے اربوں روپے کی خریداری ملکی ضروریات، بہتر معیار اور ارزاں قیمت کی بجائے محض ذاتی منفعت کو مدِ نظر رکھ کر کی جارہی ہے اور یوں قومی خزانے کو بڑا بھاری نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

سرکاری کانٹریکٹس، امپورٹ/ایکسپورٹ لائسنس، مختلف قسم کے پرمٹ اور صنعتی اجازت ناموں کے سلسلے میں بڑی بڑی رشوتوں اور سیاسی نوازشوں کی باتیں سننے میں آئیں۔ رہائشی اور کمرشل پلاٹوں کی الاٹمنٹ اور قیمتی سرکاری اراضی اونے پونے فروخت کا بھی ذکر بھی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی کی ٹانگ سے بم باندھ کر دن دیہاڑے کروڑوں روپے لوٹنے جیسے لرزہ خیز واقعات بھی شائع ہوتے رہے۔ پریس کے علاوہ سیاسی سطح سے بھی عوامی فورم پر بدعنوانی کے انتہائی سنگین الزامات لگائے گئے اور مبینہ دستاویزی ثبوت سامنے لائے گئے۔

الزامات کے اس طوفان میں ایک ذمہ دار حکومت کا فرض تھا کہ ان الزامات کو صرف بدنام کرنے کی سازش، سیاسی پروپیگنڈا اور بہتان تراشی کا نام دے کر نظر انداز کر دینے کی بجائے ان کی باقاعدہ چھان بین کا اہتمام کرتی، عین ممکن تھا کہ وہ الزامات غلط ثابت ہوتے مگر ان کے درست ہونے کا بھی تو امکان تھا۔ بنیادی بات یہ تھی کہ کسی غیر جانب دار ادارے کے ذریعے ان کی تحقیقات کروائی جاتی تاکہ حقائق عوام کے سامنے آجاتے، ان کی تشفی ہو جاتی اور اپنے نمائندوں پر ان کا اعتماد بحال ہو جاتا مگر ایسے مطالبات کے باوجود اس سے گریز کیا جاتا رہا۔ اور بالآخر جب رائے عامہ کا دباؤ بہت بڑھ گیا تو خود اپنے ہی نامزد کردہ ایک صاحب کو بغیر قانونی اختیارات دیئے تحقیقات پر مامور کر دیا گیا، جو نہ سیاسی سطح پذیرائی حاصل کر سکے نہ عوامی سطح پر اعتبار۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ بدعنوانیوں کی باتیں کرنے والوں کو عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے مشورے بھی دیئے جاتے رہے۔ اس سے قطع نظر جمہوریت میں نیک نامی اور اچھی بُری ساکھ کے فیصلے عدالتوں سے نہیں، عوام سے لیے جاتے ہیں، اصولاً مشورہ غلط نہیں تھا۔ لیکن عدالتوں میں جانے کے لیے الزامات کی تفتیش ضروری ہوتی ہے اور یہ کام سرکاری ایجنسیوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ متعلقہ دستاویزات اور فائلیں بھی سرکاری تحویل میں ہوتی ہیں جن تک کسی غیر متعلق شخص کو حکومت کی اجازت کے بغیر رسائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ عدالت سے رجوع کرنے کا مشورہ عملاً بالکل بے سود تھا۔

پھر ایسا بھی تو ہوا کہ عدالت نے کم از کم ایک کیس میں اقربا پروری اور اختیارات کے ناجائز استعمال کی تصدیق کر دی مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ عدالت کے فیصلے کا کتنا احترام کیا گیا؟ جمہوری ملکوں کی اس روایت پر کس حد تک عمل کیا گیا کہ عوامی سطح پر بدعنوانی کے معمول سے الزام پر بھی ثبوت کے انتظار کیے بغیر از خود استعفیٰ دے دیا جائے یا طلب کر لیا جائے تاکہ اس الزام کی صحت کی تحقیق کے لیے غیر جانب دارانہ اور سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کے احتساب کی روایت نہیں ڈالی گئی۔

یہ قوم کا فرض ہے کہ عوامی اعتبار کے خائنوں، قومی اعتماد کے سوداگروں اور ملکی وسائل کے رہزنوں کے محاسبے کا اہتمام کرے۔ جب تک عوام کے ہاتھ حکمرانوں کے دامن اور ان کے گریبانوں تک نہیں پہنچیں گے اور عوامی نمائندوں کی مناسب جواب طلبی کا اہتمام نہیں کیا جائے گا، بے داغ سیاست اور آئین اور قانون کے مطابق صاف ستھری جمہوری حکومت کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔

سیاسی محاذ آرائی، بدامنی، ناانصافی اور حق تلفی کے اس ماحول میں عوام کے حقیقی مسائل کی طرف توجہ دینے کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ عوام غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور بیماری جیسی لعنتوں سے پریشان رہے اور توقعات کی ناکامی کے نتیجے میں جمہوریت پر ان کے اعتماد میں ضعف آنے لگا جو جمہوریت کے لیے نیک شگون نہیں تھا۔

خواتین و حضرات!

اپنی طرف سے میں پورے خلوص اور دل سوزی کے ساتھ ہر سطح پر خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتا رہا اور اپنی کاوشوں کا ڈھنڈورا پیٹے بغیر اس بات کے لیے کوشاں رہا کہ حکومت اور عوامی نمائندوں کو ان کی آئینی، قومی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس دلاؤں۔ انہیں ذہن نشین کراؤں کہ حکومت کی مسند حقوق سے زیادہ فرائض کے تاروں سے بُنی جاتی ہے کہ جمہوریت میں اختیارات کا استعمال شہنشاہیت کی طرح من مانے طریقوں پر نہیں کیا جاتا، بلکہ انہیں اجتماعی مفاد میں، قانون قاعدوں کے تحت، امانت کے طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اگر حکومت بعض مروجہ قوانین و ضوابط کو اپنی نام نہاد ترقی پسندی کی راہ میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکاوٹ سمجھتی ہے تو ان کی خلاف ورزی کی بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے متعلقہ فورم پر ان میں ترمیم کی جائے تاکہ سب کو نئے رولز آف دی گیم کا پیشگی علم ہو سکے۔

مگر میری کوششیں، افسوس ہے کہ نقش برآب ثابت ہوتی رہیں۔ گاہے گاہے اصلاحِ احوال کے خوش کن وعدے تو کیے گئے لیکن عملی طور پر حالات بہتری کی بجائے ابتری کی طرف ہی مائل رہے اور مایوسی، بداعتمادی اور بے یقینی قوم کے دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ ہر طرف سے صدر کی آئینی ذمہ داریوں کی بات کی جائے گی اور ہر فورم سے۔ عوامی سطح پر بھی اور رسمی ملاقاتوں میں بھی، تقریروں اور بیانات میں بھی اور اخباری کالموں میں بھی۔ صدر سے پرزور مطالبہ کیا جاتا رہا کہ وہ اپنا رول اور اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کریں۔

میں ان مطالبات کے پس پردہ کرب اور دردمندی کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں ان تشویش ناک عوامل سے بھی خوب واقف تھا جو انتہائی اقدام کے مطالبے کا محرک بن رہے تھے۔ لیکن میں عجلت میں کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ نظام، جو خود میں اپنے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں لایا تھا، ممکنہ حد تک چلتا رہے۔

آپ غالباً بھولے نہ ہوں گے کہ 17 اگست 1988ء کے المناک حادثے کے بعد جب حکومت کی ذمہ داری مجھے سنبھالنی پڑی تو پہلے دن سے میری کوشش یہی رہی کہ ملک کو بلاتاخیر ایک بار پھر جمہوریت کے راستے پر ڈالا جائے۔ چنانچہ انتہائی غیر یقینی اور مخدوش حالات کے باوجود وقت مقررہ پر انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا گیا اور ہر وہ قدم اٹھایا گیا جو آزادانہ، غیر جانب دارانہ اور پُرامن انتخابات کے لیے ضروری تھا۔ ان میں ملکی تاریخ میں پہلی بار انتخابات کی نگرانی کا کام عدلیہ کو سونپنے کا فیصلہ بھی شامل تھا۔ انتخابات کے بعد سابقہ روایات کے برعکس انتقالِ اقتدار کا مرحلہ بھی انتہائی پُرامن طریقے پر مکمل کیا گیا۔ گو کہ پیپلز پارٹی کو اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی تھی، مگر وہ سب سے بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی تھی۔ چنانچہ اس کی رہنما کو سب سے پہلے حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ ایسا کرنا میرے نزدیک جمہوریت کا تقاضا تھا اور میں نے اس طرح ایک صحت مند جمہوری روایت ڈالنے کی کوشش کی تھی حالاں کہ آئین میں اس بات کی گنجائش موجود تھی کہ کسی اور کو اقتدار منتقل کیا جاتا اور وہ ساٹھ دن کے عرصے میں اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیتا جو اس وقت کے سیاسی ''جمعہ بازار'' میں ناممکن نہ ہوتا۔

قومی تاریخ کے ان ناقابلِ تردید حقائق کو دوہرانے کا مقصد خود ستائش نہیں بلکہ محض یہ یاددہانی کرانا ہے کہ ترکمانستان میں کچھ خون ہمارا بھی شامل تھا۔ چنانچہ میں شدید عوامی اصرار اور دباؤ کے باوجود کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی بجائے عوامی نمائندوں کو اپنی اصلاح آپ کرنے کا پورا موقع اور مسلسل مشورہ دیتا رہا۔ مجھے توقع تھی کہ ابتدائی لغزشوں کے بعد راہروؤں کو راستے کے پیچ وخم کا اندازہ ہو جائے گا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ا، وہ بتدریج احتیاط کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلنے لگیں گے۔ میرا خیال تھا کہ ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد میسر آنے والی جمہوریت پر سرخوشی کی ہیجانی کیفیت آہستہ آہستہ معدوم ہو جائے گی و اس کی جگہ اعتدال پسندی، بالغ نظری اور شعور کی پختگی لے لے گی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ اقتدار کے شے میں بصارت بھی کمزور ہو گئی اور سماعت بھی اور بزعم خود جمہوریت کے چیمپئن بننے والے جمہوریت کی یداری، نگہداشت کی بجائے عملاً اس کی بیخ کنی پر مصر ہے لیکن قوم کسی کو لامحدود مدت تک یہ اجازت نہیں ے سکتی کہ وہ ناسمجھی میں، یا نااہلی کے سبب، یا مذموم مفادات کی خاطر ایسے حالات پیدا کرے کہ ر انخواستہ جمہوریت کو نقصان پہنچے یا اس سرزمین پر آنچ آئے، جس میں یہ پودا بڑے چاؤ سے لگایا گیا ہے۔ چنانچہ مجھے بالآخر قومی اسمبلی توڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

میرا یہ فیصلہ کسی فرد، کسی گروہ، کسی جماعت کے خلاف نہیں۔ اگر یہ فیصلہ کسی کے خلاف ہے تو،

غیر آئینی، غیر قانونی، غیر جمہوری طور طریقوں کے خلاف ہے۔

رسہ کشی، محاذ آرائی اور ہٹ دھرمی کی پالیسی کے خلاف ہے۔

موقع پرستی، مصلحت کوشی، خود غرضی اور مفاد پرستی کے رجحانات کے خلاف ہے۔

بدعنوانی، نااہلی اور بے عملی کی روش کے خلاف ہے۔

عوام میں پھیلتی ہوئی مایوسی، بددلی اور بے یقینی کے خلاف ہے۔

جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں بڑھتے ہوئے اندیشوں کے خلاف ہے۔

یہ فیصلہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کشی اور عوام کے نام پر عوام دشمنی کی پالیسی کے خلاف ہے۔

میں جمہوریت کی اس تعریف پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جو عوام کی و عوام کے ذریعے وجود میں آئے اور عوام کے لیے بلا امتیاز کام کرے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ بھی یسا ہی سمجھتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ غلط نہیں سمجھتے۔ اگر حالات بوجوہ، وہ روشن رُخ اختیار نہ کر پائے جس کی و قع آپ کو تھی اور جمہوریت کے اس تجربے پر آپ کو کچھ مایوسی ہوئی تو آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ جمہوریت ی خامیوں کو جمہوریت کی مسلسل مشق کے ذریعے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔ آپ کو اس باطنی توانائی پر، اپنی صلاح آپ کرنے کی اس صلاحیت پر پورا اعتماد ہونا چاہیے جو جمہوری نظام کا خاصا سمجھی جاتی ہے۔ اسے ار دگرد اپنے اظہار کا موقع دے کر ہی ہم جمہوریت کو استحکام بخش سکتے ہیں۔ انتخابی عمل سے بار بار گزر کر ہی یہ ممکن ہو گا کہ جمہوریت محض ایک طرزِ حکومت نہیں، طرزِ زندگی بن سکے، سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کا مروجہ طریقہ بن سکے، ہماری رگ و پے میں سما سکے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ کوئی طالع آزما رہزن اسے وٹ سکے اور نہ کوئی موقع پرست رہبر چھین سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب عوام جمہوریت کی رگوں میں ر آنے والے فاسد مادوں کو نکال پھینکیں اور از سرِ نو انتخابات سے بہتر اس کی اور کوئی صورت نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتخابات عوامی عدالت کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر امیدوار اپنا نامۂ اعمال لیے عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور عوام اس کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ میں نے عوام کو ایک بار پھر اپنے نمائندوں کے احتساب کا موقع دیا ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ عوام پوری دیانت داری اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اپنا فرض نبھائیں گے تاکہ جمہوری نظام میں وہ پختگی اور وہ شائستگی آ سکے جس کے ہم سب متلاشی ہیں۔

اس آئینی اور جمہوریت فیصلے پر غیر جمہوری احتجاج کو ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، عوامی احتساب کی گرفت سے بچنے کے لیے عوام کو غلط راستوں پر ڈالنے کی کوشش کرے گا تو اس سے انتہائی سختی کے ساتھ نمٹا جائے گا۔

خواتین وحضرات!

جہاں تک آئندہ کا تعلق ہے تو میرا یہ مصمم ارادہ ہے کہ آئین اور قانون کے مطابق جمہوریت کے کارواں کو جاری رکھا جائے۔ جناب غلام مصطفیٰ جتوئی نگران وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے عہدے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار اور اچھی سیاسی شہرت رکھنے والے انسان ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پاکستانی ہیں۔ پاکستانی ذہن سے سوچتے ہیں۔ پاکستان کا درد اور پاکستان کے لیے جینے اور مرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کی سربراہی میں نگران حکومت خوش اسلوبی اور پوری دیانت داری، غیر جانب داری اور نیک نیتی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگی۔

نگران حکومت اپنی ترجیحات خود مرتب کرے گی۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ ملک میں امن وامان کی بحالی اور تمام شہریوں کو یکساں تحفظ اور بلا امتیاز انصاف مہیا کرنے کے کام کو خاص اہمیت دے گی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بدعنوانی کی روک تھام اور جرائم کے خاتمے کے لیے بھی کام کرے گی اور ان اداروں کی ساکھ بحال کرنے پر بھی توجہ دے گی جو قانون کی عمل داری قائم کرنے کے ذمہ داری ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی محدود مدت میں یہ نگران حکومت بہت کچھ نہیں کر سکتی مگر مجھے یہ توقع ضرور ہے کہ وہ آئین اور قانون کی بالادستی کی روایتیں اور انداز حکمرانی میں شرافت، دیانت، انصاف اور خدمت کی روشن مثالیں قائم کرنے کی ابتدا کرے گی جو آنے والوں کے لیے مشعل راہ بن سکیں۔

مگر یہ اضافی باتیں ہیں۔ نگران حکومت کی ترجیحات میں سرفہرست اور اس کی اوّلین ذمہ داری یہ ہے کہ انتخابات کے انعقاد کا بندوبست کرے۔ عام انتخابات انشاء اللہ اس سال 24 اکتوبر کو ہوں گے۔

میں یہاں یہ بات بھی واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ انتخابات کی طرح اس بار بھی انتخابات پوری طرح غیر جانب دارانہ اور مکمل طور پر آزادانہ ہوں گے۔ الیکشن کے لیے پُرامن حالات اور پُرسکون ماحول کو یقینی بنایا جائے گا۔ کسی فرد، کسی جماعت، کسی گروہ کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اختیارات کے استعمال، تشدد کی دھمکیوں یا دھونس اور دھاندلی سے انتخابی عمل میں رکاوٹ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈالے یا انتخابی نتائج پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ عوام کی رائے کا مکمل احترام کیا جائے گا اور انتہائی نتائج کو کھلے ذہن اور کھلے دل کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

اب میں ملک کے دانشوروں سے، رائے عامہ کے رہنماؤں سے اور ہر صاحب نظر سے اپیل کروں گا کہ جو کچھ ہو چکا ہے، اس پر بھی گہری نظر رکھیں اور جو کچھ ہو رہا ہے، اسے بھی بغور دیکھتے جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ کل وقت کا فیصلہ آپ کی گواہی پر منحصر ہو..... وقت، جس کی قسم خود داورِ محشر نے یہ کہہ کر کھائی ہے کہ ''انسان خسارے میں ہے''، وہی وقت آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظریں پہچانئے اور جو موقع آپ کو ملا ہے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی کوتاہیوں کے ازالے کی کوشش کیجئے۔ اپنے سیاسی شعور کی تربیت کیجئے۔ مکروفریب کے جھوٹے دعوؤں اور خلوص وصداقت میں فرق کرنا سیکھئے۔ اچھے برے کی تمیز کیجئے کہ آپ کی صحیح سوچ اور درست فیصلوں پر ہی اس ملک کا، اس قوم کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ خدا آپ کو صحیح عمل کی توفیق دے، اہل پاکستان کو بُرے وقت سے محفوظ رکھے اور ان کی رہنمائی فرمائے۔ آمین۔

پاکستان پائندہ باد!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومی اسمبلی کا خاتمہ (19 اپریل 1993ء)

18 اپریل کو صدر غلام اسحاق خان کا خطاب

میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم!

جیسا کہ آپ کو علم ہے، عرصہ دراز سے وطن عزیز میں تشویش، بے چینی اور بے یقینی کی انتہائی کربناک صورتِ حال پائی جا رہی تھی۔ میں نہایت دل سوزی مگر حد درجہ صبر کے ساتھ ساری صورتِ حال کا ناقدانہ جائزہ لیتا رہا۔ کئی بار میری تشویش صبر کی آخری حدود کو چھونے لگی مگر میں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں اور اس امید پر کہ بالآخر دانش اور اعتدال کی قوتیں غالب آ جائیں گی۔ احتیاط کی راہ اپنائے رکھی مگر اس کا کیا علاج کہ اقتدار کی ہوس میں ملک کے بہترین مفادات کو داؤ پر لگانے والے مہلت اور وارننگ ملنے کے باوجود تباہ کن روش سے ہٹنے پر تیار نہ ہوئے اور انہوں نے اپنی اصلاح اور حالات کی درستی کے لیے اقدامات کرنے کی بجائے ملک کو انتہائی سنگین بحران سے دوچار کرنے کی ٹھانی۔ ان کی ہٹ دھرمی، ضد اور عاقبت نااندیشی کا کچھ اندازہ آپ کو سابق وزیراعظم کی کل کی تقریر سے ہو گیا ہو گا۔ تقریر کرتے وقت اگر ایک طرف انہوں نے اپنی حکومت کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ملک کے آئین، پاکستان کے اعلیٰ ترین آئینی عہدے، وطن عزیز کی سالمیت اور مملکت خداداد کے وقار، نیک نامی اور ناموس کی دھجیاں بکھیرنے کی جسارت کی۔ بات اگر محض میری ذات پر تنقید کی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی کہ کوئی انسان خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر فائز کیوں نہ ہو، تنقید سے ہرگز بالاتر نہیں لیکن سابق وزیراعظم نے تو اپنی تقریر کے ذریعے ان تمام آئینی بنیادوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی جس پر وفاقِ پاکستان اور ہماری نوخیز جمہوریت کا ڈھانچا استوار ہوا ہے۔ میں اب مزید خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اگر میں نے اب بھی قوم کو اعتماد میں نہ لیا تو اپنے حلف سے انحراف اور عوام سے بے وفائی کا مجرم ہوں گا اور میں کسی بھی مصلحت کے تحت اتنے بڑے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ اپنے عزیز از جان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ن اور اپنی پیاری قوم کو آلام ومصائب اور ناگفتہ بہ دشواریوں کے گرداب سے نکالنا میرا منصبی فرض ہے۔ ناد پرستوں کی تنقید اور عوام دوستی کے جھوٹے دعوے، داروں کی الزام تراشیاں مجھے اپنے فرض کی ادائیگی ت باز نہیں رکھ سکتیں۔ میں نے نصف صدی پر محیط قومی خدمت کی زندگی میں کبھی کسی مصلحت، ذاتی مفاد ر ابن الوقتی کو اپنے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہونے دیا، نہ عمر کے اس حصے میں ایسا کر سکتا ہوں۔ خاص طور ایسی صورت میں جب ملک عزیز کے بہترین مفادات اور جمہوری نظام کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہو۔

میرے عزیز ہم وطنو!

پاکستان کا انتظامی ڈھانچا وفاقی نظام ریاست کے مسلمہ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے اور کسی بھی وفاقی ام کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مرکز اور صوبے آئین میں متعین کردہ دائرہ کار کے اندر رہتے ئے اپنی اپنی طے شدہ ذمہ داریاں ادا کرتے رہیں۔ لیکن آج ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ بیشتر اقی اکائیاں، یعنی صوبے کی مرکزی حکومت کے رویے اور چودھراہٹ کے خلاف سراپا احتجاج بنے ئے ہیں۔ کونسل آف کامن انٹرسٹ تمام تر تشہیر کے برعکس، عضو معطل بن کر رہ گئی ہے۔ نیشنل فنانس یشن کی کارکردگی کے بارے میں کم و بیش سبھی صوبوں سے شکایات موصول ہو رہی ہیں۔ چھوٹے سے ھوٹے معاملات میں، جو صوبائی حکومت کے معمولی اہلکاروں کی سطح پر طے ہونے چاہئیں، سابق یر اعظم ذاتی طور پر مداخلت کرتے اور خود احکامات جاری فرماتے تھے۔ نتیجتاً پوری انتظامی مشینری لوج ہو کر رہ گئی اور زینہ بہ زینہ ذمہ داری کا وہ نظام، جو انتظامیہ کی موثر کارکردگی کی کلید سمجھا جاتا ہے، نتشر ہو کر رہ گیا۔

حکومت نے اپنی اقتصادی اصلاحات کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا تھا مگر اقتصادی معاملات کو سمجھنے والے اور یسیوں کے دور رس اثرات کا ادراک رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ پالیسیاں ملک کی اقتصادی حالت کو ہی کے ایک ایسے گڑھے تک لے جا رہی تھیں جہاں سے واپسی کا شاید کوئی راستہ نہ ہوتا۔ دولت مند ندانوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتی جا رہی تھی، ملک کے پیداواری وسائل پر چند من پسندوں کی اجارہ ی قائم کی جا رہی تھی، امیر کو امیر تر بنانے کے خبط میں بڑی بے رحمی کے ساتھ یہ بات بھلائی جا رہی تھی غریب غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ترقی کے ضمن میں موٹر وے کو حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جا رہا تھا، مگر یہ نام نہاد "عظیم منصوبہ" جتنا بڑا ہے اس سے کہیں زیادہ متنازع، بدنام اور بدعنوانی کے الزامات سے داغ دار ہے۔

بیرونی سرمایہ کاری کا بھی بڑا چرچا رہا مگر حقیقت یہ ہے کہ کثیر صرفے سے منعقد کی جانے والی فرنسوں اور جھوٹے دعووں کے بالکل برعکس ڈھائی سال سے ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کی حقیقی ح کچھ نہ ہونے کے برابر ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نج کاری کی پالیسی کو ایک انقلاب آفریں تصور کے طور پر پیش کیا گیا۔ پرائیویٹ سیکٹر کی حوصلہ افزائی یقیناً ایک اچھا قدم ہے۔ مگر مکمل طور پر مادر پدر آزاد معیشت ترقی کا نہیں تباہی کا راستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں میں بھی جو آزاد معیشت کے چیمپئن سمجھے جاتے ہیں، اب پرائیویٹ سیکٹر کے ساتھ پبلک سیکٹر کو بھی مضبوط کرنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے، برطانیہ تو اس نظریے کا علم بردار تھا ہی، امریکہ کا حالیہ الیکشن بھی اس نعرے پر جیتا گیا۔ لیکن سابق حکومت کے اقتصادی پنڈتوں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ وہ ٹیلی فون اور ریلوے جیسے حساس محکموں، سیمنٹ اور گھی جیسی عام آدمی کی ضرورت کی اشیاء کے کارخانوں اور پی آئی اے اور واپڈا جیسے اداروں پر بھی، جو ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں، ہاتھ صاف کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ نیشنل شپنگ کارپوریشن جیسا قومی اہمیت کا ادارہ بھی اس دست برد سے محفوظ نہیں رہا اور اس کی آمدنی کا بہت قلیل حصہ سرکاری خزانے میں پہنچے گا۔

اس بے تدبیری، اندھا دھند اقربا پروری اور اپنے منظورِ نظر افراد کو نوازنے کی پالیسی کے نتیجے میں مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی اور غریب تو غریب، متوسط طبقے کے سفید پوش خاندانوں کے لیے بھی جان و تن کا رشتہ برقرار رکھنا دشوار ہو گیا۔ باعزت روزگار اور ملازمتوں کا حصول اتنا مشکل بنا دیا گیا کہ ایم اے پاس نوجوان اپنی عزتِ نفس کو قربان کر کے ٹیکسی ڈرائیور بننے پر مجبور ہو گئے۔ ملک میں اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک ایسے فلاحی معاشرے کے قیام کی بجائے جو خود بخود غریبوں اور محتاجوں کی کفالت کا اہتمام کر سکے، قوم کے ہاتھوں میں خیرات کے چیک دیئے جاتے رہے اور وہ بھی ٹیلی ویژن کی تیز روشنیوں اور کیمرے کی آنکھ کے سامنے۔ اس طرح سستی شہرت کا اہتمام تو شاید ہو گیا لیکن رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تاکید کی نفی پر اہلِ اقتدار کے دل کیوں نہ لرزے کہ اس طرح دو کہ دائیں ہاتھ سے دیتے ہوئے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔

امن و امان کی حالت یہ ہے کہ دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ نہ گھروں کی چار دیواریاں محفوظ ہیں، نہ سفر کا کوئی ذریعہ، بسیں، ٹرینیں تک لوٹی جا رہی ہیں۔ ناجائز اسلحہ کی بھرمار ہے۔ صوبہ سندھ میں حال ہی میں امن و امان کی صورت حال میں جو کچھ بہتری ہوئی ہے وہ بھی فوج کی موجودگی کی مرہونِ منت ہے۔ کسی زمانے میں حکومت نے ناجائز اسلحہ کی بازیابی کی مہم چلائی تھی لیکن انتظامی مشینری کو اتنا ناکارہ بنا دیا گیا تھا کہ چند سو بندوقوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آ سکا اور خجالت کے عالم میں وہ مہم ترک کر دینی پڑی۔ کلاشن کوف کلچر کے خلاف وعظ کیے جاتے رہے۔ لیکن دوعملی کا عالم یہ تھا کہ خود انتظامیہ کا سربراہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور دیگر اہلِ خاندان کو کلاشن کوفوں کے لائسنس جاری کرنے کے احکامات صادر کرتا رہا۔ غریبوں کی بیٹیوں کی اجتماعی بے حرمتی کی جتنی وارداتیں گزشتہ اڑھائی برس میں ہوئیں، اتنی شاید کئی عشروں میں نہیں ہوئی ہوں گی۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یراعظم صاحب نے ذاتی پبلسٹی کے شوق میں بے آبرو ہونے والی خواتین اوران کے اہل خانہ کو
رکاری میڈیا پر لاکر پوری قوم کے سامنے تماشا بنا ڈالا۔ وہ بھول گئے کہ عزتوں کی حفاظت ان کے لئے
عیادت کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ ان کے لیے حکومت کو قانون کی عمل داری اور انصاف کی بالادستی قائم
رنی پڑتی ہے۔ مگر اس طرف سنجیدہ توجہ دینے کی جائے بادشاہوں اور شہزادوں کا سا انداز حکمرانی اپنایا
یا جو ذاتی پسند و ناپسند، نوازش جا و بے جا، اور قانون اور انصاف کے تقاضوں کی بجائے شاہانہ مزاج
ے پل پل بدلتے رنگوں سے عبارت تھا۔

ملک میں یکے بعد دیگرے مالیاتی سکینڈل سامنے آتے رہے۔ کوآپریٹو سکینڈل اور تاج کمپنی
یںڈل سینکڑوں خاندانوں کی تباہی کا پیش خیمہ بنے۔ جب ان کی فریادیں اخبارات میں شائع ہوکر
مرانوں کے ضمیر کو کچوکے دینے لگیں تو جرأتِ اظہار کے جرم میں بے باک زبانوں پر تالے ڈالنے کی
شش کی گئی۔ بغاوت کے مقدمے قائم ہوئے اور آزادی رائے کے حق کو روند ڈالا گیا۔ یہی نہیں، تنقید
ا بے لاگ رائے زنی کے معصومانہ جرم پر صحافیوں کو زدوکوب کرنے اور انٹیلی جینس ایجنسیوں کے
یعے انہیں طرح طرح سے ہراساں کرنے کو معمول بنالیا گیا۔ دوسری طرف کسی اخبار کے اشتہارات
یے گئے، کسی کے لیے کاغذ کا حصول ناممکن بنا دیا گیا اور کسی کو انکم ٹیکس کے مقدمات میں الجھایا گیا۔
س بظاہر آزاد رہا مگر اندرونی طور پر اسے ہر طرح کی زنجیریں پہنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ الگ بات کہ
کے دھنی، دھن کے بھی پکے تھے اور فگار انگلیوں سے بھی خونچکاں داستانیں رقم کرتے رہے۔

سول سروسز کسی بھی ملک کی انتظامیہ کا دست و بازو ہوتی ہیں۔ وہ کسی کے ذاتی ملازم نہیں ہوتے
۔ عوام کے خادم ہوتے ہیں اور انہیں قواعد وضوابط کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں مگر
ہانہ مزاج رکھنے والوں نے سول سروسز کو اپنا باج گزار سمجھ کر ذاتی غلاموں کی طرح استعمال کیا۔

آمرانہ ذہنیت کی انتہا یہ تھی کہ وزیراعظم نے اپنی کابینہ کے وزیروں پر ملک کے صدر سے ملنے تک
پابندی عائد کررکھی تھی۔ یہ پابندی سراسر آئین کے خلاف تھی۔ چنانچہ بعض جرأت مند وزرا اس ہدایت
ظر انداز کرتے رہے۔ بہر حال اس پابندی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وزیراعظم صاحب کو آئین
ا مہذب طرز حکومت کے مسلمہ اصولوں اور روایتوں کا کتنا پاس تھا۔

وزیراعظم کے ہاتھوں آئین، آئینی روایات، شرافت، تہذیب اور اخلاق کے جس طرح پرخچے
ائے گئے، اس کی بدترین مثال قوم نے کل رات اپنی آنکھوں سے دیکھی جب فیڈریشن کے آئینی
براہ پر سرکاری ذرائع ابلاغ سے الزام تراشی اور دشنام طرازی کا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ پاکستان کی تاریخ
ں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی وزیراعظم نے اس طرح کھلم کھلا آئین سے بغاوت کرتے ہوئے ملک کے
کو سازشی، ناپاک اور غیر مقدس جیسے القاب سے نوازا۔ دنیا کی پارلیمانی تاریخ کی پوری تاریخ میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح کی دریدہ دہنی اور بے جا بے سروپا اور لغو الزام تراشی کی شاید ہی کوئی مثال ملے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جوش خطابت میں ہرزہ سرائی کرتے ہوئے وہ یہ بات بھی بھول گئے کہ یہ وہی صدر ہے جسے کئی مرتبہ وہ زبردست خراج تحسین پیش کر چکے ہیں اور جسے ابھی چند ہی روز قبل انہوں نے اس کی خواہش کے بغیر ہی اپنی جماعت کا آئندہ صدارتی امیدوار نامزد کر کے پوری کابینہ سے اس فیصلہ کی توثیق کروائی تھی۔

میں نے اندرونی حالات کے ضمن میں بداعمالیوں، نااہلی، بدعنوانیوں اور دیگر خرابیوں کی مختصراً نشاندہی کی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر میں ملک کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے بھی آپ کو اس تصویر کا ہلکا سا خاکہ دکھاتا چلوں جو حکومت کی غلط پالیسیوں اور کوتاہ اندیشی کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ آج ہم قوموں کی برادری میں عزت و وقار کھو چکے ہیں اور تقریباً یک وتنہا کھڑے ہیں۔ ہمارے قریبی دوست تک بین الاقوامی سطح پر ہونے والے چناؤ میں ہمارے حق میں ووٹ دینے سے گریزاں رہتے ہیں۔ حکومت کی جلد بازی کے نتیجے میں کابل خون ریزی کی لپیٹ میں ہے۔ ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے نئے خطرے پیدا ہو گئے ہیں اور دشمن ہمارے بہترین قومی مفادات پر زد لگانے کے درپے ہیں۔

میں گاہے گاہے حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا رہا۔ زبانی بھی اور تحریری طور پر انہیں اپنی اصلاح کی تاکید کرتا رہا۔ مگر انہوں نے ہمیشہ میرے مشوروں کو مداخلت بے جا سمجھا۔ شاید ان کے مزاج کی خودسری مخلصانہ رہنما کو توہین سمجھنے کی عادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کل کی تقریر میں بڑی رعونت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا کہ وہ میری ڈکٹیشن قبول نہیں کریں گے۔ میں نے انہیں کبھی ڈکٹیشن نہیں دی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے اپنی آئینی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی، کاروبار حکومت بہتر طور پر چلانے کے لیے نہیں کچھ تجاویز دیں جن کو ماننا یا نہ ماننا کلیتاً ان کی اپنی صوابدید پر تھا۔ بہرحال حکومت کو ایڈوائس کرنا میرا آئینی فرض تھا جس سے روگردانی کر کے میں خدا اور مخلوق خدا کے سامنے شرمندہ ہونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی میں پوری زندگی قاعدے قانون کا پابند رہا ہوں اور کسی کی ناراضی کے خوف سے اپنے اصولوں سے ہرگز انحراف نہیں کر سکتا۔ آپ ہی بتائیے کہ اگر میں پاک فوج کے مرحوم سپہ سالار کی مظلوم اور غم زدہ بیوہ کے اس کھلم کھلا بیان پر، جس میں انہوں نے بعض افراد پر نام لے کر ملوث ہونے کا الزام عائد کیا تھا، حکومت کو مناسب کارروائی کرنے کو کہتا ہوں تو کیا اسے سرکاری کاموں میں مداخلت کہا جا سکتا ہے؟ یہ اگر ایک طرف میرا اخلاقی اور دینی فرض ہے تو دوسری طرف میری آئینی ذمہ داری بھی ہے کہ مظلوموں کی دادرسی کا اہتمام کروں۔ بہرحال یہ باتیں ان لوگوں کی سمجھ میں کیسے آ سکتی تھیں جو ہر شے کو اپنے مخصوص مفادات کے ترازو میں تولنے کے عادی ہیں۔

اس طرح کے کئی مخلصانہ اور صائب مشوروں پر وزیراعظم کی برہمی میرے اور ان کے تعلقات میں بتدریج در آنے والی تلخی کا محض پس منظر ہے۔ میں اب اہل وطن سے یہ بات نہیں چھپاؤں گا کہ مجھ سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وزیراعظم صاحب کی خفگی اور ناراضی کا فیصلہ کن باب اس وقت شروع ہوا جب میں نے اپنے آئینی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے پاک فوج کے ایک اہل فخر اور ہونہار فرزند کو چیف آف دی آرمی سٹاف مقرر کیا۔ اور یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ جنرل آصف نواز مرحوم کی تقرری کے وقت بھی سیخ پا ہوئے تھے اور بعد میں مرحوم جنرل کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بے جا مداخلت کرتے رہے تھے جس کے نتیجے میں حکومت اور جنرل ہیڈ کوارٹرز کے مابین کئی مرتبہ سخت کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔

میرے عزیز ہم وطنو!

کہنے کو اور بہت کچھ ہے جو آہستہ آہستہ آپ کے سامنے آتا رہے گا۔ مختصراً یہ عرض کروں گا کہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اتمام حجت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ عجلت اور جذباتی ہیجان میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ بہرحال اب حالات خرابی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ حزب اختلاف کے ممبروں کی بہت بڑی تعداد اور سرکاری بنچوں، حتیٰ کہ کابینہ کے بھی متعدد اراکین قومی اسمبلی سے استعفیٰ دے چکے ہیں اور قومی اسمبلی اپنی نمائندہ حیثیت کھو بیٹھی ہے۔ اگر میں اب بھی پاکستان کے آئین کے محافظ کی حیثیت سے اپنا فرض ادا نہ کروں تو اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس مملکت کا بحران میں پڑا رہنے دینے پر روزِ حساب سزا و جزا کے مالک کو کیا جواب دوں گا؟

چنانچہ میں نے اپنے آئینی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی کو توڑ دیا ہے جس کے نتیجے میں نواز شریف حکومت برطرف ہوگئی ہے۔ ملک کا آئینی، سیاسی اور اقتصادی بحران اور اردگرد کے ماحول اور عالمی تناظر میں پاکستان کو درپیش خطرات کا تقاضا ہے کہ عوام کو نئے سرے سے یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ ہوش مندی کے ساتھ اور اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں ملک کے لیے اہل اور صاحب کردار قیادت کا انتخاب کریں۔ چنانچہ آئین کے تقاضے کے مطابق نوے دن کے اندر اندر نئے عام انتخابات منعقد کیے جائیں گے جنہیں ہر لحاظ سے آزادانہ اور منصفانہ بنانے کے لیے ہر وہ ممکنہ قدم اٹھایا جائے گا جو انسانی بس میں ہے۔

عبوری دور کے لیے میں نے جناب شیخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم مقرر کیا ہے جنہوں نے ابھی کچھ دیر قبل اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ عبوری دور میں اپنی اہم اور نازک ذمہ داریاں پوری خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کریں گے۔

میرے عزیز ہم وطنو!

قومی اسمبلی کی تحلیل کا فیصلہ کوئی خوش گوار فیصلہ نہیں تھا۔ مگر قوم و ملک کے مفادات اور جمہوری نظام کا مستقبل اتنے عظیم مقاصد ہیں کہ ان کی خاطر کڑوی سے کڑوی گولی بھی نگلنی پڑتی ہے۔ افراد آنی جانی شے ہیں۔ اصل اہمیت ملک کی ہے۔ اگر ملک سلامت ہے، خوش حال ہے تو ہم بھی ہیں اور ہمارے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قومی وجود کی بقا کی ضمانت بھی۔ خدا پاکستان کو سلامت رکھے اور یہاں جمہوریت کو فروغ عطا فرمائے کہ پاکستان اور جمہوریت لازم وملزوم ہیں۔ وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے بحران اور اقتدار کی ہوس میں اعتدال کی راہ سے ہٹنے والے بعض افراد جمہوریت پر قوم کے یقین اور جمہوری نظام سے عوام کی غیر مشروط وابستگی کو مضمحل نہیں کر سکتے۔ جمہوریت ہی ہماری منزل ہے اور ہم انشاء اللہ اسی منزل کی طرف رواں دواں رہیں گے۔ خدا ہمیں وہ بصارت، وہ سمجھ بوجھ، وہ خود اعتمادی عطا کرے کہ ہم اس قومی سفر میں ہر گام کامیابیوں سے ہمکنار ہوں۔ آمین!

پاکستان پائندہ باد!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نواز شریف کا قوم سے خطاب

18 جولائی 1993ء

میرے عظیم ہم وطنو!

السلام علیکم!

میں نے کرسی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ملک و قوم کی ترقی اور خوش حالی کے لیے ہم نے جو منصوبے شروع کر رکھے ہیں، وہ جاری رہیں گے۔ 17 اپریل کو جب میں نے کہا تھا کہ میں استعفیٰ نہیں دوں گا تو آپ کی خدمت اور تعمیر و ترقی کا عمل جاری رکھنے کی غرض سے کہا تھا۔ جب میں نے کہا تھا کہ میں قومی اسمبلی نہیں توڑوں گا، تو آپ کے ووٹ کی طاقت منوانے کے لیے کہا تھا۔ جب میں نے کہا تھا کہ ڈکٹیشن نہیں لوں گا، تو منتخب وزیراعظم کا اختیار منوانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے یہ باتیں کار پر جھنڈا لہرانے اور آگے پیچھے پولیس لگوانے کے لیے نہیں کی تھیں۔ میرے سامنے ایک نصب العین تھا، پاکستان کے خوب صورت چہرے سے پسماندگی اور غربت و افلاس کے داغ مٹا کر اسے خوب صورت اور خوش حال بنانے سے ہمکنار کرنے کا نصب العین۔ استعفیٰ دینے سے میں نے اس لیے انکار نہیں کیا تھا کہ میں ایک بناوٹی اور بے عمل وزیراعظم بننا قبول کرلوں۔ قومی اسمبلی توڑنے سے میں نے اس لیے انکار نہیں کیا تھا کہ پارلیمنٹ کے فیصلے پامال ہوتے ہیں اور ہم ایئرکنڈیشنڈ ہال میں تقریروں کا شوق پورا کرتے رہیں۔ مجھے ایسا وزیراعظم بننے کا شوق نہیں جو ووٹ اور دعائیں دینے والوں کے دکھ درد دور نہ کر سکے۔ مجھے ایسا وزیراعظم بننے کا شوق نہیں، جو غربت اور افلاس کے مارے ہوئے انسانوں کو ان کا حق نہ دلا سکے۔ مجھے ایسا وزیراعظم بننے کا شوق نہیں جو صدیوں سے غلامی کی زندگی گزارنے والے بے زمین باشندوں کو زمین کا ٹکڑا نہ دے سکے۔

انہیں میرے چند روزہ اقتدار کی تکلیف نہیں تھی، انہیں تکلیف اس بات کی ہے کہ اگر نواز شریف نے بے روزگاروں کو روزگار کے مواقع، جینے کی سہولتیں اور کسی چھوٹی موٹی چیز کا مالک بنا دیا، تو اس قوم کے غریبوں سے خوئے غلامی جاتی رہے گی۔ انہیں سر اٹھا کر چلنا آ جائے گا اور ان کے منہ میں زبان آ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے گی۔ اس کی وجہ سے ان کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ یہ لوگ سیاست کو غریب عوام سے اوپر کی کوئی چیز بنائے رکھنے پر بضد ہیں۔ دیہات، کھیتوں، گلیوں اور محلوں کو یہ صرف انتخابی مہم کے دوران تماشائی کی طرح دیکھتے ہیں اور جب میں وزیراعظم کی حیثیت سے ان جگہوں پر جاتا ہوں، تو انہیں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے کہ ایوان اقتدار میں بیٹھا ہوا یہ شخص میلے کپڑوں اور کچے گھروں والے غریبوں کے ساتھ زمین یا چارپائی پر بیٹھ کر دکھ سکھ کیوں بانٹتا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی طرح میں بھی سیاست کو انتخابات کے بعد صرف اقتدار کے ایوانوں تک محدود رکھوں۔

میرے عزیز ہم وطنو!

آپ کے اس جمہوری ملک میں جمہوریت کا نام لینے والوں نے امتحان کا وقت آنے پر جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ اسمبلیوں کے قتل پر کون خاموشی سے گھر بیٹھ گیا تھا اور کس نے عوام کے ووٹوں کی توہین ہونے پر میدان میں ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اب ہر سیاست دان کو اپنا نامہ اعمال لے کر آپ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ جب یہ وقت آئے تو اتنا ضرور پوچھئے گا کہ جب نواز شریف جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا تو آپ کہاں تھے؟ میں آپ کو زیادہ نہیں بتا سکتا۔ میرا سینہ رازوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر راز ایک زخم کی طرح سلگ رہا ہے۔ اگر میں یہ راز افشا کر دوں تو آپ طوفان کی طرح اٹھ کھڑے ہوں اور ان سازشیوں پر یلغار کر دیں جنہوں نے ذاتی خواہشوں اور مفادات کی خاطر معاشی ترقی کا عمل روک کر آپ کے خوابوں کو چکنا چور کرنے کی کوشش کی، لیکن میں آپ کو اپنا سینہ کھول کر نہیں دکھا سکتا۔ ذمہ داریوں نے میرے ہونٹ سی رکھے ہیں اور ملک و قوم کے مفادات نے میری زبان بند کر رکھی ہے۔ بہت سی باتیں آپ کو خود معلوم ہیں اور جو کچھ بتانا ممکن ہے، وہ میں عرض کر دیتا ہوں۔

قومی اسمبلی کی بحالی کے بعد میرا خیال تھا کہ عوام اور عدلیہ کا یہ فیصلہ مہذب انداز میں قبول کر لیا جائے گا اور قوم کی تقدیر کے ساتھ مذاق کرنے والے ہمیں اب کسی رکاوٹ کے بغیر پاکستان کی خدمت کرنے دیں گے۔ میرا خیال تھا کہ چند ہفتوں میں غیر آئینی اقدام کی وجہ سے بگاڑے گئے نظام کو درست کر کے ان معاشی سرگرمیوں کو بحال کروں گا، جن میں عوام کی منتخب حکومت کے خاتمے کی وجہ سے خلل آ گیا تھا اور اپنے ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے وسائل مہیا کروں گا، جو شدید مالی مشکلات اور سیاسی مخالفتوں کے باوجود ہم نے شروع کر دیئے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے میرے شب و روز وقف ہیں، انہیں تیز رفتاری سے پورا کروں گا مگر میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ گیا، جو اپنے ملک اور غریب عوام کی بہتری کے لیے ہونے والے ہر کام میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ہاریوں، کاشت کاروں اور کھیت کے مزدوروں کے دن بدلیں اور ان کے بچوں کو خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں۔ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں چاہتے کہ تہذیب سے کٹے ہوئے علاقوں میں جہاں ہمارے بھائی، بہنیں انسانی سطح سے گری ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، وہاں بجلی اور سڑکیں جائیں اور یہ غریب لوگ بھی نئے زمانے کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ نہیں چاہتے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے عزت کے ساتھ روزی کمانے کے وسائل پیدا ہوں۔ یہ نہیں چاہتے کہ جس کے پاس کوئی زمین یا جائیداد نہیں اسے قرضے، سیلو کیب، سیلوٹریکٹرز ملیں اور وہ بھی خدا کی اس دنیا میں کسی چیز کو اپنا کہہ سکیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ہر سال سیلاب سے تباہ ہونے والے غریبوں کو کسی قدرتی آفت سے بچانے کے لیے ٹھوس انتظامات کیے جائیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ صدیوں سے مجبور و بے بسی کی زندگی گزارنے والی ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے معاشی وسائل فراہم کیے جائیں تاکہ وہ بھی اپنے انسانی حقوق حاصل کر سکیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ یہاں موٹرویز، بندرگاہیں، ہوائی اڈے اور بھاری صنعتیں قائم ہوں، جن کی وجہ سے پاکستان وقار کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو سکے۔ یہ نہیں چاہتے کہ بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر انسان کا بوجھ جانور کی طرح کھینچنے والے انسان کو اس کا وقار ملے اور توہین انسانیت کا یہ شرمناک سلسلہ ختم ہو۔ جوڑ توڑ، سازشیں آئینی تاویلات کی فریب کاریاں اور بات بات پر جمہوریت، یہ سب چیزیں عوام کو دھوکا دے کر انہیں ترقی و خوش حالی سے محروم رکھنے کے لیے ہیں۔ انہیں ایک پسماندہ غریب، جاہل اور بے زبان قوم چاہیے جس پر یہ حکومت کرتے رہیں۔

نواز شریف نے کہا کہ محلاتی سازشوں کا یہ کھیل تو ہم برسوں سے دیکھتے آ رہے ہیں۔

قوم کو اس سے کیا ملا؟ بدحالی، پسماندگی، آئے دن کے بحران اور مسلسل بے یقینی، کیا میری قوم کے مقدر میں بے یقینی اور بے چینی لکھی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ کیا پاکستان کی تقدیر صرف یہ ہے کہ ہم بے روزگاری، لاقانونیت، بیماری، پسماندگی اور جہالت میں شہرت پائیں؟ بالکل نہیں۔ کیا پاکستان میں ہماری اور آئندہ نسلوں کی زندگی بھی انہی سازشوں اور ریاکاریوں کی نذر ہو جائے گی، جو ہماری پرانی نسلوں کو کھا گئی؟ میں یہ تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے یہ چاہا کہ ماضی کے ان بدصورت ورثوں کا ملبہ صاف کر کے نئی دنیا کی تعمیر کروں لیکن ترقی کے دشمنوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ قوم کی خوش حالی اور پاکستان کو سربلندی کے لیے کام کرنا ان لوگوں کا ناگوار گزرا۔ انہیں فکر پڑ گئی کہ اگر ہم نے تعمیر و ترقی کا کام اسی رفتار سے جاری رکھا تو یہ اگلے انتخابات میں ہمارا مقابلہ کیسے کریں گے۔

انہوں نے شکست سے بچنے کے لیے میرے ہاتھ روکنے کی سازش کی اور چور دروازے سے ایوان اقتدار میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔ خواہ یہ راستہ قوم کی محرومیوں اور پسماندگی سے ہی ہو کر کیوں نہ گزرتا ہو۔ انہوں نے ٹھوس اکثریت کے ساتھ قائم مستحکم جمہوری حکومت کے لیے مشکلات کھڑی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیں اور منظم انداز میں بار بار یہ تاثر پیدا کیا گیا جیسے ملک میں کوئی سیاسی بحران ہو۔ ان لوگوں نے بحران کا شور مچا کر بیرونی دنیا میں پاکستان کو کتنا نقصان پہنچایا، کاش انہیں اس کا احساس ہو، کاش وہ یہ جانتے ہوں کہ ترقی یافتہ دور میں ایک ترقی پذیر ملک کی ساکھ کتنی مشکل سے بنتی ہے اور یہ ساکھ اگر خراب ہو جائے تو اسے بحال کرنا کتنا مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ زیادتی میرے ساتھ نہیں کی، اپنے ملک کے ساتھ کی ہے، جو میری طرح ان کا بھی ملک ہے اور اس ملک کے وقار کا تحفظ صرف حکومت کا ہی نہیں، اپوزیشن بلکہ ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ پاکستان کا کوئی مخالف ہم پر بحران کا شکار ہونے کی تہمت لگاتا تو مجھے کوئی شکایت نہیں تھی، مگر اپنوں کی طرف سے اس کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

بحران کی تعریف کیا ہے؟ اس کا جائزہ لینا ہے تو 1970ء اور 1977ء کے انتخابات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ دونوں مرتبہ عوام کی بھاری اکثریت حکومت کے خلاف تھی۔ مظاہرے ہو رہے تھے، ہڑتالیں تھیں، حکومتیں اتنی بے بس ہو گئی تھیں کہ انہیں فوج کی مدد لینا پڑی اور اس کے باوجود حالات پر قابو پانے میں ناکام رہیں۔ اس طرح کے حالات ہوں تو بحران کی بات کی جا سکتی ہے، لیکن آج صورتِ حال کیا ہے؟ ملک میں پونے تین سال سے کوئی ہڑتال نہیں ہوئی، جو ہوئی وہ ہماری حکومت کی برطرفی کے خلاف کی گئی۔ گزشتہ سال لانگ مارچ کی کال دینے والے جب سفر پر نکلے تو عوام نے اس بری طرح ان کا بائیکاٹ کیا کہ انہیں اپنا پروگرام ادھورا چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ لانگ مارچ کی دوسری کال پر بھی عوام نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ عوام حکومت کے خلاف سازشوں سے بیزار ہو گئے۔ وہ اپنے کاروبار کو معمول کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ عوام کا کوئی طبقہ حالات کو خراب کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ حالات خراب کرنے والوں کے خلاف اظہارِ نفرت کیا جا رہا ہے۔ جب عوام میں حکومت کے خلاف کوئی اضطراب نہ ہو تو پھر بحران کیسا؟ اصل صورت غالباً اس کے برعکس ہے۔ چند ہفتے قبل اپنی منتخب حکومت کی برطرفی پر عوام نے ہمارا ساتھ دیا تھا اور یہ غالباً اسی چیز کی انہیں سزا دی جا رہی ہے۔ اس نام نہاد بحران کا منبع چند افراد اور چند ڈرائنگ روم ہیں۔ یہ بحران کاغذوں میں ہے، بیانوں میں ہے، سازشوں میں ہے، ملک میں کہیں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لانگ مارچ کی نام نہاد تحریک کا شوشا بھی ایک انوکھے انداز میں چھوڑا گیا۔ احتجاجی تحریکیں ہمیشہ عوام چلاتے ہیں مگر اس مرتبہ یہ تحریک چلانے کا اعلان متنازع صوبائی حکمران کر رہے تھے۔ آئین کے تحت اٹھائے گئے حلف کی یہ کیسی پاسداری تھی کہ ایک صوبے کے گورنر، وفاق کے نمائندہ ہوتے ہوئے بھی وزیراعلیٰ کی مدد سے وفاق پر حملے کے اعلانات کرنے لگے۔ کیا یہ خود اس کے اہل تھے؟ کیا ان میں خود اتنی ہمت تھی کہ صوبے کے سرکاری وسائل اور اختیارات استعمال کر کے وفاقی حکومت کے خلاف کروڑوں روپے سے اشتہاری مہم چلائیں، بسوں کو گھیر کر سڑکوں کو بند کرنے کے منصوبے بنائیں اور روزمرہ کی زندگی معطل کر کے عوام کو پریشان کرنے کے پروگرام مرتب کریں۔ یہ لوگ غریب عوام کو نواز شریف سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بت کی سزا دینا چاہتے تھے اور حکومت کی راہ میں روڑے اٹکا کر مجھے عوام اور پاکستان سے محبت کی سزا دینے کے لیے بے تاب تھے۔

نہ یہ لانگ مارچ کر سکتے تھے اور نہ ہونا تھا، یہ صرف جمہوری نظام سمیٹنے کی ایک سکیم تھی۔ نام یہ میرا لے رہے تھے، لیکن سازش جمہوریت کے خلاف کر رہے تھے۔ میری ذات کا سوال ہوتا تو میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اقتدار سے علیحدہ ہو جاتا، لیکن میں جانتا تھا کہ میرے سیاسی حریف اور جمہوریت کے وہ مخالفین جن کا اسمبلیوں میں وجود نہیں ہے اور ہے تو وہ اقلیت میں ہے، ان کو کبھی کھل کھلنے کا موقع دیا گیا، تو وہ اس ملک کے ساتھ کیا نہیں کریں گے۔ ان کے 20 ماہ کے دورِ اقتدار کی کہانیاں ابھی تک عوام کی زبان پر ہیں۔ غیر آئینی نگران حکومت میں جس بے اصولی اور بے تابی سے شریک ہوئے، وہ بھی آپ کو یاد ہے۔ اگر میں دباؤ میں آ کر ملک کو ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا تو اپنی قومی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اس کے بعد کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ اپنے ملک کا مستقبل کس کے سپرد کرنا چاہتے ہیں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ وقت پاکستان کے لیے بہت نازک ہے۔ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ خطے میں اس وقت ایسے بنیادی فیصلے ہو رہے ہیں، جن کے اثرات صدیوں تک محسوس کیے جائیں گے۔ اگر ہم داخلی انتشار اور ابتری سے محفوظ نہ رہے اور ہمارے داخلی تنازعات کے دوران دوسروں نے ازخود یہ فیصلے کر لیے تو یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ فیصلے ہمارے خلاف نہیں ہوں گے۔

ان میں کشمیر کی قسمت کا فیصلہ، بوسنیا کے وجود کا فیصلہ، پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام کی بقا اور تسلسل کا فیصلہ ہے، نفاذ اسلام کے لیے کی گئی پیش قدمی کو غیر موثر کرنے کے حربے ہیں، افغانستان اور وسطی ایشیا سے پاکستان کے تعلقات کا مستقبل ہے۔ کیا ان میں کوئی بھی معاملہ عدم استحکام کے متحمل ہونے کی اجازت دیتا ہے، اس وقت جب اسرائیل ہمارے پڑوس میں متحرک ہونے لگا ہے، ہمیں استحکام کی ضرورت ہے۔ سیاسی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں بیرونی سرمایہ کاری پہلے ہی رک چکی ہے، ملکی سرمایہ کار خوف زدہ ہو گئے ہیں، دو صوبوں کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، انتظامی مشینری بے یقینی کا شکار ہونے لگی تھی، جانے پہچانے سیاسی طالع آزما ملک کو انتشار میں دھکیل دینے کے لیے سرگرم تھے۔ اگر میں اپنا اقتدار بچانے کے لیے محاذ آرائی اختیار کرتا تو پیشہ ور سیاست دانوں کو شاید کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن میرے اور آپ کے پاکستان کی حالت ضرور خراب ہو جاتی۔ ہم اس بری طرح سے داخلی بحران کا شکار ہوتے کہ اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا اور ہمارا یہ ملک اس خطے میں اور نہ اسلامی برادری میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل رہتا۔ ایک طرف تو اسلامی ملک قیادت کے لیے پاکستان کی طرف دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے یہ سیاسی طالع آزما یہ کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستانی خود اپنی قیادت سے بھی محروم ہو جائیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے عزیز ہم وطنو! سیاست میں مفاد پرستی اور بے اصولی پہلے بھی ہوتی رہی، مگر یہ حدیں آج پھلانگی جا رہی ہیں۔ اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کی سالمیت کا حلف لینے والے بھی میری دشمنی میں جمہوری نظام سے کھیلنے پر اتر آئے ہیں۔

اصل جھگڑا نہ تعلقات کار کا تھا، نہ صوبائی حکومتوں کی برطرفی اور بحالی کا..... بنیادی مسئلہ آئینی تضادات کا تھا۔ خرابی چند خواہشات کی پیدا کردہ ہے۔ اگر ذاتی خواہشات پر ذرا سا بھی قابو پا لیا جاتا تو مصنوعی سیاسی بحران کے غبارے سے ہوا نکل سکتی تھی۔ بے یقینی کی فضا ختم ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے تھوڑی سی نیک نیتی کی ضرورت تھی مگر اس نیک نیتی کے انتظار میں عوام کا صبر جواب دینے کا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر درست تھا مگر اسے کام کرنے سے روک دیا گیا۔ میں نے یہ سیاسی آئینی اور قانونی طریقہ آزمایا تا کہ بے یقینی کی حالت ختم کرنے کی راہ نکالوں، مگر میری راست فکری کو چال سمجھا گیا اور میری نیک نیتی کے جواب میں مخالفانہ سرگرمیاں تیز کر دی گئیں۔ میرے مخالفین سیاسی ذہنوں کی مدد سے غیر آئینی صوبائی حکومتوں پر اثر انداز ہونے لگے اور صوبائی انتظامیہ اور حکومتوں کو استعمال کر کے اپنے بحران کے دعوے کو سچ ثابت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عوام کا پیسہ عوام ہی کے خلاف استعمال ہونے لگا۔ کارکن فروخت کیے گئے۔ ایک فرضی احتجاج کی قیمت کروڑوں میں ادا کی گئی اور ہم سے بے وفائی کرنے والوں نے اپنے کارکنوں سے بے وفائی کرنے والوں کے ساتھ مل کر یہ کوشش کی کہ اگر نواز شریف کو کمزور نہیں کیا جا سکتا تو ملک کو ہی کمزور کر دیا جائے۔ ان لوگوں کا بس نہیں چلا ورنہ یہ وہ کچھ کرنے والے تھے کہ اپنے 38 دن کی نگران حکومت کو بھول جاتے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے 18 اپریل کو زرمبادلہ کے 23 ارب روپے کے ذخائر چھوڑے تھے۔ 38 دنوں میں ان کی مالیت گر کر صرف 9 ارب روپے ہو گئی تھی۔ میں ملکی معیشت کی اس حالت پر فکر مند تھا۔ اس لیے میں نے اپوزیشن کو افہام و تفہیم کی دعوت دی تا کہ پاکستان کو مزید نقصان سے بچایا جا سکے۔ مگر وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوئے۔ آئین، پارلیمنٹ اور عدلیہ کا ان کی نظر میں کوئی احترام نہیں۔ ریاست کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا انہیں کوئی احساس نہ تھا، اگر میں ان کی طرف معقول رویہ اختیار کرنے کا انتظار کرتا تو اس کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ انتظار کب ختم ہوگا۔ بے یقینی کی یہ کیفیت نہ تو زیادہ عرصہ برداشت کی جا سکتی تھی اور نہ ہی انہیں برداشت کرنا چاہیے۔ میں پورے یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض مایوس اشخاص اور ان کا ساتھ دینے والے کچھ سیاسی لاوارث پاکسان میں جمہوری نظام کا خاتمہ کرنے کے لیے سرگرم تھے۔ اگر اب تک یہ نظام محفوظ ہے تو اس کا سہرا صرف اور صرف جمہوریت پسند عوام کے سر ہے۔ جن کے بارے میں ہر ایک کو یقین ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں غیر جمہوری نظام کو قبول نہیں کریں گے اور موجودہ صدی کی اس دہائی میں، جب عوام مزاحمت کا فیصلہ کر لیں، تو پھر ان پر بڑی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بڑی طاقت بھی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتی۔

جمہوری نظام کی بقا میں دوسرا اہم کردار پارلیمنٹ اور عدلیہ کا ہے، جس پر میں قوم کی طرف سے انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ میرے عزیز ہم وطنو! ایک طرف مایوسیاں اور ناکامیاں ہیں، تو دوسری طرف ایک پرامید مستقبل اور کامیابی کی نوید۔ ہم 1990ء کے انتخابات کے فوری بعد اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے تھے، لیکن ہمیں دوبارہ گھیر کر ایسے موڑ پر پہنچا دیا گیا، جہاں انتشار کو جانے والی راہیں سامنے آ گئی تھیں ایک مرتبہ پھر اس سے بچ کر نکلنا ہے اور وہ کچھ بھی بچانا ہے جو ہم نے مل کر تعمیر کیا ہے۔ معاملہ صرف سیاست، سیاست اور اقتدار کا نہیں، ہمارے روایتی دشمن کے خفیہ ہاتھ پاکستان کی سلامتی کی طرف بڑھ رہے ہیں، ریاست کو مضبوط کرنے والے ان اداروں کو، جو بفضل خدا اس وقت تک قائم ہیں، انہیں مسمار کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ آپ نے ہمیں 1995ء تک خدمت کا موقع دیا ہے۔ میں چاہتا تو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے سمجھوتا کر سکتا تھا، لیکن میں نے پھر اقتدار پر ملک و قوم کے مفاد کو ترجیح دی ہے۔ پہلے جب جوڑ توڑ کے ذریعے تعمیر و ترقی کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی، تو میں نے اقتدار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زنجیریں توڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی پاداش میں مجھے اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ اقتدار چھوڑنے کے بعد میرا ضمیر مطمئن تھا کہ میں نے سر آواز پر لبیک کہا اور جب میں نے عوام اور عدلیہ کے فیصلے کے نتیجے میں دوبارہ ذمہ داریاں سنبھالیں تو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ان اداروں کو تباہ کرنے کی سازش شروع کر دی گئی، جو آئین اور جمہوری نظام کے محافظ تھے۔ جب ہر ادارے کو تباہ کیا جانے لگا تو سب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے ملک بچانے کی فکر ہوئی۔ میرے مخالفین قوم کو ایک تاریک اور بند گلی میں دھکیل کر اس پر جمہوریت کے دروازے بند کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ہمیں یہ راستہ کھلا رکھنے کے لیے آگے بڑھنا پڑا، کیوں کہ اب پاکستان کی بقا کا انحصار جمہوریت پر ہے۔ جمہوریت ہے تو پاکستان ہے، پاکستان قائم ہے تو ہم سب کا وجود باقی ہے۔ خدانخواستہ اس پر آنچ آئی تو پھر کہاں کی جمہوریت اور کہاں کا اقتدار؟

میرے عزیز ہم وطنو!

میں آپ کے جذبات سے واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ بار بار کے الیکشن سے تنگ آ چکے ہیں۔ میں نے جب آپ کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ملک کو انتشار اور بے یقینی کی کیفیتوں سے نکالنے کی خاطر استحکام کی بات کی تو مجھ پر انتخابات سے بھاگنے کا الزام لگایا گیا، یہ سیاسی لاوارث ایک ہی بات دہرانے لگے کہ فوراً انتخابات کرائے جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں اقتدار سے چپکا رہوں گا اور یہ انتشار پھیلاتے رہیں گے۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ جمہوری نظام کی جڑیں مضبوط ہیں تو میں آپ کی تائید اور اللہ کے فضل و کرم سے ان کا ہر میدان میں مقابلہ کرتا۔ ان میں سے کسی کو مجال نہیں تھی کہ 1995ء تک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کی منتخب حکومت کو ذرا سا بھی ہلا سکتا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ جمہوری نظام کی جڑیں اتنی مضبوط نہیں کہ سازشوں کو مزید برداشت کر سکیں۔ پاکستان سیاسی، معاشی اور عالمی صورتِ حال کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں کہ جمہوری نظام کا صدمہ برداشت کر سکے۔ ہمیں پاکستان کو بچانا ہے تو اس کے خلاف سازشوں کو ناکام بنانا ہے۔ میرے عزیز ہم وطنو! پاکستان کے خلاف سازشوں کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی تھی جب یہاں انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی سازش کی گئی۔ 1970ء میں انتخابات اتنے منصفانہ تھے کہ مخالفین بھی ان پر اعتراض نہ کر سکے، لیکن اقلیتی پارٹی نے اکثریت کا حق اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک کو توڑ کر باقی ماندہ حصے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ 1977ء میں برسرِ اقتدار پارٹی کو خود انتخابات کرانے کا موقع ملا، تو اس میں دھاندلی سے اکثریت کی تائید رکھنے والوں کو نشستیں لینے سے محروم کر دیا گیا، جس پر ساری قوم سراپا احتجاج بن گئی اور جعلی اسمبلیاں ماننے سے انکار کر دیا۔ 1985ء میں اسی پارٹی نے انتخابات کے عمل میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور اسمبلیوں کو تسلیم نہیں کیا۔ 1988ء میں بھی دھاندلی کا الزام لگایا گیا لیکن جب اقتدار مل گیا تو انہی اسمبلیوں کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ ان کی برطرفی پر یہ لوگ سراپا احتجاج بن گئے۔ 1990ء میں انہوں نے پورے زور و شور سے انتخابات میں حصہ لیا مگر جب عوام نے ان کی بیس ماہ کی کارکردگی دیکھتے ہوئے انہیں شکست سے دوچار کیا تو انہوں نے پھر انتخابی نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس ریکارڈ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں انتخابات اور جمہوریت پر کتنا یقین ہے۔ جس پارٹی نے ایک مرتبہ بھی انتخابی نتائج تسلیم نہ کیے ہوں، اسے جمہوریت اور انتخابات کے نعرے زیب نہیں دیتے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ انتخابات کا نعرہ محض اس لیے لگاتے ہیں کہ کوئی نظام کامیابی کے ساتھ نہ چل سکے۔ کوئی حکومت تعمیر و ترقی کے کام کر کے مستحکم نہ ہو سکے اور جب یہ خود برسرِ اقتدار ہوں، دھاندلی کے کتنے ہی ریکارڈ کیوں نہ قائم کرنے پڑیں، کسی دوسری پارٹی کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ میرے عزیز ہم وطنو! اپنے اعمال کے لیے وہ جواب دہ ہیں اور میں اپنے قول و فعل کے لیے۔ گزشتہ پونے تین سال کے دوران آپ نے مجھے آزما لیا ہے، منافقت مجھے نہیں آتی، پیشہ ور سیاست دانوں کی طرح تقریروں کے جادو جگا کر سادہ لوح عوام کو دھوکا میں نہیں دے سکتا۔ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشیں میرے مزاج کے خلاف ہیں، اگر میں ایسا کر سکتا تو مخالفین کو ان کی خواہشیں پوری کر کے، اپنے ساتھ ملا چکا ہوتا اور یقین جانئے کہ ایسی بہت سی خواہشیں مجھ تک پہنچائی جاتی رہیں، لیکن مجھے اس قسم کی سیاست سے نفرت ہے، میں صرف کام پر یقین رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ بڑے بڑے دعوے کرنے کی بجائے خاموشی سے عملی کام کرتا رہوں اور نتائج حاصل کر کے دکھاؤں تا کہ میری کارکردگی کی گواہی آپ خود دیں۔ میرے عزیز ہم وطنو! یہ میری خوش نصیبی ہے، کہ جتنا کچھ میں اس تھوڑے سے عرصے میں آپ کے لیے کر سکا، آپ نے اس کی قدر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فزائی کی، لیکن اگر آپ کو یہ پتا چل جائے کہ مجھے یہ سب کچھ کرنے کے لیے کس قسم کے حالات سے گزرنا پڑا، تو آپ رنج اور حیرت میں ڈوب جائیں گے۔ میں نے اپنی ذات اور اپنے خاندان پر الزامات برداشت کیے۔ مجھے بے لوث خدمت کا صلہ یہ دیا گیا کہ اڑتیس دنوں کی غیر آئینی حکومت میں ریڈیو اور ٹی وی پر میری کردار کشی کی مہم چلائی گئی، لیکن میں نے یہ کام نہیں کیا، نہ پہلے نہ اب۔ میں نے جو کام غریبوں کی فلاح اور ملک کی سربلندی کے لیے کیے، ان میں قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالی گئیں اور مجھے ایسے ایسے طریقوں سے تنگ کیا گیا جیسے کہ غریبوں کی خدمت کے منصوبے بنا کر میں نے کوئی جرم کیا ہے۔

میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ملک کی معیشت کو تباہ کرنے کی ٹھان لی گئی تھی اور معیشت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ صوبوں کو وفاق کے خلاف اکسایا جانے لگا تو میں نے سیاست کے اس گندے کھیل میں فریق نہ بننے کا فیصلہ کر لیا، کیوں کہ میں اپنے آئینی حقوق اور اختیارات پر اصرار کرتا تو یہ لوگ وفاق پاکستان کو نقصان پہنچانے کی راہ پر چل نکلے تھے۔ اس وقت میں نے طے کر لیا کہ اب انہیں عوام کی عدالت میں پیش کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا اور میں نے طے کر لیا کہ انتخابی میدان میں ان کا سامنا کیا جائے۔ یہ لوگ محض جمہوری عمل میں رخنہ اندازی کے لیے انتخابات کے مطالبات کرتے تھے۔ جن لوگوں نے کبھی زندگی میں ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہیں کی تھی، وہ بھی آگے بڑھ بڑھ کر مجھے انتخابات کا چیلنج دینے لگے تھے، آج میں ان کا یہ چیلنج قبول کرتا ہوں، اب وہ قوم کے سامنے آئیں اور یہ ثابت کریں کہ اپنے انتخابات کے مطالبے میں وہ کس قدر مخلص تھے۔ مجھے امید ہے کہ اب یہ لوگ انتخابی میدان میں راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

انتخابی میدان میں اترنے کا یہ فیصلہ میں نے کسی دباؤ کے تحت نہیں کیا۔ مجھ پر اگر کوئی دباؤ ہے تو صرف ملک اور قوم کے مفادات کا دباؤ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کسی خوف کی بنا پر نہیں کیا، اگر مجھے کوئی خوف ہے تو خدا کا خوف ہے میں نے یہ فیصلہ اقتدار کی خاطر بھی نہیں کیا کیونکہ مجھے صرف اقتدار مطلوب ہوتا تو یہ میرے پاس اس وقت بھی موجود ہے۔ میں سیاست میں ایک مشن لے کر آیا ہوں اور یہ مشن ہے پاکستان سے بے روزگاری کا خاتمہ، پاکستان سے جہالت کا خاتمہ، پاکستان سے غربت کا خاتمہ، پاکستان سے لاقانونیت کا خاتمہ، پاکستان سے ظلم کا خاتمہ، پاکستان سے منشیات کا خاتمہ، پاکستان سے کلاشن کوف کلچر کا خاتمہ، پاکستان سے منافقت کا خاتمہ، جمہوری نظام اور وفاقِ پاکستان کو نقصان پہنچانے کا ہر راستہ بند کر دیا جائے گا۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین ہے تو پھر میں آپ سے مطالبہ کروں گا کہ اس بار انتخابات میں آپ مجھے انتہائی سے بھی کہیں زیادہ اکثریت کے ساتھ کامیاب کرائیں، تاکہ جن آئینی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان ایک منتخب اور جائز حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں، انہیں دُور کیا جا سکے۔ اب میں صرف انتخابات میں کامیاب ہونے کے لیے آپ کے پاس نہیں آ رہا بلکہ نظام میں فیصلہ کن تبدیلی کی غرض سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں اور یہی تبدیلی آپ بھی چاہتے ہیں۔

میرے عزیز ہم وطنو! مجھ سے اسی سال اکتوبر، نومبر میں انتخابات کا مطالبہ کیا گیا تھا اور میں نے جب اسمبلی کی مدت پوری کرنے پر اصرار کیا تو مطالبہ اور زیادہ زور و شور کے ساتھ دہرایا جانے لگا اور یہ لوگ سمجھے کہ میں انتخابات سے گریز کر رہا ہوں۔ میں نے انتخابات کو آگے لے جانے کے لیے کہا تو یہ لوگ مزید ضد کرنے لگے کہ انتخابات کو اکتوبر سے آگے نہیں جانے دیں گے۔ وہ اکتوبر پر کیوں اڑے ہوئے تھے، یہ راز آپ کو بھی معلوم ہے اور میں بھی اس سے باخبر ہوں، اب وقت بتائے گا کہ سازشوں اور چالبازیوں کی سیاست کامیاب رہی یا کھل کر عوام کے سامنے پیش ہونے کی صاف ستھری سیاست۔ یہ اکتوبر سے آگے نہیں جانے دیں گے۔ یہ اکتوبر سے آگے نہیں جا رہے تھے۔ اب میں نے اکتوبر ہی میں انتخابات کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرے عزیز ہم وطنو! آپ نے مجھے 1990ء میں جس بھرپور اعتماد سے نوازا، اس پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق پوری کوشش کی کہ آپ کی خواہشوں اور امنگوں کے مطابق وطن عزیز کو تعمیر، ترقی اور خوش حالی کی راہ پر چلاؤں۔ مجھے کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں اور بعض جگہ مجبوریوں نے میرا دامن بھی تھام لیا۔ میری حکومت کی ناجائز برطرفی پر آپ نے جس والہانہ محبت کا مظاہرہ کیا، وہ میری زندگی کی سب سے عزیز ترین متاع ہے۔

میں اپنی باقی عمر بھی آپ کی محبتوں کا قرض چکانے میں گزار دوں تو میں یہ قرض نہیں چکا سکوں گا اور اگر آپ نے مجھے دوبارہ خدمت کا موقع دیا تو انشاء اللہ جس حد تک ممکن ہو سکے گا، آپ مجھے اس قرض کو اتارتے ہوئے دیکھیں گے۔ وطن کی محبت کا قرض، بوڑھے، نوجوانوں، ماؤں، بہنوں کی دعاؤں، ان آنسوؤں کا قرض جو مجھ سے اظہارِ ہمدردی کے لیے بہائے گئے، ان نوافل کا قرض جو مجھے وزیراعظم کے منصب پر دوبارہ واپس لانے کے لیے ادا کیے گئے۔ آج میں آپ کی دعاؤں اور آنسوؤں سے مہکا ہوا محبت کا ہر تحفہ اپنے سینے سے لگائے اقتدار کی کرسی کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اگر یہ ذمہ داری دوبارہ میرے نصیب میں لکھی ہے تو پھر یہ میری ذات کے لیے نہ ہو، بلکہ یہ ملک اور قوم کے لیے ہو، غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہو اور پاکستان کی سربلندی کے لیے ہو اور میں اپنے آپ کو فلاحی، ترقیاتی اور خلق خدا کے جائز کاموں کے لیے بھی مجبور اور بے بس محسوس نہ کروں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیں پہلے سے بھی زیادہ بھرپور مینڈیٹ سے نوازیں گے۔ مجھے یہ اعتماد اور یقین آپ کی سنجیدہ فکر اور محبت نے بخشا ہے۔ یہ محبت مجھے اس لیے بھی حاصل ہے کہ میں پاکستان کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے خوابوں کی تعبیر بنا کر ایک ترقی یافتہ اسلامی، جمہوری اور فلاحی مملکت کی حیثیت سے قوموں کی برادری میں سربلند کرنے کا پختہ عزم رکھتا ہوں۔ ملک میں اسلامی نظام، انصاف اور مساوات کا قیام میری اوّلین ترجیح ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عزیز ہم وطنو! آج کی تقریر کے بعد ہماری ملاقاتیں انشاء اللہ انتخابی جلسوں میں ہوں گی۔ اس موقع پر میں ان تمام ارکان قومی وصوبائی اسمبلی اور سینٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جو ہر خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر آزمائش کے وقت میرے ساتھ کھڑے رہے۔ میں اپنی کابینہ کے ان ساتھیوں کا بھی ممنون احسان ہوں جو قدم قدم پر میرے لیے حوصلے اور تقویت کا باعث بنے۔ میں ان تمام محترم علمائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے سیاسی کشیدگی ختم کرنے کے لیے انتہائی پرخلوص کوششیں کیں۔ ان کی شفقت اور محبت ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں ان مشائخ عظام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی دعائیں میرے ساتھ رہیں۔ میں پاکستان کی مسلح افواج کو بھی خراج تحسین پیش کرتا ہوں، جنہوں نے انتشار اور عدم استحکام کے سارے پراپیگنڈے کو ٹھکرا دیا اور تحمل اور برداشت سے کام لے کر آئینی تبدیلی کو ممکن بنایا اور ملک وقوم کو عدم استحکام سے بچانے کے لیے اپنا کردار پیشہ وارانہ وقار کے ساتھ ادا کیا۔ میں پاکستان کے قومی پریس کو بھی دل کی گہرائیوں سے خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ عدلیہ اور وکلا صاحبان کو انصاف کی اعلیٰ ترین روایات قائم کرنے پر سلام پیش کرتا ہوں۔ میں وفاق اور چاروں صوبوں کی انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے تمام فرض شناس افسروں اور اہلکاروں کا بھی شکر گزار ہوں۔ میں وزیراعظم ہاؤس اور وزیراعظم سیکرٹریٹ کے تمام افسروں اور اہلکاروں کا نجی طور پر ممنون ہوں۔ ان کی محبت نے مجھے عوام سے دوری کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا۔ آیئے اب ایک نئے عزم، نئے ارادے اور ایک نئے جذبے کے ساتھ پاکستان کی تعمیر کے لیے انتخابات کی طرف بڑھیں۔ جن لوگوں کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہے، وہ آئین سے لے کر عدلیہ تک اور صوبائی اسمبلیوں سے لے کر پارلیمنٹ تک ہر جگہ اپنا مقدمہ ہارتے آئے ہیں اور انشاء اللہ اب بھی فتح جمہوریت کی ہوگی۔ فتح شرافت کی ہوگی۔ فتح حق کی ہوگی۔ فتح پاکستان کی ہوگی اور آخری فتح انشاء اللہ آپ کی ہوگی۔

میرے عزیز ہم وطنو! آج آپ قومی تاریخ میں ایک منفرد واقعہ کے گواہ بن رہے ہیں۔ آج ایک وزیراعظم پہلی مرتبہ اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ ایوانِ اقتدار کو خیرباد کہہ رہا ہے، اللہ کے فضل وکرم سے قومی اسمبلی میں میری اکثریت ختم نہ کی جا سکی۔ پارلیمنٹ میں میری اکثریت قائم ہے۔ اپوزیشن میرے خلاف کوئی تحریک نہ چلا سکی۔ اس کا ایک لانگ مارچ ناکامی سے دوچار ہوا اور دوسرا ناکامی کے خوف سے اسے خود ختم کرنا پڑا۔ میرے خلاف کوئی مظاہرہ یا ہڑتال نہ کرائی جا سکی۔ عدالت عظمیٰ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے سرخ رو کیا۔ عوام نے خیبر سے کراچی تک میرا ساتھ دیا۔ جمہوری اور پارلیمانی اصولوں اور روایات کے تحت مجھے مزید ڈھائی سال تک اقتدار میں رہنے کا حق حاصل ہے مگر میں پھر بھی کرسی چھوڑ رہا ہوں۔ مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں ہے۔ مجبور ہو کر کرسی چھوڑنے والے کو اتنی مہلت کوئی نہیں دیتا کہ وہ اپنی دستبرداری کا اعلان ٹیلی ویژن سے خود کرے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں وزیراعظم کی کرسی ہمیشہ خالی کرائی گئی۔ کسی نے یہ کرسی چھوڑنے کا ازخود فیصلہ نہیں کیا۔ یہ عزت اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خادم کے نصیب میں لکھی کہ کرسی چھوڑنے کا فیصلہ بھی میں نے خود کیا اور اس کا اعلان بھی آپ کے سامنے خود کر رہا ہوں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ یہ کرسی بہت مضبوط ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ انسان کا ایمان اس کرسی سے زیادہ مضبوط ہے۔ ایمان مضبوط ہو تو کرسی کا حاصل کرنا اور چھوڑنا زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہتا۔ لیکن دل میں قوم اور وطن سے محبت ہو تو پھر یہ کرسی نصب العین کے حصول کی خاطر استعمال ہونے والی ایک معمولی چیز بن کر رہ جاتی ہے اور جب یہ اس ملک کی نہ رہے تو اسے چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ یہ کرسی اب صرف میری ذات کے لیے رہ گئی تھی۔ آپ کی خوش حالی، ترقی، فلاح و بہبود کے لیے ہونے والے کام مشکل ہو گئے تھے۔ میں چاہتا تو مزید اڑھائی سال اس کرسی پر بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن جب یہ آپ کے کام نہیں آ سکتی تو میرے کس کام کی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

خدا حافظ

پاکستان پائندہ باد!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلام اسحاق خان کا قوم سے خطاب

18 جولائی 1993ء

میرے عزیز ہم وطنو!

السلام علیکم!

جیسا کہ آپ کے علم میں آ چکا ہوگا کہ آج وزیراعظم کے مشورے پر آئین کی دفعہ 58 ذیلی دفعہ (۱) کے تحت آئینی تقاضوں کے عین مطابق قومی اسمبلی توڑنے کا صدارتی فرمان جاری کر دیا ہے۔ یوں ایک بار پھر عوام کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آزادانہ طور پر اپنا حق رائے دہی استعمال کرتے ہوئے جمہوری نظام کو چلانے کے لیے نئی قیادت کا انتخاب کریں۔ قومی اسمبلی کے لیے عام انتخابات اس سال 9 اکتوبر کو منعقد ہوں گے۔ انتخابی عمل کو شفاف، غیر جانب دارانہ، منصفانہ اور ہر ایک کے لیے قابل قبول اور شکوک و شبہات سے بالاتر بنانے کی خاطر مرکز اور صوبوں میں غیر سیاسی، غیر متنازع اور غیر جانب دار افراد پر مشتمل نگران حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ مرکز اور صوبوں میں قائم کی جانے والی نگران حکومتوں میں جو افراد شامل کیے جا رہے ہیں وہ آنے والے انتخابات میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہوں گے اور معمول کے فرائض منصبی کے علاوہ ان کی اوّلین ذمہ داری یہ ہوگی کہ پرامن ماحول میں آزادانہ، غیر جانب دارانہ اور منصفانہ انتخابات کو یقینی بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اصحاب اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اس بنیادی فرض سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوں گے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نے صدارت کے منصب سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ آئین کی دفعہ 44 ذیلی دفعہ (3) کے تحت میں رضا کارانہ طور پر مستعفی ہونے کے بعد پریذیڈنٹس سیلری الاؤنس اینڈ پریولجز ایکٹ 1975ء کی شق 12 کی رو سے آج سے چار ماہ کی رخصت پر جا رہا ہوں۔ اس کے مطابق سینیٹ کے چیئرمین جناب وسیم سجاد قائم مقام صدر کے طور پر اس وقت تک اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہیں گے جب تک کہ عام انتخابات کے بعد نئے صدر کا انتخاب نہیں ہو جاتا۔ عزیز ہم وطنو! یہ سارے فیصلے ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تفصیلی اور طویل اعلیٰ سطحی مذاکرات کے نتیجے میں اتفاق رائے سے طے پائے ہیں جو گزشتہ کئی روز سے جاری تھے۔ ان مذاکرات میں اوروں کے علاوہ پاک فوج کی قیادت نے ایک بہت ہی مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا۔ ہماری سیاسی تاریخ میں بحران کے دنوں میں فوج کا کردار ایک مخصوص انداز کا رہا ہے۔ مگر اس بار سابقہ انداز سے ہٹ کر فوج نے جس طرح جمہوریت کی بقا کی خاطر اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔ قوم اس کے لیے ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔ آپ اس شدید سیاسی بحران سے اچھی طرح واقف ہیں، جو گزشتہ کئی ماہ سے ملک میں پایا جا رہا تھا اور جس کے نتیجے میں قوم اعصاب شکن بے یقینی اور اضطراب کی زد میں تھی۔ میں نے اس بحران کے حل کے لیے آئین اور قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر وہ کوشش کی جو میرے اختیار میں تھی لیکن سیاسی مصلحتوں اور باہمی اعتماد کے فقدان کے ماحول میں وہ کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔ اس سارے عرصے میں میرا نکتہ نظر یہی رہا کہ اس بحران کو حل کرنے کی بہترین اور غالباً واحد صورت یہی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے حقیقی وارثوں، یعنی عوام سے رجوع کیا جائے۔ 18 اپریل کو قومی اسمبلی کی تحلیل درحقیقت سیاسی بحران کو انتخابات کے ذریعے سیاسی طریقے سے حل کرنے کی خواہش اور کوشش ہی کی آئینہ دار تھی۔

بہرحال عدالت عظمیٰ نے جو آئین کی تشریح و توضیح پر مامور ہے، میری رائے سے اتفاق نہیں کیا اور میں نے جو قانون کے احترام کو ایمان کا درجہ دیتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح عدالت کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تمام فریق بحران کے اسی حل کو موثر اور قابل عمل تصور کرتے ہیں، جو میں نے تجویز کیا تھا۔ اس دوران جو کچھ ہوتا رہا، میں نہ اس کی تفصیل میں جاؤں گا نہ اس پر تبصرہ کروں گا۔ آپ خود گواہ ہیں کہ بحران کس طرح روز بہ روز شدید تر اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور کس طرح عوام کے ذہنوں میں جمہوری نظام کے مستقبل کے بارے میں مایوس کن خدشات جنم لینے لگے۔ بحران کی ذمہ داری کا صحیح تعین تاریخ کرے گی۔ آج سیاسی تعصبات کے ماحول میں یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ کوئی صائب رائے قائم کی جا سکے۔ بہرحال میرے علم میں ہے کہ عوام میں وسیع پیمانے پر میرے مورد الزام ہونے کا تاثر پھیلایا گیا اور ہر کردہ اور ناکردہ گناہ میرے نام لکھا گیا اور ایسا کرتے وقت آئین اور قانون کی مکمل پاسداری کے میرے اس ریکارڈ کو یکسر بھلا دیا گیا، جس کی گواہی میری پوری زندگی دیتی ہے۔ نصف صدی پر پھیلی ہوئی ان بے لوث قومی خدمات کو بھی فراموش کر دیا گیا، جو میں نے کبھی بھی، کسی بھی قسم کا کوئی بھی ذاتی فائدہ اٹھائے بغیر انجام دیں۔ وہ ان تھک کوششیں بھی یاد نہ رہیں جو اگست 1988ء کے بعد سے سخت آزمائشوں اور دباؤ میں ملک میں جمہوریت کے قیام، بقا اور استحکام اور وطن عزیز کی آزادی، خودمختاری، سالمیت اور ترقی کے لیے کرتا رہا ہوں، مگر مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس عاشقی میں عزت سادات جانا کوئی نئی بات نہیں۔ اطمینان ہے تو اس بات کا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ع ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت!

میں ایک حادثے کے نتیجے میں ایوانِ صدارت تک پہنچا تھا اور انتخابات کے نتیجے میں وہاں رہا۔ میرا وہاں جانا قومی خدمت کے جذبے کے تحت، میرا وہاں قیام، اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ قومی مفادات کی حفاظت میں گزرا اور آج قوم و ملک کے مفاد ہی میں، میں وہاں سے رخصت ہو رہا ہوں۔

جب بحران کو حل کرنے کی کوشش کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ میری ذات کو کچھ لوگوں کی دانست میں راستے کا پتھر سمجھا جا رہا ہے تو میں نے فوری طور پر اور پورے خلوص کے ساتھ ملک کے متعدد محترم اور معتبر علمائے کرام کی موجودگی میں اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر منظر سے ہٹانے کی پیشکش کی۔ بشرطیکہ میرے اس ایثار سے انتخابات کی راہ ہموار ہو سکے۔ میں نے زندگی بھر کسی کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ میری اس فطرت کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جو اندرونی اور بیرونی معاملات میں میرے اصولی مؤقف سے واقف ہے۔ موجودہ فیصلہ بھی میرا اپنا فیصلہ ہے۔ یہ فیصلہ میں نے صرف اور صرف ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں اور جمہوری نظام کے استحکام کی خاطر کیا ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ کہنے والے کچھ بھی کہیں، میرے ذہن میں کبھی کسی سازش کے جالے رہے ہیں، نہ میرے ہاتھوں پر بھی کسی تخریب کے دھبے۔ میں نے تو کبھی اپنے خلاف لگائے جانے والے نازیبا ترین الزامات کا جواب تک نہیں دیا حالانکہ میں چاہتا تو بہت سے پردہ نشینوں کے کرتوت طشت از بام کر سکتا تھا اور بہر حال مجھے یقین ہے کہ جب الزام تراشیوں کی گرد بیٹھ جائے گی۔ جب سیاسی تعصبات کا غبار چھٹ جائے گا تو تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا، حال کو مسخ کیا جا سکتا ہے مگر جب حال ماضی بن کر تاریخ کے سینے میں اترتا ہے تو اس کے صحیح خدوخال ضرور اجاگر ہو کر رہتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ پاک ذات، جو نیتوں کا حال اور دلوں کے بھید جانتی ہے، میرے ہر اقدام کے پیچھے کارفرما خلوص نیت کی گواہ ہے اور مجھے اس کے سوا اور کسی گواہی کی ضرورت نہیں۔ میری دعا ہے کہ خدائے لم یزل پاکستان پر اپنی رحمتیں سایہ فگن رکھے، اسے ہر آفت اور ہر بحران سے محفوظ رکھے اور اس کے عوام اور قائدین کو اس کی حفاظت اور خدمت کی توفیق دے۔ خدا اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے میں ہم میں سے ہر ایک کو یہ شعور بخشے کہ دین و ملک کی خدمت ہی میں بڑائی ہے۔ عظمت کی تلاش کا ہر دوسرا راستہ تباہی کا راستہ ہے۔

اللہ تعالیٰ پاکستان کا حامی و ناصر ہو۔

پاکستان پائندہ باد!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدر فاروق خان لغاری کا اعلامیہ

4 نومبر 1996ء رات ڈیڑھ بجے

صدارتی اعلامیہ۔

گزشتہ تین برس کے دوران کراچی اور پاکستان کے دوسرے حصوں کے ہزاروں پاکستانیوں کی آرٹیکل 59 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ بہت سے لوگوں کو پولیس مقابلوں اور پولیس کی تحویل میں ہلاک کیا گیا۔ 29 اکتوبر 1995ء کو پارلیمنٹ سے خطاب میں صدر نے خبردار کیا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو یہ امر یقینی بنانا چاہیے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بے گناہ شہریوں کو ہراساں نہیں کیا جانا چاہیے اور تمام افراد کے انسانی و قانونی حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے لیکن اس مشورے پر توجہ نہیں دی گئی اور ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا حکومت کا بنیادی فرض قانونی طریقہ سے امن و امان برقرار رکھنا، جن جماعتوں پر مشتمل حکومت قائم ہے ان ہی جماعتوں کی سندھ، پشاور سرحد میں بھی حکومت ہے لیکن وفاقی یا کسی صوبے کی حکومت کی جانب سے ایسی کوئی بامقصد کوشش نہیں کی گئی کہ ماورائے عدالت ہلاکتوں کا خاتمہ ہو سکے جو اسلام اور شہری اقدار کے منافی ہے۔ ان ماورائے عدالت ہلاکتوں کی مناسب تحقیقات کو یقینی بنانے اور ان جرائم کے ذمہ دار افراد کو سزا دینے کی بجائے حکومت نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ اس طریقے سے امن و امان کی صورت حال کنٹرول میں لی گئی، ان ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ حکومتی ارکان میں حکمران جماعت کے ارکان شامل ہیں کی جانب سے وفاقی اور صوبائی سطح پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افسروں اور عملہ کی تقرریاں اور ٹرانسفر کے بڑے پیمانے پر مداخلت ہوتی رہی جس کی وجہ سے عوام کا قانون نفاذ کرنے والے اداروں اور عوام سے جان و مال اور شہری آزادی کے تحفظ کے بارے میں اعتماد ختم ہوا۔ 20 ستمبر 1996ء کو وزیراعظم کے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں سات ساتھیوں کے ہمراہ پولیس مقابلے میں قتل کر دیا گیا جس میں ایک سابق وزیراعظم کا بہنوئی شامل ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وزیراعظم اوران کی حکومت نے دعویٰ کیا کہ میر مرتضیٰ بھٹو کو سازش کے تحت قتل کیا گیا اور مرتضیٰ کی موت کے چند دن بعد وزیراعظم نے ٹیلی ویژن پر آ کر یہ واضح اشارے دیئے کہ ایوانِ صدر اور ریاستی ایجنسیاں اس سازش میں شریک ہیں اور یہ کینہ پرور اشارے جو مختلف مواقع پر دہرائے گئے بغیر کسی بنیاد کے تھے جب کہ وزیراعظم مسلسل تردید بھی کرتی رہیں کہ ایوان صدر یا مسلح افواج اس سازش میں ملوث ہیں۔ اس مرحلہ میں مرتضیٰ بھٹو کی بیوہ غنویٰ اوران کی پارٹی کے عہدے داروں نے حکومتی وزرا پر قتل کے الزام لگائے جن میں وزیراعظم کے شوہر آصف زرداری، وزیراعلیٰ سندھ، آئی بی کے ڈائریکٹر اور دوسرے اعلیٰ حکومتی عہدیدار شامل ہیں جب کہ وزیراعظم کی ذات پر بھی مرتضیٰ کے قتل کا الزام لگایا گیا، ان حالات میں ایک اسلامی معاشرے میں کسی کو انصاف کی یقین دہانی نہیں کرائی جاسکتی کیوں کہ طاقت ور صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے ارکان پر جرائم، دباؤ ڈالنے اور قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کو کنٹرول کرنے کے الزامات لگائے جارہے تھے اور جب 20 مارچ 1996ء کو سپریم کورٹ نے ججوں کی تقرری کے بارے میں فیصلہ دیا تو بے نظیر بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس فیصلے کا تمسخر اڑایا جو ٹیلی ویژن پر کئی بار دکھایا گیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ پر عمل درآمد کی راہ میں رکاوٹ ڈالی، بعد میں تاخیری حربے استعمال کر کے آئینی حقوق کی خلاف ورزی کی گئی جس کا سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق ملک بھر سے انتظامی اور عدالتی عہدے داروں پر عمل درآمد ہونا چاہیے تھا۔

سپریم کورٹ کی ہدایت کے باوجود ہائی کورٹ کے ججوں کو مستقل کرنے اور ججوں کی برطرفی کے فیصلے پر جان بوجھ کر 30 ستمبر کو 6 ماہ اور دس دن کے بعد عمل درآمد کیا گیا اور یہ صرف صدر کی طرف سے وزیراعظم کی اس اطلاع کے بعد کیا گیا کہ اس مشورے پر عمل نہ کیا گیا تو صدر اس سلسلہ میں خود آئینی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ حکومت نے نہ صرف اس معاملہ میں آئین کے آرٹیکل 190 کی خلاف ورزی کی بلکہ آرٹیکل A2 کے تحت عدلیہ کو دی گئی آزادی کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ میں کرپشن کے خاتمہ کے بل کی آڑ میں ملک کی عدلیہ پر حملے جاری رکھے گئے اور اس بل کو کابینہ کی منظوری کے بعد آئین کے آرٹیکل 46 سی کے تحت صدر کو اطلاع دیئے بغیر اسمبلی میں پیش کر دیا گیا۔ اسمبلی میں 5 فیصد ارکان یعنی 32 ارکان اسمبلی کے ذریعے تحریک پیش کی گئی جس کے تحت سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے کسی جج کو زبردستی چھٹی پر بھیجا جاسکتا ہے اور یہ خصوصی کمیٹی کا تقرر کردہ خصوصی پراسیکیوٹر پر رائے قائم کرتا ہے کہ کوئی جج غلط طرزِ عمل کا مرتکب ہوا ہے تو خصوصی کمیٹی کی اس رائے کو قومی اسمبلی میں پیش کر کے عدم اعتماد کے ذریعے جج کو برطرف کیا جاسکتا ہے۔ کابینہ نے آئین کے آرٹیکل 2 اے کے تحت عدلیہ کو دی گئی آزادی کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کو پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت بھی حاصل نہیں اور اپوزیشن نے کابینہ کی طرف سے منظور کردہ بل کی کھل کر مخالفت کی ہے اور حکومت کی طرف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ایسے بل پر اصرار جو نہ صرف اعلیٰ عدالتوں کو خفت پہنچانے کے لیے تیار کیا گیا بلکہ احتساب اور کرپشن کے خاتمہ کے لیے صدر کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات کو مکمل طور پر ناکام بنانا ہے۔

عدلیہ کو تا حال انتظامیہ سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کیا گیا جو آئین کے آرٹیکل 157(3) اور سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف سے مقرر کردہ ڈیڈ لائن کی خلاف ورزی ہے۔ وزیر اعظم اور ان کی حکومت نے آئین کے آرٹیکل 14 کے تحت تحفظ دیئے گئے خلوت (یا پرائیویسی) کے بنیادی حقوق کی دانستہ خلاف ورزی کی۔ یہ خلاف ورزیاں ٹیلی فون ٹیپ کر کے جاسوسی کے ذریعے کی گئیں اس غیر آئینی طریقہ کے ذریعے جو ٹیلی فون ٹیپ کیے گئے اور جن لوگوں کی گفتگو مانیٹر کی گئی ان میں اعلیٰ عدالتوں کے ججز، سیاسی جماعتوں کے قائدین اور اعلیٰ فوجی و سول افسران شامل ہیں، حکومت اور اس کے مختلف اداروں کے انتظامی معاملات میں کرپشن، اقربا پروری اور قواعد کی خلاف ورزی اس قدر شدید فروغ پا گئی کہ آئین اور قانون کے مطابق حکومت کی معمول کے مطابق انجام دہی ناممکن ہو گئی اور بعض صورتوں میں قومی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دیا گیا، حکومت کے استحکام اور دیانت داری پر عوام کا اعتماد ختم ہو کر رہ گیا۔ حکومتی ارکان اور برسر اقتدار جماعتوں کے ارکان بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اس طرح کی کرپشن، اقربا پروری اور قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ارکان قومی اسمبلی کی سفارش پر لاتعداد تقرریاں کی گئیں۔ اس خلاف ورزی پر سپریم کورٹ نے ارکان قومی و صوبائی اسمبلیوں کو بھرتی کے لیے کوٹہ مختص کرنا آئین اور قانون کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے کہا کہ تمام تر تقرریاں میرٹ دیانت داری اور عوام کے مفاد کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی جائیں۔ ممبران اپنے اٹھائے گئے حلف کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے لیکن حکومت نے تین سال کے دوران حکومت کے انتظامی معاملات میں قانون سازوں کی مداخلت روکنے کے لیے کوئی موثر اقدام نہیں کیا ہے۔

کابینہ میں ایک ایسے وزیر کو جس کے خلاف جرائم کے مقدمات درج تھے، وزیر داخلہ نے جس کے خلاف مقدمات واپس لینے سے انکار کر دیا تھا، کابینہ میں شامل کر کے اس آئینی تقاضے کی خلاف ورزی کی کہ وزرائے مملکت سمیت کابینہ کے تمام ارکان اجتماعی طور پر قومی اسمبلی کو جواب دہ ہیں۔ درحقیقت وزیر داخلہ نے ابتدائی مرحلے پر دھمکی دی تھی کہ اگر انہیں (ذوالفقار کو) وزیر بنایا گیا تو وہ (وزیر داخلہ) استعفیٰ دے دیں گے۔ ایک ایسی کابینہ جس کا ایک رکن اپنے ساتھی کے خلاف عدالتی کارروائی کا ذمہ دار ہے اجتماعی طور پر کسی طرح بھی جواب دہ نہیں ہو سکتی ہے۔ جہاں تک پی پی ایل میں برما کنٹرول اور قادر پور گیس فیلڈ کے حصص کی فروخت کا تعلق ہے جس کی مالیت کئی ارب روپے ہے، صدر نے وزیر اعظم کو اس معاملے کو کابینہ میں دوبارہ غور کرنے کے لیے کہا مگر چار ماہ گزرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کیا گیا جو آئین کے آرٹیکل 46 اور 48 کی خلاف ورزی ہے اور جہاں تک انفرادی اور اجتماعی اقدامات کا تعلق ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں مطمئن ہوں کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے جس کے تحت حکومت اور وفاق آئین کے مطابق نہیں چل سکتے۔ اس لیے نئے انتخابات ضروری ہو گئے ہیں۔ اس لیے آئین کے آرٹیکل 2(58) بی کے تحت حاصل اختیارات کے تحت میں، فاروق احمد خان لغاری صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان، قومی اسمبلی فوری طور پر توڑتا ہوں اور وزیراعظم اور ان کی کابینہ فوری طور پر ختم کر دی گئی ہے۔

صدر نے آرٹیکل 5(48) کے تحت 3 فروری 1997ء کو عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست برائے گورنر جنرل پاکستان

1۔ قائداعظم محمد علی جناح ---------- 15 اگست 1947ء سے 11 ستمبر 1948ء (پاکستان مسلم لیگ)
2۔ سر خواجہ نظام الدین ---------- 14 ستمبر 1948ء سے 17 اکتوبر 1951ء (پاکستان مسلم لیگ)
3۔ ملک غلام محمد ---------- 17 اکتوبر 1951ء سے 06 اکتوبر 1955ء
4۔ اسکندر مرزا ---------- 06 اکتوبر 1955ء سے 23 مارچ 1956ء (ری پبلکن پارٹی)

فہرست برائے صدور مملکت پاکستان

1۔ اسکندر مرزا ---------- 23 مارچ 1956ء سے 27 اکتوبر 1958ء (ری پبلکن پارٹی)
2۔ محمد ایوب خان ---------- 27 اکتوبر 1958ء سے 25 مارچ 1969ء (فوجی سربراہ)
3۔ یحییٰ خان ---------- 25 مارچ 1969ء سے 20 دسمبر 1971ء (فوجی سربراہ)
4۔ ذوالفقار علی بھٹو ---------- 20 دسمبر 1971ء سے 13 اگست 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)
5۔ فضل الٰہی چوہدری ---------- 13 اگست 1973ء سے 16 ستمبر 1978ء (پاکستان پیپلز پارٹی)
6۔ جنرل محمد ضیاالحق ---------- 16 ستمبر 1978ء سے 17 اگست 1988ء (فوجی سربراہ)
7۔ غلام اسحاق خان ---------- 17 اگست 1988ء سے 18 جولائی 1993ء (آزاد)
8۔ وسیم سجاد (قائم مقام) ---------- 18 جولائی 1993ء سے 14 نومبر 1993ء (پاکستان مسلم لیگ ن)
9۔ سردار فاروق احمد خان لغاری ---------- 14 نومبر 1993ء سے 02 دسمبر 1997ء (پاکستان پیپلز پارٹی)
10۔ وسیم سجاد (قائم مقام) ---------- 02 دسمبر 1997ء سے 01 جنوری 1998ء (پاکستان مسلم لیگ ن)
11۔ محمد رفیق تاڑر ---------- 01 جنوری 1998ء سے 20 جون 2001ء (پاکستان مسلم لیگ ن)
12۔ جنرل پرویز مشرف ---------- 20 جون 2001ء سے 18 اگست 2008ء (فوجی سربراہ)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

13۔ محمد میاں سومرو (قائم مقام)۔۔۔۔۔18 اگست 2008ء سے 09 ستمبر 2008ء (پاکستان مسلم لیگ۔ق)
14۔ آصف علی زرداری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 09 ستمبر 2008ء سے تاحال (پاکستان پیپلز پارٹی)

فہرست برائے وزرائے اعظم پاکستان

1۔ لیاقت علی خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔14 اگست 1947ء سے 16 اکتوبر 1951ء (مسلم لیگ)
2۔ سر خواجہ نظام الدین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 اکتوبر 1951ء سے 17 اپریل 1953ء (مسلم لیگ)
3۔ محمد علی بوگرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 اپریل 1953ء سے 12 اگست 1955ء (مسلم لیگ)
4۔ چوہدری محمد علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12 اگست 1955ء سے 12 ستمبر 1956ء (مسلم لیگ)
5۔ حسین شہید سہروردی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12 ستمبر 1956ء سے 17 اکتوبر 1957ء (عوامی لیگ)
6۔ ابراہیم اسماعیل چندریگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 17 اکتوبر 1957ء سے 16 دسمبر 1957ء (مسلم لیگ)
7۔ سر فیروز خان نون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔16 دسمبر 1957ء سے 07 اکتوبر 1958ء (ری پبلکن پارٹی)
8۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 اکتوبر 1958ء سے 07 دسمبر 1971ء
9۔ نورالامین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 دسمبر 1971ء سے 20 دسمبر 1971ء (پاکستان مسلم لیگ)
10۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20 دسمبر 1971ء سے 14 اگست 1973ء
11۔ ذوالفقار علی بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔14 اگست 1973ء سے 05 جولائی 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)
12۔ وزیر اعظم کا عہدہ ختم کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05 جولائی 1977ء سے 24 مارچ 1985ء
13۔ محمد خان جونیجو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔24 مارچ 1985ء سے 29 مئی 1988ء (پاکستان مسلم لیگ)
14۔ وزیر اعظم کا عہدہ خالی رہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 29 مئی 1988ء سے 02 دسمبر 1988ء
15۔ محترمہ بے نظیر بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔02 دسمبر 1988ء سے 06 اگست 1990ء (پاکستان پیپلز پارٹی)
16۔ غلام مصطفیٰ جتوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 اگست 1990ء سے 06 نومبر 1990ء (نگران وزیر اعظم)
17۔ میاں محمد نواز شریف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 نومبر 1990ء سے 18 اپریل 1993ء (پاکستان مسلم لیگ، اسلامی جمہوری اتحاد)
18۔ سردار بلخ شیر مزاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔18 اپریل 1993ء سے 26 مئی 1993ء (نگران وزیر اعظم)
19۔ معین الدین احمد قریشی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔18 جولائی 1993ء سے 19 اکتوبر 1993ء (نگران وزیر اعظم)
20۔ محترمہ بے نظیر بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 اکتوبر 1993ء سے 05 نومبر 1996ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

21۔ملک معراج خالد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05 نومبر 1996ء سے 17 فروری 1997ء (نگران وزیراعظم)

22۔میاں محمد نواز شریف۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 فروری 1997ء سے 12 اکتوبر 1999ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

23۔وزیراعظم کا عہدہ خالی رہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12 اکتوبر 1999ء سے 21 نومبر 2002ء

24۔سردار میر ظفر اللہ خان جمالی۔۔۔۔۔۔۔21 نومبر 2002ء سے 26 جون 2004ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

25۔چوہدری شجاعت حسین۔۔۔۔۔۔۔۔۔30 جون 2004ء سے 20 اگست 2004ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

26۔شوکت عزیز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20 اگست 2004ء سے 16 نومبر 2007ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

27۔محمد میاں سومرو۔۔۔۔۔۔16 نومبر 2007ء سے 25 مارچ 2008ء (پاکستان مسلم لیگ ق نگران وزیراعظم)

28۔سید یوسف رضا گیلانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 مارچ 2008ء سے 22 جون 2012ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

29۔راجہ پرویز اشرف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔22 جون 2012ء سے تا حال (پاکستان پیپلز پارٹی)

فہرست اسپیکر قومی اسمبلی

1۔قائداعظم محمد علی جناح (بطور صدر)۔۔۔۔۔۔۔11 اگست 1947ء سے 11 ستمبر 1948ء (مسلم لیگ)

2۔مولوی تمیز الدین خان (بطور صدر)۔۔۔۔۔۔ 14 دسمبر 1948ء سے 24 اکتوبر 1954ء (مسلم لیگ)

3۔عبدالوہاب خان (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 12 اگست 1955ء سے 07 اکتوبر 1958ء (مسلم لیگ)

4۔مولوی تمیز الدین (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔11 جون 1962ء سے 19 اگست 1963ء (مسلم لیگ)

5۔فضل القادر چوہدری (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔ 29 نومبر 1963ء سے 12 جون 1965ء (کنونشن مسلم لیگ)

6۔عبدالجبار خان (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 12 جون 1965ء سے 25 مارچ 1969ء (کنونشن مسلم لیگ)

7۔ذوالفقار علی بھٹو (صدر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔14 اپریل 1972ء سے 12 اپریل 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

8۔فضل الٰہی چوہدری (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔15 اگست 1972ء سے 09 اگست 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

9۔صاحبزادہ فاروق علی (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔ 09 اگست 1973ء سے 27 مارچ 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

10۔ملک معراج خالد (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔27 مارچ 1973ء سے 05 جولائی 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

11۔سید فخر امام (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 22 مارچ 1985ء سے 26 مئی 1986ء (پاکستان مسلم لیگ)

12۔حامد ناصر چٹھہ (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 31 مئی 1986ء سے 03 دسمبر 1988ء (پاکستان مسلم لیگ)

13۔ملک معراج خالد (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔۔03 دسمبر 1988ء سے 04 نومبر 1990ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

14۔گوہر ایوب خان (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔۔04 نومبر 1990ء سے 17 اکتوبر 1993ء (پاکستان مسلم لیگ)

15۔یوسف رضا گیلانی (اسپیکر)۔۔۔۔۔۔17 اکتوبر 1993ء سے 16 فروری 1997ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

16۔ الٰہی بخش سومرو (اسپیکر) ۔۔۔۔۔۔۔16 فروری 1997ء سے 20 اگست 2001ء (پاکستان مسلم لیگ)

17۔ چوہدری امیر حسین (اسپیکر) ۔۔۔۔۔۔۔19 نومبر 2002ء سے 19 مارچ 2008ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

18۔ ڈاکٹر فہمیدہ مرزا (اسپیکر) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔19، رچ 2008ء سے تا حال (پاکستان پیپلز پارٹی)

فہرست برائے صوبائی وزرائے اعلیٰ

صوبہ پنجاب

01۔ افتخار حسین خان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 5 اگست 1947ء سے 25 جنوری 1949ء (پاکستان مسلم لیگ)

02۔ گورنر راج ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 25 جنوری 1949ء سے 05 اپریل 1951ء

03۔ میاں ممتاز دولتانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 15 اپریل 1951ء سے 03 اپریل 1953ء (پاکستان مسلم لیگ)

04۔ فیروز خان نون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔03 اپریل 1953ء سے 21 مئی 1955ء (پاکستان مسلم لیگ)

05۔ عبدالحمید خان دستی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔21 مئی 1955ء سے 14 اکتوبر 1955ء (پاکستان مسم لیگ)

06۔ فوجی آمریت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یکم جولائی 1970ء سے 02 مئی 1972ء

07۔ ملک معراج خالد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 02 مئی 1972ء سے 12 نومبر 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

08۔ غلام مصطفیٰ کھر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12 نومبر 1973ء سے 15 مارچ 1974ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

09۔ حنیف رامے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔15 مارچ 1974ء سے 15 جولائی 1975ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

10۔ صادق حسین قریشی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 15 جولائی 1975ء سے 05 جولائی 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

11۔ فوجی آمریت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05 جولائی 1977ء سے 09 اپریل 1985ء

12۔ میاں محمد نواز شریف ۔۔۔۔۔۔۔۔09 اپریل 1985ء سے 13 اگست 1990ء (پاکستان مسلم لیگ)

13۔ غلام حیدر وائیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔08 نومبر 1990ء سے 25 اپریل 1993ء (پاکستان مسلم لیگ)

14۔ میاں منظور وٹو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 اپریل 1993ء سے 19 جولائی 1993ء (پاکستان مسلم لیگ جونیجو گروپ)

15۔ منظور الٰہی (نگران) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 جولائی 1993ء سے 20 اکتوبر 1993ء

16۔ میاں منظور وٹو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20 اکتوبر 1993ء سے 13 ستمبر 1995ء (پاکستان مسلم لیگ جونیجو گروپ)

17۔ سردار آصف نکئی ۔۔۔۔۔۔۔۔13 ستمبر 1995ء سے 03 نومبر 1996ء (پاکستان مسلم لیگ جونیجو گروپ)

18۔ میاں منظور وٹو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔03 نومبر 1996ء سے 16 نومبر 1996ء (پاکستان مسلم لیگ جونیجو گروپ)

19۔ میاں افضل حیات (نگران) ۔۔۔۔۔۔16 نومبر 1996ء سے 20 فروری 1997ء

20۔ میاں شہباز شریف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20 فروری 1997ء سے 12 اکتوبر 1999ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

21۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔11اکتوبر 1999ء سے 29نومبر 2002ء

22۔چوہدری پرویز الٰہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔29نومبر 2002ء سے 18نومبر 2007ء(پاکستان مسلم لیگ ق)

23۔شیخ اعجاز نثار (نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔۔19نومبر 2007ء سے 11اپریل 2008ء

24۔دوست محمد کھوسہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12اپریل 2008ء سے 08جون 2008ء(پاکستان مسلم لیگ ن)

25۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔25فروری 2009ء سے مارچ 2009ء

26۔میاں شہباز شریف۔۔۔۔۔۔30مارچ 2012ء سے تا حال (پاکستان مسلم لیگ ن)

صوبہ سندھ:

1۔غلام حسین ہدایت اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔28اپریل 1937ء سے مارچ 1938ء(مسلم پیپلز پارٹی)

2۔اللہ بخش سومرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔23مارچ 1938ء سے 18اپریل 1940ء(اتحاد پارٹی)

3۔میر بندے علی خان تالپور۔۔۔۔۔۔۔۔۔18اپریل 1940ء سے 07مارچ 1941ء(مسلم لیگ)

4۔اللہ بخش سومرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07مارچ 1941ء سے 14اکتوبر 1941ء(اتحاد پارٹی)

5۔غلام حسین ہدایت اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔14اکتوبر 1942ء سے 14اگست 1947ء(مسلم پیپلز پارٹی)

6۔محمد ایوب کھوڑو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔16اگست 1947ء سے 28اپریل 1948ء(مسلم لیگ)

7۔پیر الٰہی بخش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔03مارچ 1948ء سے 04فروری 1949ء(مسلم لیگ)

8۔یوسف ہارون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔18فروری 1949ء سے 07مئی 1950ء(مسلم لیگ)

9۔قاضی فضل اللہ عبید اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔08مئی 1950ء سے 24مارچ 1951ء(مسلم لیگ)

10۔محمد ایوب کھوڑو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔25مارچ 1951ء سے 29دسمبر 1951ء(مسلم لیگ)

11۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔29دسمبر 1951ء سے 22مئی 1953ء

12۔پیرزادہ عبد الستار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔22مئی 1953ء سے 08نومبر 1954ء(مسلم لیگ)

13۔محمد ایوب کھوڑو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔09نومبر 1954ء سے 13اکتوبر 1955ء(مسلم لیگ)

14۔وزیر اعلیٰ کا عہدہ ختم رہا۔۔۔۔۔۔۔۔13اکتوبر 1955ء سے 30جون 1970ء

15۔فوجی آمریت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01جولائی 1970ء سے 01مئی 1972ء

16۔ممتاز بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01مئی 1972ء سے 25دسمبر 1973ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

17۔فوجی آمریت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05جولائی 1977ء سے 06اپریل 1985ء

18۔غوث علی شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06اپریل 1985ء سے 06اپریل 1985ء(پاکستان مسلم لیگ)

19۔اختر علی غلام قاضی۔۔۔۔۔۔۔۔۔11اپریل 1988ء سے 24جون 1988ء(اسلامی جمہوری اتحاد)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

20۔ گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔24 جون 1988ء سے 31 اگست 1988ء

21۔ اختر علی غلام قاضی (نگران)۔۔۔۔۔31 اگست 1988ء سے 02 دسمبر 1988ء (اسلامی جمہوری اتحاد)

22۔ سید قائم علی شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔02 دسمبر 1988ء سے 25 فروری 1990ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

23۔ آفتاب شعبان میرانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 فروری 1990ء سے 06 اگست 1990ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

24۔ جام صادق علی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 اگست 1990ء سے 05 مارچ 1992ء (آزاد)

25۔ مظفر حسین شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 مارچ 1992ء سے 19 جولائی 1993ء (اسلامی جمہوری اتحاد)

26۔ سید علی مدد شاہ (نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 جولائی 1993ء سے 21 اکتوبر 1993ء

27۔ سید عبداللہ شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔21 اکتوبر 1993ء سے 06 نومبر 1996ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

28۔ ممتاز بھٹو (نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 نومبر 1996ء سے 22 فروری 1997ء (سندھ نیشنل فرنٹ)

29۔ لیاقت علی جتوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔22 فروری 1997ء سے 30 اکتوبر 1998ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

30۔ گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔30 اکتوبر 1998ء سے 17 دسمبر 2002ء

31۔ علی محمد مہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 دسمبر 2002ء سے 09 جون 2004ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

32۔ ارباب غلام رحیم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔09 جون 2004ء سے 19 نومبر 2007ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

33۔ عبدالقادر ہالہ پوتا (نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔19 نومبر 2007ء سے 06 اپریل 2008ء

34۔ سید قائم علی شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 اپریل 2008ء سے تا حال (پاکستان پیپلز پارٹی)

صوبہ خیبر پختونخوا:

1۔ صاحبزادہ عبدالقیوم خان۔۔۔۔۔۔01 اپریل 1937ء سے 07 ستمبر 1937ء

2۔ ڈاکٹر خان صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 ستمبر 1937ء سے 10 نومبر 1939ء

3۔ سردار اورنگزیب خان۔۔۔۔۔۔۔25 اپریل 1943ء سے 16 مارچ 1945ء

4۔ ڈاکٹر خان صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔16 مارچ 1945ء سے 22 اگست 1947ء

5۔ عبدالقیوم خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔23 اگست 1947ء سے 23 اپریل 1953ء (مسلم لیگ)

6۔ سردار عبدالرشید خان۔۔۔۔۔۔۔۔23 اپریل 1953ء سے 18 جولائی 1955ء (مسلم لیگ)

7۔ سردار بہادر خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 جولائی 1955ء سے 14 اکتوبر 1955ء (مسلم لیگ)

8۔ عہدہ ختم کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔14 اکتوبر 1955ء سے 30 جون 1970ء

9۔ فوجی آمریت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 جولائی 1970ء سے 01 مئی 1972ء

10۔ مولانا مفتی محمود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 مئی 1972ء سے 12 فروری 1973ء (جے یو آئی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

11۔سردار عنایت اللہ خان گنڈاپور۔۔۔۔۔۔۔29اپریل1973ء سے 16فروری1975ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

12۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔16فروری1975ء سے 03مئی1975ء

13۔نصراللہ خان خٹک۔۔۔۔۔۔۔۔۔03مئی1975ء سے 09اپریل1977ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

14۔محمد اقبال خان جدون۔۔۔۔۔۔۔۔۔09اپریل1977ء سے 05جولائی1977ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

15۔فوجی مارشل لاء۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05جولائی1977ء سے 07اپریل1985ء

16۔ارباب جہانگیر خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07اپریل1985ء سے 31مئی1988ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

17۔لیفٹننٹ جنرل (ر)فضل الحق(نگران)۔۔۔۔۔31مئی1988ء سے 02دسمبر1988ء

18۔آفتاب احمد خان شیر پاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔02دسمبر1988ء سے 07اگست1990ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

19۔میر افضل خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07اگست1990ء سے 20جولائی1993ء(اسلامی جمہوری اتحاد)

20۔مفتی محمد عباس(نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20جولائی1993ء سے 20اکتوبر1993ء

21۔پیر صابر شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔20اکتوبر1993ء سے 25فروری1994ء(پاکستان مسلم لیگ ن)

22۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔25فروری1994ء سے 24اپریل1994ء

23۔آفتاب احمد شیر پاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔24اپریل1994ء سے 12نومبر1996ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

24۔راجہ سکندر زمان خان(نگران)۔۔۔۔۔۔۔12نومبر1996ء سے 21فروری1997ء

25۔مہتاب احمد خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔21فروری1997ء سے 12اکتوبر1999ء(پاکستان مسلم لیگ
ن)

26۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12اکتوبر1999ء سے 30نومبر2002ء

27۔اکرم خان درانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔30نومبر2002ء سے 11اکتوبر2007ء(متحدہ مجلس عمل)

28۔شمس الملک (نگران)۔۔۔۔۔۔۔۔11اکتوبر2007ء سے 30مارچ2008ء

29۔امیر حیدر خان ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔31مارچ2008ء سے تاحال(عوامی نیشنل پارٹی)

صوبہ بلوچستان:

1۔عطاءاللہ مینگل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01مئی1972ء سے 13فروری1973ء(نیشنل عوامی پارٹی)

2۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔13فروری1973ء سے 27اپریل1973ء

3۔جام غلام قادر خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔27اپریل1973ء سے 31دسمبر1974ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

4۔گورنر راج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔31دسمبر1974ء سے 07دسمبر1976ء

5۔سردار محمد خان باروزئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔07دسمبر1976ء سے 04اپریل1977ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

6۔ فوجی مارشل لاء ------------ 04 اپریل 1977ء سے 06 اپریل 1985ء

7۔ جام غلام قادر خان -------- 06 اپریل 1985ء سے 29 مئی 1988ء (آزاد)

8۔ سردار ظفر اللہ خان جمالی ------ 24 جون 1988ء سے 24 دسمبر 1988ء (اسلامی جمہوری اتحاد)

9۔ خدا بخش مری (نگران) ---------- 24 دسمبر 1988ء سے 05 فروری 1989ء

10۔ نواب اکبر خان بگٹی -------- 05 فروری 1989ء سے 07 اگست 1990ء (بلوچستان نیشنل اتحاد)

11۔ میر ہمایوں خان مری (نگران) ------ 07 اگست 1990ء سے 17 نومبر 1990ء

12۔ تاج محمد جمالی ------------ 17 نومبر 1990ء سے 20 مئی 1993ء (اسلامی جمہوری اتحاد)

13۔ سردار ذوالفقار علی مگسی --------- 20 مئی 1993ء سے 19 جولائی 1993ء (آزاد)

14۔ محمد ناصر مینگل (نگران) --------- 19 جولائی 1993ء سے 20 اکتوبر 1993ء (آزاد)

15۔ سردار ذوالفقار علی مگسی -------- 20 اکتوبر 1993ء سے 09 نومبر 1996ء (آزاد)

16۔ سردار ظفر اللہ خان جمالی (نگران) -------- 09 نومبر 1996ء سے 22 فروری 1997ء (آزاد)

17۔ سردار اختر مینگل ----------- 22 فروری 1997ء سے 15 جون 1998ء (بلوچستان نیشنل پارٹی)

18۔ جان محمد جمالی ----------- 15 جون 1998ء سے 12 اکتوبر 1999ء (پاکستان مسلم لیگ (آزاد)

19۔ گورنر راج ------------ 12 اکتوبر 1999ء سے 01 دسمبر 2002ء

20۔ جام محمد یوسف --------- 01 دسمبر 2002ء سے 19 نومبر 2007ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

21۔ محمد سلیم بھوتانی (نگران) --------- 19 نومبر 2007ء سے 08 اپریل 2008ء

22۔ اسلم رئیسانی ----------- 09 اپریل 2008ء سے تا حال (پاکستان پیپلز پارٹی)

صوبائی گورنرز کی فہرست

صوبہ پنجاب:

1۔ سر فرانسس موڈی --------------- 15 اگست 1947ء سے 02 اگست 1949ء (مسلم لیگ)

2۔ سردار عبدالرب نشتر ------------- 02 اگست 1949ء سے 24 نومبر 1951ء (مسلم لیگ)

3۔ آئی آئی چندریگر ----------- 24 نومبر 1951ء سے 02 مئی 1953ء (مسلم لیگ)

4۔ میاں امین الدین -------------- 02 مئی 1953ء سے 24 جون 1954ء (مسلم لیگ)

5۔ حبیب ابراہیم ------------ 26 ستمبر 1954ء سے 26 نومبر 1954ء (آزاد)

6۔ مشتاق احمد گورمانی ----------- 27 نومبر 1954ء سے 14 اکتوبر 1955ء (مسلم لیگ)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

7۔ون یونٹ میں مغربی صوبے کا حصہ۔۔۔۔۔۔۔۔14 اکتوبر 1955ء سے 01 جولائی 1970ء

8۔لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمٰن۔۔۔۔۔۔۔01 جولائی 1970ء سے دسمبر 1971ء (ملٹری ایڈمنسٹریشن)

9۔غلام مصطفیٰ کھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔دسمبر 1971ء سے فروری 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

10۔محمد حنیف رامے۔۔۔۔۔۔۔۔۔فروری 1973ء سے مارچ 1974ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

11۔صادق حسین قریشی۔۔۔۔۔۔۔۔مارچ 1974ء سے 13 مارچ 1975ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

12۔غلام مصطفیٰ کھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔13 مارچ 1975ء سے 31 جولائی 1975ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

13۔محمد عباس عباسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔31 جولائی 1975ء سے ستمبر 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

14۔اسلم ریاض حسین۔۔۔۔۔۔۔۔ستمبر 1977ء سے ستمبر 1978ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

15۔لیفٹیننٹ جنرل سوار خان۔۔۔۔۔۔۔۔ستمبر 1978ء سے مارچ 1980ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

16۔لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان۔۔۔۔۔۔۔مارچ 1980ء سے دسمبر 1985ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

17۔مخدوم سجاد حسین قریشی۔۔۔۔۔۔۔۔دسمبر 1985ء سے دسمبر 1988ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

18۔جنرل ریٹائرڈ ٹکا خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔دسمبر 1988ء سے اگست 1990ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

19۔میاں محمد اظہر۔۔۔۔۔۔۔۔اگست 1990ء سے 1992ء (پاکستان مسلم لیگ ن/اسلامی جمہوری اتحاد)

20۔چوہدری الطاف حسین۔۔۔۔۔۔۔۔1992ء سے 21 مئی 1995ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

21۔لیفٹیننٹ جنرل راجہ سروپ خان۔۔۔۔۔۔۔19 جون 1995ء سے 05 نومبر 1996ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

22۔خواجہ طارق رحیم۔۔۔۔۔۔۔۔۔05 نومبر 1996ء سے 10 مارچ 1997ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

23۔شاہد حامد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔10 مارچ 1997ء سے 17 اگست 1999ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

24۔سردار ذوالفقار علی کھوسہ۔۔۔۔۔۔۔17 اگست 1999ء سے 21 اکتوبر 1999ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

25۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ محمد صفدر۔۔۔۔۔21 اکتوبر 1999ء سے 29 اکتوبر 2001ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

26۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ خالد مقبول۔۔۔۔29 اکتوبر 2001ء سے 16 مئی 2008ء (فوجی ایڈمنسٹریشن
پاکستان مسلم لیگ)

27۔سلمان تاثیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 مئی 2008ء سے 04 جنوری 2011ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

28۔سردار لطیف کھوسہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔13 جنوری 2011ء سے تاحال (پاکستان پیپلز پارٹی)

صوبہ سندھ:

1۔شیخ جی ایچ ہدایت اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔14 اگست 1947ء سے 04 اکتوبر 1948ء (مسلم لیگ)

2۔شیخ دین محمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 اکتوبر 1948ء سے 19 نومبر 1949ء (مسلم لیگ)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

3۔ میاں امین الدین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 نومبر 1949ء سے 01 مئی 1953ء (مسلم لیگ)

4۔ George Baxandall Constantine۔۔۔۔02 مئی 1953ء سے 12 اگست 1953ء (فوجی انتظامیہ)

5۔ حبیب ابراہیم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12 اگست 1953ء سے 23 جون 1954ء (مسلم لیگ)

6۔ نواب افتخار حسین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔24 جون 1954ء سے 14 اکتوبر 1955ء (مسلم لیگ)

7۔ ون یونٹ میں مغربی صوبے کا حصہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔14 اکتوبر 1955ء سے 01 جولائی 1970ء

8۔ لیفٹیننٹ جنرل رحمٰن گل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 جولائی 1970ء سے 20 دسمبر 1971ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

9۔ ممتاز بھٹو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔22 دسمبر 1971ء سے 20 اپریل 1972ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

10۔ میر رسول بخش تالپور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 جون 1972ء سے 14 فروری 1973ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

11۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔15 فروری 1973ء سے 28 فروری 1976ء (آزاد)

12۔ محمد دلاور کنجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 مارچ 1976ء سے 05 جولائی 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

13۔ عبدالقادر شیخ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 جولائی 1977ء سے 17 ستمبر 1978ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

14۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ ایس ایم عباسی۔۔۔18 ستمبر 1978ء سے 06 اپریل 1984ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

15۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ جہاں داد خان۔۔۔07 اپریل 1984ء سے 04 جنوری 1987ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

16۔ اشرف تابانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05 جنوری 1987ء سے 23 جون 1988ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

17۔ جنرل ریٹائرڈ رحیم الدین خان۔۔۔۔۔۔24 جون 1988ء سے 12 ستمبر 1988ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

18۔ جسٹس قدیر الدین احمد۔۔۔۔۔۔۔12 ستمبر 1988ء سے 18 اپریل 1989ء (سپریم کورٹ آف پاکستان)

19۔ جسٹس فخرالدین جی ابراہیم۔۔۔19 اپریل 1989ء سے 06 اگست 1990ء (سپریم کورٹ آف پاکستان)

20۔ محمود ہارون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔06 اگست 1990ء سے 18 جولائی 1993ء (آزاد)

21۔ سر حکیم سعید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 جولائی 1993ء سے 23 جنوری 1994ء (آزاد)

22۔ محمود ہارون۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔23 جنوری 1994ء سے 21 مئی 1995ء (آزاد)

23۔ کمال الدین اظفر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔22 مئی 1995ء سے 16 مارچ 1997ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

24۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ معین الدین حیدر۔۔۔17 مارچ 1997ء سے 17 جون 1999ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

25۔ ممنون حسین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔19 جون 1999ء سے 12 اکتوبر 1999ء (آزاد)

26۔ ایئر مارشل عظیم داؤد پوتہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 اکتوبر 1999ء سے 24 مئی 2000ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

27۔ محمد میاں سومرو۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 مئی 2000ء سے 26 دسمبر 2002ء (پاکستان مسلم لیگ (ق)

28۔ عشرت العباد خان۔۔۔۔۔۔۔۔27 دسمبر 2002ء سے تا حال (ایم کیو ایم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صوبہ خیبر پختونخوا:

1۔ Sir George Cunningham۔۔۔۔15 اگست 1947ء سے 09 اپریل 1948ء (انڈین سول سروس)

2۔ Sir Ambrose Dundas Flux Dundas۔۔۔09 اپریل 1948ء سے 16 جولائی 1949ء (انڈین سول سروس)

3۔ صاحبزادہ محمد خورشید۔۔۔۔۔۔۔۔۔16 جولائی 1949ء سے 14 جنوری 1950ء (آزاد)

4۔ محمد ابراہیم خان جھگڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔14 جنوری 1950ء سے 21 فروری 1950ء (نگران)

5۔ اسماعیل ابراہیم چندریگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔21 فروری 1950ء سے 23 نومبر 1951ء (مسلم لیگ)

6۔ خواجہ شہاب الدین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔24 نومبر 1951ء سے 17 نومبر 1954ء (مسلم لیگ)

7۔ قربان علی شاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17 نومبر 1954ء سے 14 اکتوبر 1955ء (آزاد)

8۔ ون یونٹ میں مغربی صوبے کا حصہ۔۔۔۔۔۔14 اکتوبر 1955ء سے 01 جولائی 1970ء

9۔ لیفٹیننٹ جنرل کے ایم اظہر۔۔۔۔۔۔۔۔01 جولائی 1970ء سے 25 دسمبر 1971ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

10۔ حیات شیر پاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔25 دسمبر 1971ء سے 30 اپریل 1972ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

11۔ ارباب سکندر خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔30 اپریل 1972ء سے 15 فروری 1973ء (نیشنل عوامی پارٹی)

12۔ اسلم خٹک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔15 فروری 1973ء سے 24 مئی 1974ء (نیشنل عوامی پارٹی)

13۔ میجر جنرل ریٹائرڈ سید غوث۔۔۔۔۔۔۔۔24 مئی 1974ء سے 01 مارچ 1976ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

14۔ میجر جنرل ریٹائرڈ نصیر اللہ بابر۔۔۔۔۔۔۔01 مارچ 1976ء سے 06 جولائی 1977ء (پاکستان پیپلز پارٹی)

15۔ جسٹس عبدالحکیم خان۔۔۔۔۔۔۔۔06 جولائی 1977ء سے 17 ستمبر 1978ء (سول ایڈمنسٹریشن)

16۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ فضل الحق۔۔۔۔۔۔11 اکتوبر 1978ء سے 12 دسمبر 1985ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

17۔ نوابزادہ عبدالغفور خان ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔30 دسمبر 1985ء سے 13 اپریل 1986ء (جے یو آئی)

18۔ جسٹس سید عثمان علی شاہ۔۔۔۔۔۔۔13 اپریل 1986ء سے 27 اگست 1986ء (سول ایڈمنسٹریشن)

19۔ فدا محمد خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔27 اگست 1986ء سے 16 جون 1988ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

20۔ جنرل ریٹائرڈ امیر گلستان جنجوعہ۔۔۔۔۔۔۔16 جون 1988ء سے 19 جولائی 1993ء (آزاد)

21۔ میجر جنرل ریٹائرڈ خورشید علی خان۔۔۔۔۔۔۔19 جولائی 1993ء سے 05 نومبر 1996ء (آزاد)

22۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عارف بنگش۔۔۔۔۔۔۔11 نومبر 1996ء سے 17 اگست 1999ء (آزاد)

23۔ مینگل اورنگزیب۔۔۔۔۔۔۔۔17 اگست 1999ء سے 21 اکتوبر 1999ء (پاکستان مسلم لیگ ن)

24۔ لیفٹیننٹ جنرل محمد شفیق۔۔۔۔۔۔۔۔21 اکتوبر 1999ء سے 14 اگست 2000ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

25۔ لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ افتخار حسین شاہ۔۔۔14 اگست 2000ء سے 15 مارچ 2005ء (فوجی ایڈمنسٹریشن)

26۔ کمانڈر ریٹائرڈ خلیل الرحمٰن۔۔۔۔۔۔۔15 مارچ 2005ء سے 23 مئی 2006ء (پاکستان مسلم لیگ ق)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

27۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ علی جان اورکزئی۔۔23 مئی2006ء سے 07 جنوری2008ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

28۔اویس احمد خان غنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔07 جنوری2008ء سے09 فروری2011ء(آزاد)

29۔سید مسعود کوثر۔۔۔۔۔۔۔۔10 فروری2011ء سے تاحال(پاکستان پیپلز پارٹی)

صوبہ بلوچستان:

1۔رانا محمد عاصم بدر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔01 جولائی1970ء سے25دسمبر1971ء(آزاد)

2۔غوث بخش رئیسانی۔۔۔۔۔۔۔۔25دسمبر1971ء سے29اپریل1972ء(آزاد)

3۔غوث بخش بزنجو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔29اپریل1972ء سے15فروری1973ء(نیشنل عوامی پارٹی)

4۔نواب اکبر خان بگٹی۔۔۔۔۔۔۔۔۔15فروری1973ء سے03 جنوری1974ء(جمہوری وطن پارٹی)

5۔احمد یار خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔03جنوری1974ء سے ستمبر1977ء(آزاد)

6۔خدا بخش مری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ستمبر1977ء سے ستمبر1978ء(آزاد)

7۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ رحیم الدین خان۔۔۔۔۔۔۔ستمبر1978ء سے مارچ1984ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

8۔لیفٹیننٹ جنرل سردار ایف ایس خان لودھی۔۔۔۔۔مارچ1984ء سے جولائی1984ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

9۔لیفٹیننٹ جنرل خورشید خان آفریدی۔۔۔۔۔۔۔ جولائی1984ء سے دسمبر1985ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

10۔جنرل ریٹائرڈ موسیٰ خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔دسمبر1985ء سے12مارچ1991ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

11۔ہزار خان کھوسہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔12مارچ1991ء سے جولائی1991ء(آزاد)

12۔سردار گل محمد خان جوگیزئی۔۔۔۔۔۔۔جولائی1991ء سے1993ء(آزاد)

13۔جنرل عبدالرحیم درانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔1993ء سے مئی1994ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

14۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عمران اللہ خان۔۔۔۔۔مئی1994ء سے08اپریل1997ء(پاکستان پیپلز پارٹی)

15۔جسٹس امیر الملک مینگل۔۔۔۔۔۔۔08اپریل1997ء سے22اپریل1997ء(بلوچستان ہائی کورٹ)

16۔مینگل اورنگزیب۔۔۔۔۔۔۔۔۔22اپریل1997ء سے17اگست1999ء(پاکستان مسلم لیگ ن)

17۔سید فضل آغا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔17اگست1999ء سے21اکتوبر1999ء(سول ایڈمنسٹریشن)

18۔جسٹس ریٹائرڈ امیر الملک مینگل۔۔۔21اکتوبر1999ء سے01فروری2003ء(بلوچستان ہائی کورٹ)

19۔لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عبدالقادر بلوچ۔۔01فروری2003ء سے11اگست2003ء(فوجی ایڈمنسٹریشن)

20۔اویس احمد غنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔11اگست2003ء سے05جنوری2008ء(آزاد)

21۔امان اللہ خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔05جنوری2008ء سے28فروری2008ء(آزاد)

22۔ذوالفقار علی مگسی۔۔۔۔۔۔۔۔28فروری2008ء سے تاحال(پاکستان پیپلز پارٹی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالہ جات

1: تاریخ کے نئے زوایے ---------- ڈاکٹر مبارک علی (تھاپ پبلیکیشنز لاہور۔2009ء)

2: تاریخ کی آگاہی ---------- ڈاکٹر مبارک علی (تھاپ پبلیکیشنز لاہور۔2009ء)

3: برصغیر کیسے ٹوٹا ---------- عارف میاں (براڈلے انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اور پبلیکیشنز لاہور۔ 2009ء)

4: مسلم ریاست جدید کیسے بنے؟ ---------- محمود مرزا (دارالنذیر لاہور۔ 2004ء)

5: اسلام کا بحران ---------- برنارڈ لیوس (نگارشات لاہور۔2003ء)

6: سفر آدھی صدی کا ---------- عبدالکریم عابد (ادارہ معارف اسلامی کراچی۔2000ء)

7: سیاسی وسماجی تجزیے ---------- عبدالکریم عابد (منشورات منصورہ لاہور۔2004ء)

8: ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی ---------- احمد سلیم (جنگ پبلشرز لاہور۔1998ء)

9: پاکستانی معاشرہ اور عدم رواداری ---------- حسن عابدی (مشعل لاہور۔1997ء)

10: ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی ---------- اسلم گورداسپوری (فکشن ہاؤس لاہور۔2010ء)

11: عدلیہ کی آزمائش ---------- مجاہد لاہوری (جنگ پبلشرز لاہور۔1999ء)

12: عدلیہ کے تاریخی فیصلے ---------- مرتضیٰ انجم (یو پبلشرز لاہور۔2008ء)

13: پاکستان کی اصل کہانی ---------- لال خان (طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز لاہور۔ 2009ء)

14: ریاستی دہشت گردی ---------- نوم چومسکی (جمہوری پبلیکیشنز لاہور۔2003ء)

15: آپریشن ناتمام ---------- عقیل یوسف زئی (نگارشات لاہور۔2010ء)

16: پاکستان میں جمہوریت اور گورنینس ---------- ڈاکٹر طاہر کامران (ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ لاہور۔2008ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

17: پاکستان میں آمریت اور ججوں کا کردار ---------- دراب پٹیل (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لاہور۔ 2002ء)
18: انحرافات ---------- خالد احمد (تخلیقات لاہور۔ 1998ء)
19: پاکستان کے سیاسی حقائق ---------- اطہر ندیم (بک ہوم لاہور۔ 2006ء)
20: عدالت میں سیاست ---------- ایس ایم ظفر (علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ 2002ء)
21: پاکستان آرمی ---------- سٹیفن پی کوہن (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لاہور۔ 2002ء)
22: تاریخ، سہہ ماہی ---------- مدیر ڈاکٹر مبارک علی (تھاپ پبلیکیشنز لاہور۔ 2009ء)
23: میرا پاکستان ---------- ذوالفقار علی بھٹو مرتب بشیر ریاض (بھٹو لیگیسی فاؤنڈیشن اور بک ہوم لاہور۔ 2010ء)
24: ڈکٹیٹر کون ---------- ایس ایم ظفر (علم و عرفان پبلشرز لاہور۔ 2008ء)
25: تاریخ پاکستان ---------- آئین ٹالبوٹ (تخلیقات لاہور۔ 2007ء)
26: پرویز مشرف، فوجی آمریت سے جمہوری آمریت تک ---------- منیر احمد (تخلیقات لاہور۔ 2009ء)
27: پہلی بات ---------- عبدالکریم عابد (ادارہ معارف اسلامی کراچی۔ 2004ء)
28: ماہنامہ تجزیات اسلام آباد ---------- (شمارہ 5 مئی 2009ء اسلام آباد)
29: عدلیہ کے عروج و زوال کی کہانی ---------- سہیل وڑائچ (ساگر پبلشرز لاہور۔ 2007ء)
30: پاکستان میں جمہوری دفاقیت کا بحران اور قومی خود مختاری ---------- جامی چانڈیو (سینٹر فار پیس اینڈ سول سوسائٹی حیدر آباد۔ 2010ء)
31: پاکستان کی تعمیر نو ---------- صفدر صدیقی (نگارشات لاہور۔ 1992ء)
32: اسلام، مسلمان اور پاکستان ---------- قاضی حسین احمد (اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔ 2009ء)
33: جمہوریت یا آمریت؟ ---------- افضال ریحان (ہیومین رائٹس پبلشرز لاہور۔ 2009ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشاریہ

شخصیات

آصف علی زرداری: ۴۰، ۶۸، ۱۸۷، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۶۴

آصف نواز، جنرل: ۲۳۶

آفتاب شیر پاؤ: ۳۸، ۶۷، ۲۱۰

آئی اے رحمٰن: ۱۶۳

آئین ٹالبوٹ: ۲۱، ۱۱۲

ابتسام الٰہی ظہیر: ۱۵۸

ابراہیم، مرزا: ۱۰۵

ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا: ۶۵

اجمل آصف: ۲۰۰

احسان الٰہی ظہیر، علامہ: ۳۲

احسن اقبال: ۸۷، ۱۳۰

احمد رضا قصوری: ۱۸۰، ۱۸۱

احمد سعید کرمانی: ۱۰۵

احمد سلیم: ۱۳۴

ارشاد حسن خان: ۱۳۴

ازہر منیر: ۱۶۴

اسد درانی، جنرل: ۱۰۹

اسفند یار ولی خان: ۹۰، ۲۰۳

اسلم بیگ، جنرل: ۳۴

اسلم خٹک: ۱۰۶

اسلم گورداسپوری: ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۷

اسماعیل ابراہیم چندریگر: ۱۰۶

اشفاق پرویز کیانی، جنرل: ۴۵، ۴۶، ۴۹

اصغر خان: ۲۹، ۳۱، ۱۰۹

اطہر ندیم: ۵۸، ۶۷، ۷۶، ۷۹، ۸۰

اعجاز شاہ، سید: ۱۸۷

اعجاز شفیع گیلانی: ۱۳۰

افتخار الدین، میاں: ۷۴

افتخار محمد چودھری، جسٹس: ۳۹، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹

افضل چودھری: ۲۷

اقبال، علامہ: ۶۵، ۲۵۷

اکبر بگٹی، نواب: ۲۲، ۳۹، ۱۰۹، ۱۷۹

الطاف حسین: ۸۸، ۹۰، ۱۳۰، ۲۰۳، ۲۱۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الماوردی: ۶۰
الٰہی بخش سومرو: ۳۳
امتیاز عالم: ۱۳۰
امیر العظیم: ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۰
انوار الحق، جسٹس: ۱۷۴، ۱۸۱
بازامیر: ۵۵، ۵۷
ایوب خان، جنرل: ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۷، ۴۱، ۴۳، ۵۶، ۸۴، ۹۶، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۲۲، ۱۲۷، ۱۸۰، ۱۹۰، ۲۱۸
برنارڈ لیوس: ۱۶۸
بشیر ریاض: ۱۸۲
بلاول بھٹو زرداری: ۸۹، ۹۰
بلخ شیر مزاری: ۲۴۶
بیگم رعنا لیاقت علی خان: ۱۸۹، ۱۹۱
بیگم سلمیٰ تصدق حسین: ۱۸۹
بیگم کنیز یوسف: ۱۹۱
بیگم نسیم جہاں: ۱۹۰
بیگم نسیم ولی خان: ۳۱، ۹۰، ۲۲۰
بے نظیر بھٹو: ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۳، ۴۴، ۶۱، ۶۵، ۶۸، ۷۰، ۷۳، ۸۴، ۸۸، ۸۹، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۳، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۸۰، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۶، ۲۶۴
پرویز مشرف، جنرل: ۱۹، ۲۰، ۲۵، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۶۱، ۶۶، ۷۹، ۸۴، ۸۸، ۸۸، ۹۶، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۰، ۲۰۱
پرویز الٰہی، چودھری: ۴۰، ۹۰، ۱۸۷، ۲۱۰
پرویز، حاجی: ۲۰۰
پیر پگاڑا: ۳۳
تمیز الدین، مولوی: ۱۷۳، ۱۷۶
تنویر نقوی، جنرل: ۱۱۷
تہمینہ دولتانہ: ۱۹۶
جامی چانڈیو: ۷۲، ۷۳
جان سوین: ۱۸۲
جاوید ہاشمی: ۴۴، ۶۸، ۷۶، ۸۹، ۱۳۰
جعفر احمد: ۲۷، ۲۸، ۵۳
جمشید دستی: ۲۰۰
جہانگیر بدر: ۱۳۰
جہاں آرا شاہ نواز: ۱۸۹، ۱۹۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں زیب، جنرل: ۳۰
جی ایم سید: ۶۵
چارلس کرو: ۱۶۸
حامد ناصر چٹھہ: ۲۱۰
حسن وسیم افضل: ۱۸۷
حسین احمد، قاضی: ۴۸
حسین حقانی: ۱۳۰، ۱۳۴
حسین شہید سہروردی: ۱۰۶
حمزہ شریف: ۸۹
حمزہ علوی: ۲۱، ۵۵
حمود الرحمٰن، جسٹس: ۱۷۴
حمید گل، جنرل (ر): ۱۰۲، ۱۰۹، ۱۸۷
حمید نظامی: ۱۲۷
خان عبدالغفار خان: ۶۵، ۷۴، ۷۵، ۹۰
خان عبدالولی خان: ۶۵، ۹۰
خلیق الزمان، چودھری: ۲۷
خلیل الرحمٰن رمدے، جسٹس: ۱۷۸
خواجہ شریف، جسٹس: ۱۷۸
خورشید قصوری: ۲۱۰
دراب پٹیل، جسٹس: ۲۹، ۱۷۶، ۲۷۶
ذکی عباس: ۱۲۷
ذوالفقار علی بھٹو: ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۵، ۵۶، ۵۷، ۶۲، ۶۵، ۶۷، ۷۳، ۸۹، ۹۶، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۲۲، ۱۴۱، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۱۰، ۲۲۰، ۲۲۱
رحمان ہاشمی: ۱۲۷
رشید، شیخ: ۱۳۰
رفیق باجوہ: ۲۹
رفیق تارڑ: ۳۶
رفیق حریری: ۳۹
روئیداد خان: ۴۶
ریاض الخطیب: ۱۸۳
ریاض فقیانہ: ۱۳۰
ریگن: ۱۶۸
ساجد میر: ۱۵۸
ساجد نقوی: ۱۵۸
سٹیفن کوہن: ۴۳، ۴۵، ۴۶
سجاد علی شاہ، جسٹس: ۱۷۶
سعد رفیق: ۱۳۰
سکندر مرزا (صدر): ۲۹، ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۱۵
سمیع الحق، مولانا: ۹۰، ۱۵۸
سہیل وڑائچ: ۱۷۵، ۱۷۶
سیف اللہ، حاجی: ۱۷۴
شاہ احمد نورانی، مولانا: ۲۹، ۶۵

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ نواز بھٹو: ۱۸۷
شجاعت حسین، چودھری: ۳۸، ۶۷، ۹۰، ۱۱۷، ۱۳۶، ۲۰۹، ۲۱۰
شوکت عزیز: ۳۸، ۱۰۵، ۱۲۳
شہباز شریف: ۳۹، ۴۵، ۶۷، ۸۹، ۹۰، ۲۰۳، ۲۱۰
شہناز جاوید: ۱۹۶
شیر افگن، ڈاکٹر: ۳۸
شیر باز مزاری، سردار: ۳۶
صفدر، خواجہ: ۱۰۵
صفدر صدیقی: ۱۳۸
ضیاء الحق، جنرل: ۲۰، ۲۵، ۲۹، ۳۰، ۳۶، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۴۰، ۴۱، ۴۴، ۵، ۴۸، ۴۹، ۵۶، ۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۳، ۸۴، ۹۱، ۹۶، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۱، ۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۴، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۰۹، ۲۲۰
ضیاء الدین بٹ: ۳۵
طارق عزیز (ملٹری سیکرٹری): ۱۳۶
طاہر کامران: ۵۳، ۱۱۲
ظفر احمد انصاری: ۱۸۳
ظفر علی شاہ: ۱۷۵
عابد حسن منٹو: ۱۲۷
عابدہ حسین: ۱۹۶، ۲۱۰
عارف میاں: ۵۳
عاصمہ جیلانی: ۱۷۶
عائشہ جلال: ۱۱۲
عباس اطہر: ۱۸۷
عبدالحمید: ۱۲۷
عبدالرب نشتر: ۱۰۶
عبدالستار خان نیازی، مولانا: ۲۹، ۶۵
عبدالکریم عابد: ۵۰، ۵۷، ۶۲، ۶۴، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۹۹، ۱۰۰، ۱۴۹، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۰۳
عبداللہ ملک: ۱۲۷
عزیز الدین، پروفیسر: ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۱
عقیل یوسف زئی: ۱۷۰، ۱۷۱
علی حسن: ۳۰
عمران خان: ۳۵، ۹۰، ۱۲۲
غفور احمد، پروفیسر: ۲۹، ۳۰، ۳۶، ۱۳۱
غلام اسحاق خان: ۳۳، ۱۰۵، ۱۰۹، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۶۰
غلام محمد (گورنر جنرل): ۱۰۴، ۱۰۶، ۲۱۳
غلام مصطفیٰ جتوئی: ۶۷، ۷۳، ۲۳۹
غنوی بھٹو: ۲۶۴

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فاروق لغاری،سردار: ۳۸، ۶۷، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۳۴، ۲۶۳، ۲۶۶
فاطمہ جناح: ۲۶، ۲۷، ۱۰۴، ۱۰۷، ۱۱۱، ۱۹۰
فرید احمد پراچہ: ۱۳۰
فضل الحق: ۱۰۶
فضل الرحمٰن،مولانا: ۳۲، ۹۰، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۷۱، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۱۰
فضل الٰہی، چودھری: ۲۲۱، ۲۲۳
فہمیدہ بخش: ۱۹۱
فیروز خان نون: ۱۰۶
فیصل صالح حیات: ۳۸، ۲۱۰
قیصر بنگالی: ۱۲۹
قیوم خان،سردار: ۳۰، ۴۷، ۱۰۶
کلثوم نواز: ۳۶
کمال اظفر: ۲۱
لیاقت بلوچ: ۱۳۰
لیاقت علی خان: ۵۶، ۱۸۰
مالکی شریف: ۴۷
مبارک علی، ڈاکٹر: ۲۸، ۴۱، ۶۰، ۱۳۰
مجتبیٰ گیلانی: ۱۳۷
مجیب الرحمٰن، شیخ: ۲۷، ۱۰۵
مجیدہ وائیں: ۱۹۶
محمد احمد خان قصوری،نواب: ۱۸۱
محمد احمد خان قصوری،نواب: ۱۰۸
محمد خان جونیجو: ۳۳، ۳۴، ۶۷، ۷۳، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۲۳، ۱۷۳
محمد عابد عباسی: ۲۸
محمد علی بوگرہ: ۲۷، ۱۰۶، ۲۱۳، ۲۱۴
محمد علی جناح، قائداعظم: ۱۸، ۲۰، ۳۷، ۵۳، ۶۵، ۱۹۰، ۲۵۷
محمود علی قصوری: ۴۷
محمود مرزا: ۴۹، ۸۱، ۹۱، ۱۱۷، ۲۰۲، ۲۰۳
مخدوم امین فہیم: ۳۸، ۸۹
مرتضیٰ بھٹو: ۱۸۰، ۱۸۵، ۲۶۳، ۲۶۴
مسعود: ۱۸۱
مشاہد حسین: ۶۷
مظہر الحق، جسٹس: ۱۸۱
معراج خالد: ۶۷
مفتی محمود، مولانا: ۲۹، ۳۱، ۶۵
منور حسن: ۱۳۰
منیر احمد: ۱۳۴
منیر، جسٹس: ۱۷۳، ۱۷۴
مونس الٰہی: ۹۰
میر ظفر اللہ جمالی: ۳۸، ۶۷، ۱۱۷
میر غوث بخش بزنجو: ۶۵
ناظم الدین، خواجہ: ۱۰۴

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نثار علی، چودھری: ۴۵، ۶۷
نصر اللہ خان، نواب زادہ: ۲۹، ۳۲، ۳۵، ۶۱
نصرت بھٹو: ۸۹، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۹۱، ۱۹۶
نصیر اللہ بابر: ۱۶۹، ۱۷۱
نغمانہ مشتاق: ۲۰۰
نواز شریف: ۲۰، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۶۱، ۶۵، ۶۷، ۷۰، ۷۳، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۶، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۳، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۷۳، ۱۸۷، ۱۹۲، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۳
نوم چومسکی: ۱۶۸
واجپائی [اٹل بہاری]: ۲۰
وجاہت مسعود: ۲۰
وسیم سجاد: ۲۶۰
وکیل انجم: ۱۳۰
ہمدانی، جسٹس: ۱۸۱
یحییٰ خان، جنرل: ۲۵، ۲۷، ۳۱، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۲، ۱۷۳، ۱۷۴
یعقوب علی، جسٹس: ۱۷۷، ۲۲۲
یوسف رضا گیلانی: ۴۴، ۶۸، ۱۳۷

اماکن و بلاد

اسرائیل: ۱۸۳، ۲۵۲
اسلام آباد: ۲۲، ۳۹، ۷۱، ۷۲، ۸۸، ۱۹۳، ۲۱۲، ۲۲۶
افغانستان: ۳۹، ۱۰۸، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۹، ۲۵۲
امریکہ: ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۶، ۳۴، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۸، ۴۹، ۵۳، ۵۴، ۷۰، ۷۸، ۷۹، ۸۸، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۸۵، ۲۱۴، ۲۴۳
ایبٹ آباد: ۱۰۶
ایشیا: ۱۸۵، ۲۵۲
برصغیر: ۵۳
برطانیہ: ۳۶، ۷۸، ۸۸، ۱۸۱، ۱۸۲، ۲۴۳
برما: ۲۶۵
بلوچستان: ۲۱، ۲۲، ۷۱، ۷۲، ۷۶، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۹۳، ۱۹۴
بنگال: ۲۱۶
بنگلہ دیش: ۱۸۹
بوسنیا: ۲۵۲
بہاولپور: ۲۲، ۷۶

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھارت: ۱۹، ۳۵، ۵۵، ۹۱، ۱۰۷، ۱۷۰، ۲۱۷، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳،
پاکستان: ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۶۶، ۲۷۶
پشاور: ۲۶۳
پنجاب: ۲۱، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۹۰، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۳۹، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۲، ۶۴، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۲، ۸۳، ۸۹، ۹۳، ۹۶، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۴۹، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۳۶، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۴، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵،
پوٹھوہار: ۲۲، ۷۶
تاشقند: ۱۰۷
تورا بورا: ۳۷
چین: ۲۱۷
خانیوال: ۲۰۰
خیبر: ۲۵۸
خیبر پختونخوا: ۲۱، ۷۱، ۷۶، ۹۰، ۱۱۴، ۱۵۶، ۱۶۵، ۱۹۳، ۱۹۴
دارالدربار: ۲۰۳
دریائے اٹک: ۱۰۶
دیر: ۱۶۶
ڈی جی خاں: ۱۷۸
راولپنڈی: ۱۲۷
روس: ۳۴، ۱۵۹
سرحد: ۴۷، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۹۳، ۱۹۵، ۲۶۳

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سعودی عرب: ۳۶، ۳۹، ۸۸، ۱۸۳
سندھ: ۲۲، ۳۳، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۱۱۴، ۱۲۶، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۲۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۴۳، ۲۶۳
سوات: ۱۶۶
سوڈان: ۱۷
سوئٹزرلینڈ: ۷۹
سیالکوٹ: ۱۰۵
عراق: ۱۶۶، ۱۶۹
فاٹا: ۱۹۳
فرانس: ۱۸۷
فیصل آباد: ۲۰۰
قادر پور: ۲۶۵
کابل: ۲۴۵
کارگل: ۲۰، ۳۵
کراچی: ۴۰، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۴۱، ۱۶۲، ۱۷۹، ۱۸۶، ۲۱۶، ۲۵۸، ۲۶۳
کشمیر: ۱۵۹، ۱۶۳، ۲۵۲
کمبوڈیا: ۱۸۴، ۱۸۵
لال مسجد: ۳۹، ۱۷۹
لاہور: ۲۰، ۳۵، ۷۳، ۱۰۵، ۱۷۸، ۲۱۳
لبنان: ۳۹، ۸۸
لندن: ۱۰۷، ۱۳۶
لیبیا: ۱۶۸، ۱۸۳
مالاکنڈ: ۱۶۶
متحدہ عرب امارات: ۳۶، ۸۸، ۱۸۳، ۲۱۷
مشرقی پاکستان: ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۳، ۲۱۵، ۲۱۶
وزیرستان: ۱۶۶
ویت نام: ۱۸۵
ہزارہ: ۲۲، ۷۶
ہندوستان ۲۰، ۲۱، ۵۴، ۵۵، ۷۶، ۱۵۷، ۱۸۹
یورپ: ۷۹

جماعتیں/ادارے

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان: ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶
اسلامی جمہوری اتحاد: ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۹
اقوام متحدہ: ۱۶۸، ۱۶۹
القاعدہ: ۱۶۶
انٹرنیشنل وومین کلب: ۱۹۰
انجمن جمہوریت پسند خواتین: ۱۹۰
ایچی سن کالج: ۱۲۸
ایم آر ڈی: ۶۱، ۶۵
ایم کیو ایم: ۸۸، ۱۱۴، ۱۴۱، ۱۶۲، ۱۷۱، ۲۱۰
اے این پی: ۱۱۴، ۱۷۱، ۱۹۵، ۲۱۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوامی نیشنل پارٹی: ۹۰
فنڈ فار پیس: ۱۷
فیڈرل سیکورٹی فورس: ۱۸۰، ۱۸۱
فیڈریشن آف یونیورسٹی وویمن: ۱۹۰
فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن: ۱۹۰
قائداعظم سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۲
قائداعظم یونیورسٹی: ۱۹۱
قومی اسمبلی: ۱۸۰، ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۶، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۶
قومی تعمیر نو: ۱۱۷
کراچی کارپوریشن: ۲۱۶
کنونشن مسلم لیگ: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۸۴
کنیئرڈ کالج: ۱۲۶، ۱۲۸
کونسل آف کامن انٹرسٹ: ۲۴۲
گورنمنٹ کالج: ۱۲۸
لاہور ہائی کورٹ: ۱۷۴، ۱۷۸، ۱۸۱
لشکر جھنگوی اور سنی گروپ: ۱۶۲
لشکر طیبہ: ۱۶۲، ۱۶۳
متحدہ طلبہ محاذ: ۱۲۲
متحدہ مجلس عمل: ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۰
مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۲، ۱۲۶، ۱۲۷
مسلم لیگ: ۲۰، ۲۶، ۳۳، ۳۷، ۵۳، ۸۳، ۸۵، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۸۹، ۲۱۰
مسلم لیگ (ق): ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۸۴، ۸۶، ۹۰، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۷، ۱۹۵، ۲۰۰
مسلم لیگ (ن): ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۴، ۴۵، ۷۶، ۸۴، ۸۵، ۸۷، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۵۷، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۹۵، ۲۰۰
ملٹری ایجنسی: ۳۹
مہاجر سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۲
مہران بنک: ۱۰۹
نرسز فاؤنڈیشن ۱۹۰
نظام اسلام پارٹی: ۱۰۶
نیشنل سکیورٹی کونسل ۴۶، ۴۷
نیشنل شپنگ کارپوریشن: ۲۴۳
نیشنل فنانس کمیشن: ۲۳۲، ۲۴۲
واپڈا: ۲۴۳
وفاقی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی: ۲۲۴
وویمن ایکشن فورم [خواتین محاذ عمل]: ۱۹۱، ۱۹۲
وویمن نیشنل گارڈ: ۱۸۹
وویمن والنٹیئری سروس: ۱۸۹
یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ: ۱۹۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اے آر ڈی: ۶۵
آئی ایس آئی: ۳۹، ۱۰۲، ۱۰۹
بلوچ سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۲
بلوچستان لبریشن فرنٹ: ۷۱
بہبود ایسوسی ایشن: ۱۹۰
پاکستان قومی اتحاد: ۱۰۸
پاکستان کمیونسٹ پارٹی: ۱۰۵
پنجاب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی: ۲۲۴
پنجاب یونیورسٹی: ۱۲۲
پی این اے: ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۶۵، ۹۹، ۱۸۳
پی آئی اے: ۲۴۳
پیپلز پارٹی: ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۴، ۵۶، ۶۱، ۶۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۸، ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۵۷، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۷۱، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۵، ۲۰۰، ۲۳۷
پیپلز پارٹی پیٹریاٹ: ۳۸، ۸۴
پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۲، ۱۲۶
پینٹاگون: ۱۶۹
تاج کمپنی: ۲۴۴
تحریک استقلال: ۱۰۹
تحریک انصاف: ۱۵۷، ۱۷۰
تحریک نفاذ فقہ جعفریہ: ۱۶۲
ترقی پسند تحریک: ۱۸۹
جگتو فرنٹ اتحاد: ۱۰۴، ۱۰۶
جماعت اسلامی: ۳۰، ۳۷، ۴۸، ۱۰۶، ۱۲۳، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۷۰، ۱۹۰، ۲۱۰
جمعیت اہل حدیث: ۱۵۸، ۱۶۲
جمعیت علمائے اسلام: ۱۵۸، ۱۶۲
جمعیت علمائے پاکستان: ۱۵۸، ۱۶۲
جی ایچ کیو: ۶۷، ۶۸
جے یو آئی: ۱۰۸، ۱۱۴، ۱۷۱
حزب المجاہدین: ۱۶۳
ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن: ۱۲۶
ریڈیو پاکستان: ۲۱۴
زرعی ترقیاتی بنک: ۲۳۵
سپاہ صحابہ: ۱۶۲
سپاہ محمدی: ۱۶۲
سپریم کورٹ: ۴۸، ۱۰۵، ۱۰۹، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۶، ۲۶۴، ۲۶۵
سندھیانی تحریک: ۱۹۲
طالبان: ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱
عوامی لیگ: ۱۰۷

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاستی دہشت گردی از نوم چومسکی: ۱۶۸
سفر آدھی صدی کا از عبدالکریم عابد: ۵۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۸۲
سنڈے ٹائمز (برطانیہ): ۱۸۱، ۱۸۲
سیاسی و سماجی تجزیے از عبدالکریم عابد: ۵۰، ۶۲، ۶۴، ۷۳
شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستان حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی از اسلم گورداسپوری: ۱۸۴، ۱۸۵
عدلیہ کے عروج وزوال کی کہانی از سہیل وڑائچ: ۱۷۵
فارن پالیسی، مجلہ [امریکہ]: ۱۷
مسلم ریاست جدید کیسے بنے از محمود مرزا: ۴۹، ۸۱، ۹۱، ۱۱۷، ۲۰۲
میرا بھائی ذوالفقار علی بھٹو: ۱۸۲
Army and idea of pakistan by: سٹیفن کوہن: ۴۵، ۴۶
The state of martial rule by: عائشہ جلال: ۱۱۴

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو میں نے دیکھا

پاکستانی سیاست اور حکمرانی کی اندرونی کہانی

راؤ رشید

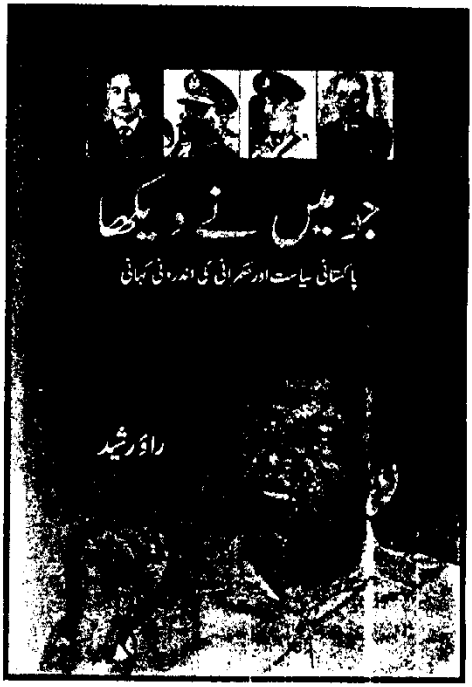

کسی بھی بک سٹال سے یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں۔

JUMHOORI PUBLICATIONS
2Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:Jumhoori@yahoo.com
www.jumhooripublications.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سندھ کی پسماندگی

حقائق و اسباب

نصیر میمن

کسی بھی بک سٹال سے یا براہ راست ہم سے طلب فرمائیں۔

JUMHOORI PUBLICATIONS
2Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan
Tel # 042-36314140 Fax # 042-36306939
E-mail:Jumhoori@yahoo.com
www.jumhooripublications.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سلمان عابد پاکستان کے سیاسی، سماجی، صحافتی، علمی اور اہل دانش طبقوں میں اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے طلبہ سیاست کا آغاز کرنے والے سلمان عابد نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ وہ پچھلے بیس برسوں سے پاکستان میں ترقیاتی، صحافتی اور علمی میدان میں ایک متحرک اور فعال فرد کے طور پر کام کررہے ہیں۔ پاکستان کی بڑی ترقیاتی تنظیموں اور صحافتی اداروں میں کام کا وسیع تجربہ رکھنے والے سلمان عابد تواتر کے ساتھ ملک کے بڑے اردو اور انگریزی اخبارات میں عصری موضوعات پر سیاسی تجزیہ نگاری کررہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سمیت دیگر یونیورسٹیوں میں وہ کمیونیکیشن اور سماجی علوم کے موضوعات پر درس تدریس سے بھی وابستہ ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا میں سو سے زائد سیاسی پروگراموں کی میزبانی کرتے رہے ہیں۔

جمہوریت، انسانی حقوق، مقامی حکومتیں، طرز حکمرانی، انتہا پسندی، صنفی امتیاز، باہمی تنازعات اور میڈیا پر ان کی دسترس کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ پاکستان میں سول سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے وہ محروم طبقات کے حقوق کی جدوجہد میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ متعدد اہم فورمز اور تھنک ٹینک کا عملی حصہ ہیں جہاں قومی امور کے معاملات پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔ ان کی قبل ازیں شائع ہونے والی کتب میں ''پاکستان کا نیا سیاسی نظام اور مقامی حکومتوں کا کردار''، ''مقامی حکومت اور اختیارات کی تقسیم''، ''عبدالکریم عابد---ایک شخص ایک عہد'' اور کم وبیش بیس سے زیادہ مختلف موضوعات پر کتابچوں سمیت پانچ سو سے زائد اردو اور انگریزی مضامین شامل ہیں۔

اب برقی زمانہ ہے۔ آزادی اظہار کے تمام سوتے برق رفتاری سے پھوٹتے ہیں سلمان عابد اس جدید عہد میں اپنی رائے کو قلم بند کرتے اور زمانے کے بدلتے ہوئے اطوار پر اپنی رائے رکھتے ہیں۔ وہ اس زمانے کی صحافت کے امین ہیں جس نے نابغہ روزگار پیدا کیے، وہ صحافت کی دنیا کے ایک درخشاں نام عبدالکریم عابد مرحوم کے فرزند ہیں۔ اگرچہ سماجی چلن کے اعتبار سے یہ زمانہ ان کے زمانے سے بہت مختلف ہے، تاہم سلمان عابد کا بچپن ان ہی اعلیٰ صحافتی اقدار کے سائے میں پروان چڑھا۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے اس گلستان کا باغبان بننے کا تہیہ کیا اور سول سوسائٹی میں عملی طور پر شمولیت اختیار کی، کالم نگاری اور سیاسی وسماجی موضوعات پر اپنی خاص رائے رکھنا ان کا وطیرہ ہے۔ وہ اپنی تحریر میں جذباتی نقطہ نظر کی بجائے منطقی رائے کے اظہار کو اولیت دیتے ہیں۔ حرف ومعنی کی ہم آہنگی کسی تحریر کی خوبی ہے اور وہ اس کی تلاش بخوبی کرتے ہیں۔ سلمان عابد اسی جستجو میں قلم نگاری کرتے ہیں ان کی یہ تازہ تصنیف اس کی نادر مثال ہے۔

طاہر اصغر

ISBN 978-969-9739-44-6

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ